فکر افروز تحریروں کا مجموعہ

قلم برداشتہ

صاحبزادہ سید خورشید احمد گیلانی

کتاب محل

فکر افروز تحریروں کا مجموعہ کتابی صورت میں پہلی بار

قلم برداشتہ

(جلد دوم)

صاحبزادہ سید خورشید احمد گیلانی

کتاب محل

نام کتاب	قلم برداشتہ (جلد دوم)
مصنف	صاحبزادہ سید خورشید احمد گیلانی رحمۃ اللہ علیہ
جمع و ترتیب	سید احسان گیلانی
بتعاون	خورشید گیلانی ٹرسٹ
زیرِ نگرانی	سید احسان گیلانی و محمد فہد
	0321-8836932, 0300-4265964
معاونت	محمد عباس بیگ، نعمان قادری مصطفائی
ناشر	محمد فہد 0321-8836932
قیمت	-/500 روپے

حرفِ آغاز

قوموں کی اصلاح کا بیڑا اٹھانا تو ایک ضروری اور اہم کام ہے۔ لیکن بیڑا اٹھانے کے بعد علم و شعور کی قوت کو ساتھ لے کر میدانِ عمل میں ڈٹ جانا اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔

ملت اسلامیہ کی داخلی اور خارجی محاذوں پر ابتری کے افسانے اتنے عام ہیں کہ کوئی دل گردے والا ذہین و فہیم صاحب استقامت ہی ان کو دیکھ سکتا ہے۔ اور اگر توفیق الٰہی یاوری کرے تو وہ رجلِ رشید اپنی ہستی کو نیستی میں بدلنے کا عہد کر کے قوموں کے لئے راہِ روشن تیار کرتا ہے یہ رجل رشید وقت کی آندھیوں کا مزاج بھی سمجھتا ہو اور مزاحمتوں کے طوفانوں کے تیور سے بھی آگاہ ہو مگر سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ وہ خود آگاہ ہو اور پھر قوموں کی اجتماعی خودی کی تاریخ سے بھی آشنا ہو۔ بلند عزائم میں ہر کوہ گراں کو ریت کا گھروندا سمجھ کر بڑھتا چلا جائے، خوف اور لالچ کی فضاؤں میں ضربِ قلندرانہ کا جذبہ لئے الحق یعلو کا نعرۂ مستانہ اپنے فکر فرزانہ کی تائید سے بلند کرتا رہے۔ مایوسی کی کائنات کو ہمہ وقت زیرِ قدم رکھنے کا عزم بالجزم اس کے عصائے انقلاب کی قوت ہو۔

اکیلا بھی ہو تو انجمن دکھائی دے، خزاں ہو تو گلشن سدا بہار کا مرقع نظر آتا ہو۔ بے کسی میں یتیموں کا سندیسہ دینا اس کی بانگ درا ہو اور پرِ جبرائیل کی تائید اس کے نغموں میں سمٹی ہوئی دکھائی دے۔ اس کا ہر سانس تیز تر گامزنِ منزل مادو رنیست کی ہمت و قوت سے معمور ہو تو اسے قیادت فکر و شعور کی دستار کا مستحق قرار دینا چاہیے اور اس کی قبائے علم کو اقوام کی فضیلت کا نشانِ جاوید گردانا چاہیے۔

اس کے اشہبِ قلم کی رفتار صدیوں کے تجربوں کو قرطاس پر منتقل کر دے تو جان لیجئے کہ سیاہ حرفوں میں سپیدۂ سحر کی امیدیں موجود ہیں۔ زبان اور قلم کی کاٹ تو شمشیر بے نیام کو بھی روک دیتی ہے اور جنگ و جدل کے بے ہنگم ماحول کو نئے رخ عطا کرتی ہے۔

ایسے لوگ جن کی زبان و قلم معرکۂ یاس و یقین میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہیں فطرت کے نقیب ہوتے ہیں لیکن فطرت ان افراد کی رونمائی بہت دیر اور بہت احتیاط سے کرتی ہے۔

فطرت کے ذی شعور اور مجاہدین جاں سپار تہہ مزار جا کر بھی اپنی روشنیوں کی خیرات میں بخل نہیں کرتے۔ وہ اپنی موت سے پہلے حیات عارضی میں بھی ایک جہان تازہ آباد کر کے

پھر عالم جاودانی کو جا کر آباد ہوتے ہیں۔

پاکستانی صحافت میں گرفتارِ افکار گروہوں نے جو جمودی ماحول دیا ہے وہ نہایت ہی افسوسناک ہے۔ روایت کو پوجنا اور پھر اس کو دوسروں پر مسلط کرنا ہماری صحافت کا وہ اندوہناک پہلو ہے جسے ہم ملی بربادی کے سوا کچھ بھی نام نہیں دے سکتے۔ صحافت کا کام تو معاشرتی گروہوں کی خامیوں کو تلاش کر کے اسے اصلاحی روشنیوں پر گامزن کرنا ہے لیکن معروضیت اور مفادیت ہی مقاصد قلم و قرطاس رہ گئے ہیں۔

تاریخ صحافت کا ایک اہم موڑ بیسیویں صدی کی آخری 2 دہائیاں ہیں جہاں پر فکر مذہب اور نظریہ ملت کی صحافت میں ایک مرقع درد اور پیکر علم خورشید گیلانی کے نام سے اترا، مکاتب و مسالک کی طبقہ بندیوں کی فضاؤں سے بلند اس کی اڑان تھی اور خورشیدِ تاباں کی طرح اس کی روشنیٔ دل نے شب یلدا کے مسافروں کو نورِ صبح کے مژدہ ھائے جانفزا سنائے ،خورشید فکر کا جہانِ شعور قرآنیات اور اُسوہ رسولِ عالمین ﷺ کو بنائے قول و عمل قرار دیتا ہے۔

خورشید گیلانی کا طلوع حیات ایسے پُرنور روحانی ماحول میں ہوا جہاں پُرانوار شعور جنم لیتے ہیں۔ ذات کی ضیاء مسلسل صفات کو مجلا کرتی ہے اور صفائے قلب کا ڈنکا ہر لحظہ بجتا ہے۔ اسلام کے احیاء و تجدید کی فکر لازم جس گھرانے کا امتیاز علم و تربیت ہو وہی گھرانہ خورشید گیلانی کی مہدِ اوّل ہے راجن پور کی ایک پسماندہ بستی شکار پور میں محی الدین عبدالقادر الجیلانی الغوث الاعظم رحمتہ اللہ علیہ کے نسبی و فکری وارثوں کا مسکن ہے۔ جہاں پر فقر غیور کی آبیاری کا مستقل اہتمام تھا۔ سادہ طبیعت درویش خدا مست سید احمد شاہ گیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں آنکھیں کھولنے والا خورشید گیلانی بوذری فقر کی فضاؤں میں اپنا سفر حیات شروع کرتا ہے۔ جہاں اگر چہ روایتی وراثتی خانقاہ تو نہ تھی البتہ تعلیماتِ قادریہ کا شعور ولاشعور میں پورا اہتمام تھا۔ خورشید گیلانی سُنتِ آباء میں طلب علم و فقر کے لئے بہت جلد ہی تارک وطن ہوئے۔ ڈیرہ غازیخان، بہاولپور، ملتان اور لاہور کے مراکزِ علم میں اساطین عصر کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرتے ہوئے قصہء قدیم و جدید سے کنارہ کش رہے اور اقبال کے آئینہء فیضان میں مغرب و مشرق کی فکری معرکہ آرائی کو علمی بصیرت اور باطن کے اقدار پہ پرکھتے۔ پھر فکر و نظر کی دنیا میں فیضان رسائی کے لیے زبان و قلم کو توفیق خداوندی سے حرکت میں لاتے ،نیت کی صالحیت اور سوزِ دروں کو ہمیشہ ہی پاسبان حرف بنا کر رکھا۔ یہ کوچہء میکدہ ہے یہاں درِ میخانہ سے باہر ہی

پگڑی اُچھلتی ہے۔لیکن خورشید گیلانی کی دستار علم کا ہر پیچ فضیلت باطن سے معمور تھا۔فکر و شعور کی دنیا کو توفیق ایزدی کی تائید کے تحت رکھنا ان کا مشرب علمی تھا۔اس لئے دنیاوی مفادات کا حصول کبھی بھی ان کے ذوق کا حصہ نہیں رہا۔اعلائے کلمۃ الحق کی جدوجہد میں ان کا اساسی اثاثہ اور منزل مراد **لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ** ﷺ رہی۔

درس قرآن از حسین آموختم کا آئینہ ان کا مسلک تھا۔اس لئے باطل کی دوئی پسندی کو وہ راہ حق کی سب سے بڑی مزاحمت جانتے تھے۔

خورشید گیلانی اپنے دور میں اسلام اور اہل اسلام کے غلبہ و تفوق کے لئے سراپا جہاد نظر آتے ہیں۔نگاہ کی عبقریت، سخن کی دلربائی اور جاں سوزی و جگر فگاری کا یہ مرقع ابدی حقیقت کی منزل کا مسافر تھا۔اس کے کردار کی استقامت اور صالح جذبات کا بہاؤ راہ ہدایت کے مسافروں کے لئے ایک سبق آموز راہنما ہے۔

دور جدید کے شائقین علم و ادب جب بھی جناب خورشید گیلانی مرحوم کے ان مضامین کو زیر مطالعہ لائیں گے جو ماضی میں تحریر ہوئے لیکن وہ مستقبل کے چراغِ راہ نظر آتے ہیں اور یہ چراغ راہ ہی نہیں ہیں بلکہ باطن افروزی کا دلکش سامان فلاح ہیں۔مضامین کی زبان اور حُسن بیان پر تبصرہ کی گنجائش ہی نہیں۔افکار کے تعارف کی ضرورت نہیں۔زمانوں کے سنگم پر چراغ دل روشن کر کے رکھ دیا ہے جو اتفاق و اتحاد اور قربت و اتصال کی راہوں کو یکجا کر رہا ہے اور قارئین کو ایک نغمہ فطرت کی جانب بلا رہا ہے۔

تیز ترک گامزن منزل ما دور انیست

محترم احسان گیلانی صاحب نے جناب خورشید گیلانی کی تحریر کو مرتب کرنے کا جو عزم بالجزم کیا ہے وہ عنداللہ ماجور ہیں اور خدمت ملت پر مامور ہیں۔یہ ایک بڑا کام ہے جو توفیق الٰہی کے بغیر ناممکن ہے۔اس کتاب کے ناشر جناب محمد فہد ایک نوجوان صالح افکار خوش عمل ہیں۔ان کا ذوق مطالعہ اور طرز انتخاب قابل تحسین ہے کہ وہ دورِ جدید میں روشن افکار کی ترویج کے لئے اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے ہیں۔کتاب محل کے نام سے ان کا طباعتی و اشاعتی ادارہ نامساعد حالات میں بڑا کارنامہ انجام دے رہا ہے۔

(پروفیسر ڈاکٹر) محمد قمر علی زیدی
۷ افروری ۲۰۱۵
شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی لاہور

خورشید گیلانی۔۔۔فکرودانش کا زندہ استعارہ

شاہراہِ حیات پر شعور زندگی بانٹنے والوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جنکی بیاض حیات کی انمول گھڑیوں کا لمحہ لمحہ امت کی فکری بالیدگی اور چاک گریباں کی رفوگری کیلئے وقف تھا جنکی فکری جولانیاں اور ذہنی تابانیاں رہین قوم تھیں جو ساری زندگی رگ گل سے بلبل کے پر باندھنے کا ہنر آزماتے رہے جو تنکوں کا شجر ایستادہ کر کے اس کے ثمر آور ہونے کیلئے دعا گو رہے اُمید انکا اسلحہ جدو جہد انکا حوالہ، ژولیدہ فکر کی ترویج انکا مقالہ تھی وہ ہمیشہ معاشرے کے اخلاق باختہ رویوں اور کھردرے پن پر شکوہ رنج رہے وہ خیمہ ذات میں بند رہنے اور گنبد جاں کے طواف کرنے جیسے شب گزیدہ رجحانات کے ناقدرہے، صاحبزادہ سیّد خورشید احمد گیلانی بھی ایسے ہی قبیلے کی آنکھ کا تارا تھے جنکا خمیر تاریخ کی مراد اور رشک زمانہ لوگوں سے اٹھا تھا جو عصریات کا کامل ادراک رکھتے تھے جداگانہ فکر امروز انکی وجہ امتیاز اور روح تصوف انکی پہچان تھی انکی روح انقلاب اور اسلوب سیاست کا فلسفہ فکر اسلامی پر مشتمل تھا

آپ صوبہ سندھ کے مردم شناس خطہ شکارپور میں شہزادہ غوث الوری سید احمد شاہ گیلانی کے گھر تولد ہوئے شخصی وجاہت اور فکری نجابت بچپن سے ہی آپکو ودیعت تھی آپ حرف و صوت کی دنیا کے درنایاب تھے اس لیے آپ کی سحر بیانی اور اسلوب نگارش نے ایک عالم کو متاثر کیا آپکا کالم "قلم برداشتہ" موضوعات کے تنوع عنونات کی جامعیت افکار کی صلابت اور زور استدلال کی حلاوت کا شاہکار ہوتا تھا حالات حاضرہ پر بے لاگ تبصرہ اور لگی لپٹی کے بغیر بات کرنیکا سلیقہ جو آپکو تھا وہ شاید و باید ہی کسی دوسرے کو ہو۔ آپکو لفظوں سے عشق تھا اور حرف ولفظ آپ پر فریفتہ تھے آپ کا قلم رواں ہوتا تو ایسا لگتا کہ جیسے حرف بول رہے ہیں اور لفظ گفتگو کر رہے ہیں آپکے تحریر کردہ تجزیئے، تبصرے لوگ سر کی آنکھوں سے پڑھتے، دلوں میں اتارتے اور ذہنوں میں محفوظ کرتے تھے۔

آپ موجودہ اور آنے والے حالات پر گہری نظر رکھتے تھے آپ نے بہت پہلے لکھ دیا تھا کہ دہشتگردی 21 ویں صدی کا سب سے بڑا چیلنج اور فتنہ ہوگی جو آج صحیح ثابت ہو رہا ہے۔ آپ اتحادِ اُمت کے نقیب تھے فرقہ واریت سے کوسوں دور رہے یہی وجہ ہے کہ آپ ہر شخص اور

گروہ کیلئے قابل قبول ہیں اگر حکومت ملک میں پائے جانے والے موجودہ فکری وملی انتشار کو دور کرنا چاہتی ہے تو آج بھی فکرِ خورشید انہیں سوچوں کے نئے زاویے اور اتحاد کے نئے فارمولے عطا کرسکتی ہے آپ ساری زندگی امید، اتحاد اور انقلاب کے داعی رہے اور یہی آپ کی عملی زندگی اور فکری بانکپن کا سرنامہ ہے۔ اجتہاد کے موضوع پر آپکا لکھا ہوا کالم اُمت کیلئے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے اگر اس کالم میں اُٹھائے گئے سوالات کو بنیاد بنا کر اُمت میں مکالمہ کا آغاز کیا جائے تو اُمت کے مردہ وجود میں ارتعاش پیدا ہوسکتا ہے

آپ اپنے کالموں کے ذریعے قوم کو تحرک پسندی اور تجدد آفرینی پر اکساتے رہے آپ نے زندگی کی 45 بہاریں دیکھیں آپ انتڑیوں کے کینسر میں مبتلا رہے آپ کی فکر سے لوگ ہمیشہ ضو پاتے رہیں گے حکومتی سطح پر بھی آپ کے کام کو سراہا گیا ہے اور مرغزار کالونی لاہور کے مرکزی پارک کو خورشید گیلانی پارک اور راجن پور کی مین شارع ہائی سکول روڈ کو خورشید گیلانی روڈ کے نام سے منسوب کیا گیا ہے اور ذکریا یونیورسٹی میں ایک طالبہ نے ایم اے کا مقالہ بھی لکھا ہے میں سمجھتا ہوں کہ حکومت ایسے افراد کی جتنی قدر کرے کم ہے زیرِ نظر کتاب قلم برداشتہ کا دوسرا حصہ ہے جو پہلی دفعہ چھپ کر مارکیٹ میں آرہا ہے قلم برداشتہ شروع دن سے ہی اپنا جادو جگاتا آیا ہے قلم برداشتہ اپنے قاری کو نئی امید دلاتا اور پرانے پڑھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے حلقے کو بھی متاثر کرتا ہے مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ فکر کا یہ بانکپن اور سوچ کا اجلاپن مزید نکھرتا جائے گا

آپکے برادرِ اصغر صاحبزادہ احسان گیلانی اس کتاب کے مرتب ہیں آپ عصرِ حاضر کی کربلا میں فکرِ خورشید کا علم بلند رکھے اور خورشید کی کرنوں کو سنبھالے ہوئے ہیں اور نوجوان پبلشر محمد فہد اپنے ادارے "کتاب محل" سے اسے شائع کررہے ہیں صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی جیسے نادرِ روزگار فرد کی تصنیف چھاپنا ان کے اعلیٰ ذوق کی علامت ہے۔ قلم برداشتہ کا دوسرا حصہ خورشید گیلانی کے پڑھنے والوں کو ضرور متاثر اور متوجہ کریگا میں انہیں اس خوبصورت کام پر تہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس سعیءِ جمیلہ کو شرف قبولیت عطا کرے اور اسے قبولِ عام بنائے۔ (آمین)

علی سجاد رانا
(صحافی)

فہرست مضامین

ارباب سجادہ و مسند کی خدمت میں

معزز مشائخ عظام اور قارئین کرام کو معلوم ہونا چاہیے کہ راقم الحروف خود خانوادہ سادات کا ایک ادنیٰ فرد اور سندھ کی معروف درگاہ بھرچونڈی شریف اُس کا سسرال ہے اس لئے میں جو بات کرنے چلا ہوں کہ ساحل پر بیٹھ کر نظارہ طوفان کرنے والے کی نہیں بلکہ اس کوچے کے ہر پیچ وخم سے واقف شخص کی بات ہے اس لئے ترجیحاً زیادہ توجہ اور دھیان کی مستحق ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب اسلام کا مرکزی سیاسی نظام کمزور ہوا تو اس کے مثالی معاشرتی نظام کو مسلمان معاشرے میں جاری اور زندہ رکھنے کا فرض صوفیاء کی خانقاہوں اور تربیت گاہوں نے سرانجام دیا۔ حضرت حسن بصریؒ سے لے کر پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ اور حضرت فضیل بن عیاضؒ سے لیکر محمد کرم شاہ الازہریؒ، حضرت بہاء الدین نقشبندؒ سے لیکر عبدالقادر رائے پوریؒ اور حضرت شہاب الدین سہروردیؒ سے لیکر خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ تک صوفیاء و صلحاء کی ایک روشن کہکشاں ہے جس کا ہر ستارہ بجائے خود نور کا مینارہ ہے اور انہی لوگوں کے دم قدم سے ہر دور میں اسلام کی آبرو، عمل صالح کی خوشبو، اسلامی سادگی کی حلاوت، فقر وغیور کی روایت، بے نیازی و خودداری کی روشنی اور بے نفسی و خدا پرستی کی تازگی قائم رہی جس شخص کو اسلامی تاریخ سے معمولی سی بھی دلچسپی، مسلمانوں کے ملی وتہذیبی عروج و زوال سے واقفیت اور اخلاق واقدار

کی بدلتی کروٹوں سے آگہی حاصل ہے وہ اس سے انکار نہیں کرتا، کوئی زمانہ اور کوئی خطہ کبھی بھی ایسے صلحاء وصوفیاء سے خالی نہیں رہا، جنہوں نے اسلامی تعلیمات اور اسلامی اخوت کو فروغ دینے میں تہذیبی اور پورے جوش سے حصہ لیا ہو آج عقائد و اعمال اور اسلامی اقتدار و اخلاق کی جو بھی بہار نظر آتی ہے اسے شگفتہ وشاداب رکھنے میں ان اللہ والوں کا مرکزی کردار ہے اگر تو یہی تصوف ہے اور یقیناً ہی ہے اور اگر صوفیاء ایسے ہی تھے اور یقیناً ایسے ہی تھے تو اس کا کوئی منظر نہیں اس پس منکر میں ضروری ہے کہ مشائخ عظام کو اپنی صفوں پر نگاہ دوڑانے اور اپنا جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور یہی خیال ان سطور کے لکھنے کا محرک بنا ہے اگر موجودہ سجادہ نشین حضرات کوئی قومی کردار ادا کرنا اور پھر سے سجادہ ومسند کو رونق بخشنا چاہتے ہیں تو ان گزارشات کو ضرور لائقِ اعتناء سمجھیں یہ گزارشات نہ تو کسی منکر و مخالف کی ہیں اور نہ کسی لنگر کے ٹکڑوں پر پلنے والے خادم اور کسی کے خاندانی مرید کی ہیں بلکہ ایک ایسے شخص کی ہیں جو صوفیاء کرام کو صحیح معنوں میں انبیاء کا وارث سمجھتا، تصوف کو اسلام کے مثالی معاشرتی نظام کی جھلک قرار دیتا اور سلسلہ فقر اور حصولِ زر کے درمیان واضح فرق کرتا ہے۔ جہاں تک تصوف کی امہات کتب اور صوفیاء کرام کی سوانح حیات سے معلوم ہو سکا ہے تو صوفیاء کرام کو معاشرے میں حاصل ہونے والے تقدس، وقار اور احترام کی یہ وجوہ ہیں۔

اولاً: صوفیاء کرام نے تصوف کو اشتہار اور پیری مریدی کو کاروبار نہیں بنایا تھا بلکہ ان کا کردار انہیں ابدی وقار اور روحانی اعتبار دے گیا ہے۔

ثانیاً: انہوں نے غیرت فقیر کی ہر دور اور ہر حال میں لاج رکھی، نہ شاہی مسجد کی امامت قبول کی، نہ شیخ الاسلام کا عہدہ مانگا نہ قرب امراء کا شوق پالا اور نہ قصر سلطانی پر نشیمن بنایا، اپنے دامن تو کل پیوند لگائے لیکن دھبے نہیں لگنے دیئے، سوکھی روٹی کے ساتھ باسی دال کھائی مگر دربار شاہی کے مرغ و ماہی سے گریز کیا۔

ثالثاً: وہ خود انسانوں کے درمیان انسان بن کر رہے نہ اپنے اوپر مافوق الانسان ہونے کا سائبان تانا اور نہ اپنے اور دوسروں کے درمیان کوئی دربان حائل کیا، عام لوگوں سے کمتر و بود و باش اختیار کی۔ نہ ملاّ کلاہ پہنی نہ ریشمی قبا اوڑھی، نہ کندھے پر مخملیں دوشالہ ڈالا، نہ ہاتھ میں یاقوت و زبرجد کی تسبیح رکھی، نہ ان کا کوئی عصا بردار تھا نہ کفش بردار، نہ متکبرانہ چلتے تھے اور نہ فاخرانہ بیٹھتے تھے۔

رابعاً: صوفیاء کرام نے اپنے کمالات و کرامات پر مشتمل اپنی نگرانی میں نہ کتاب لکھوائی نہ اپنے لئے القاب و خطابات تجویز کئے، نہ دھمال والے ملنگ پیدا کئے، نہ پوش پوش کرنے والے خادم مقرر کئے نہ اطلس و حریر کے گاؤ تکیے بنوائے اور نہ اپنا حلقہ بیعت بڑھانے کے لئے مریدوں کے جھتے تیار کئے۔

خامساً: اپنی زندگی میں سوائے مسجد کے نہ کوئی خانقاہ بنائی نہ دیوانِ خاص اور دیوان عام کھڑے کئے اور نہ محض ورثے کے لحاظ سے اپنی اولاد میں کسی کو سجادگی کا منصب سونپا، مریدوں میں جو زیادہ متقی نظر آیا اسی کو اپنا جانشین اور وارث قرار دیا، تا کہ تصوف آگے چل کر تکلف نہ بن جائے۔

سادساً: حلقہ تصوف میں رنگ، نسل، برادری زبان اور فرقے کو نہ کبھی زیر بحث لایا گیا اور نہ ان بنیادوں پر اپنی جماعت اور حلقے میں کوئی فرق و امتیاز روا رکھا بلکہ حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کی وصیت کا یہ جملہ تو قلب و روح کی انتھائی گہرائیوں میں ٹھنڈک بھر دیتا ہے۔

"ہر کہ دریں سرائے می آید او را نانے بدہید از ایمانے مپرسید"

"یعنی جو بھی فقیر خانے پر آ جائے اسے روٹی دی جائے اس کا عقیدہ و مسلک نہ پوچھا جائے" یہی دراصل روح تصوف اور اسلوب فقر ہے، جس کے باعث صوفیاء کرام عزیز جہان قرار پائے، نہ مناظرہ نہ مجادلہ نہ مناقشہ اور نہ مقاطعہ۔

سابقاً: صوفیاء کرام اگر چہ پیکران محبت اور سفیران انسانیت تھے مگر اس کا یہ مطالب نہیں کہ وہ ظالم و مظلوم میں امتیاز نہیں کرتے تھے ہوس و اخلاص میں فرق نہیں رکھتے تھے اور استحصال و انصاف کے درمیان لکیر نہیں کھینچتے تھے یہ درست ہے کہ وہ اقتدار کے حصہ دار نہیں تھے لیکن اصلاح اقتدار ان کا نصب العین رہا، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ باللہ کو ٹوکتے نظر آتے ہیں، بابا فرید گنج شکرؒ غیاث الدین بلبن کو آئینہ دکھاتے ہیں حضرت بختیار کاکیؒ، شمس الدین التمش، کی پیش کش ٹھکراتے ہیں اور مجدد الف ثانیؒ اکبر و جہانگیر کا محاسبہ کرتے ہیں اسی کا نام دراصل غیرت فقیر ہے۔

آج اگر ارباب سجادہ و مسند یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے بزرگوں نے مجاہدے اس لئے کاٹے اور چلے اس لئے کئے تھے کہ وہ اپنے جانشینوں کے لئے جاگیریں چھوڑ جائیں ان کے تقوی کو اشتہار بنا کر زر و جواہر کے انبار جمع کئے جائیں، ان کی نیکیاں اب گلی سات نسلوں کے ہر جرم کا کفارہ بن گئی ہیں۔ ان کی اولاد کو ورثے میں روحانیت بھی حاصل ہو گئی ہے اور ان کے کچے جھونپڑوں کو اب گنبد و مینار میں بدل کر لوگوں کی سادگی و خوش عقیدگی کا استحصال کیا جائے تو یہ نہ کسی سچے صوفی کا کردار ہے اور نہ سجادہ و مسند کا کوئی دینی و اخلاقی معیار۔

آج جہاں ہر شعبہ زوال آمادہ ہے وہاں مسند و سجادہ بھی اس زد میں ہے اس لئے آج سیاسی انقلاب کے ساتھ ساتھ روحانی انقلاب کی بھی ضرورت ہے، اس کا نصاب خود صوفیاء کرام کا کردار ہے جسے زندہ اور اجاگر کرنے کی ضرورت ہے ورنہ سپاہ کی تیغ بازی اور خانقاہ کی حیلہ سازی میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔

10 مئی 2000ء

زبان، نسل، رنگ

صدیوں تک انسانیت جن تین چیزوں کے باعث ایک دوسرے کے بارے میں تعصب کا شکار رہی، نسلوں کی نسلیں آتش و آہن کا ایندھن بنتی رہیں، خاک و خون میں غلطاں رہیں اور قوموں کی قومیں نفرت کے جہنم میں جلتی اور برتری و کمتری کی سولی پر لٹکتی رہیں وہ تین چیزیں زبان، نسل اور رنگ ہیں تاریخ میں کئی لوگ صرف انہی باتوں کو اچھال کر لیڈر اور نام نہاد دادِ تحقیق دے کر مفکّر بنے، جب کہ ان تینوں میں سے کوئی بھی ایک جوہر کمال ہے نہ نشانِ فضل اور نہ وجہِ افتخار، کسی کی زبان وہی ہوتی ہے جو گردوپیش میں روزمرہ کے طور پر بولی جاتی ہے بادیہ نشین سے لیکر تخت نشین تک، نسل کا تعلق نقطے اور خون سے ہے اور یہ دونوں چیزیں نجس و ناپاک اور حقیر و مکروہ، رہ گیا رنگ یہ تو موروثی ہوتا ہے یا پھر موسم اور آب و ہوا کا محتاج، تو پھر کس بنیاد پر زبان کو برتری، نسل کو ناموری اور رنگ کو بزرگی کی دلیل تسلیم کیا جائے؟ عقل و منطق اور علم و اخلاق کی وہ کون سی میزان ہے جس میں رکھ کر ان تینوں کو تولا جائے تو کوئی ہلکی چیز نکلے اور کوئی بھاری شے، ہر انسان بولتا ہے ہر ایک کا کوئی نہ کوئی شجرہ نسب اور خاندان ہے اور ہر شخص کا ایک رنگ، پھر کیسے ایک زبان کو دوسری پر فوقیت، ایک نسل کو دوسری پر ترجیح اور ایک رنگ کو دوسرے پر برتری حاصل ہو گئی؟ کوئی چیز حسن مطلق نہیں اور کوئی قبحِ مجرد نہیں حسن و قبح اضافی ہوتے ہیں جیسے اچھی آواز اور بھلی صورت، یہ سماعت و

بصارت کی ضیافت تو کہلا سکتی ہیں وجہ عداوت اور بنائے مخاصمت ہر گز نہیں، معلوم نہیں اتنی سادہ اور فطری سی بات کو ایک معمہ اور مسئلہ کیوں بنا دیا گیا۔؟ انہی تعصبات کے حوالے سے قبیلے برسرِ پیکار ہوئے، علاقے تقسیم ہوئے، خونی لکیریں کھینچی گئیں، نفرت کے الاؤ بھڑکائے گئے، فخر و غرور کے نغمے الاپے گئے انسانوں کو انسانوں کے در پے کیا گیا، تقسیم و تفریق کے بازار سجائے گئے، اذہان و قلوب میں زہر انڈیلے گئے، سرا چھالے گئے اور بنی آدم کے درمیان آقائی و غلامی کے قلعے تعمیر کیئے گئے۔ ہر زبان اپنی جگہ کامل و کفیل ہے، ہر نسل آدم اول سے چلی اور ہر رنگ اپنے طور پر جاذب نظر ہے زبان کی بہتری کے لئے کوئی واحد معیار نہیں نسلی تقدس کے لئے کوئی متفقہ پیمانہ نہیں او ر رنگ کی فوقیت کے لئے کوئی یکساں میزان نہیں، زبان بس وہی زبان ہے جو اظہار و ابلاغ کر سکے نسل بس یہی ہے جس سے کوئی نوع انسانی کا فرد معلوم ہو اور رنگ اس کے سوا کچھ نہیں کہ آنکھوں کو نظر آئے، جب صورت واقعہ یہ ہے تو پھر کبر و امتیاز چہ معنی دادر؟ شیر دھاڑتا ہے، بلا غراتا ہے، اونٹ بڑ بڑاتا ہے، ہاتھی چنگھاڑتا ہے، مینڈک ٹرّاتا ہے، اور انسان بولتا ہے، شیروں میں دھاڑنے پر کبھی تعصب نہیں ابھرا، بلے غرّانے پر ایک دوسرے کو چھوٹا بڑا اقرار نہیں دیتے، اونٹ بڑبڑانے پر اپنے درمیان تفریق پیدا نہیں کرتے ہاتھی چنگھاڑنے پر عزت و ذلت کا فیصلہ نہیں کرتے اور مینڈکوں پر ٹرانے پر کبھی جماعت بندی نہیں ہوئی تو حضرت انسان بولنے پر اپنے درمیان فرق و امتیاز کیوں قائم کرے؟ پرندے بیسیوں رنگوں میں ملتے ہیں لیکن ان میں اس حوالے سے کوئی جنگ نظر نہیں آتی انسان میں یہ آہنگ کس طرح لائق تحسین ہو سکتا ہے؟ شیر بس شیر ہوتا ہے کیوں کہ اس کا سلسلہ توالد و تناسل ایک جیسا ہے "کوئی چوہدری شیر" اور کوئی "کمین شیر" آج تک نہیں سنا گیا، پھر انسان بھی انسان ہونا چاہیے کیوں کہ اس کی پیدائش کا بھی ایک طریقہ ہے یہاں "چوہدری" اور "کمین" کی

تقسیم کا کیا مطلب اور جواز؟ تمام مخلوقات میں سے قدرت نے جس نوع کو عقل و شعور سے نواز کر اشرف و افضل بنایا وہی اس باب میں سب سے زیادہ بے عقلی اور شعور دشمنی کا ثبوت دے رہی ہے۔

اپنی حدود سے نہ بڑھے کوئی عشق میں
جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

رنگ و نسل اور زبان کی بنیاد پر فرق و امتیاز تو تب ہو کہ یہ سب اکتسابی کمالات ہوں جب کہ کوئی انسان اپنی مرضی سے گورا اور کالا پیدا نہیں ہوتا، کوئی نسل کا انتخاب خود نہیں کرتا، ماں باپ جس نسل کے ہوں اولاد اسی میں شمار ہوتی ہے اور کوئی شخص جہاں پلا، بڑھا اور جس گود اور گرد و پیش میں پرورش پائی وہی اس کی زبان قرار پائی ، جب عقل و منطق اور مذہب و اخلاق کی رو سے کوئی فرد "پیدائشی گنہ گار" نہین بلکہ ہر ایک " فطرت" پر پیدا ہوا اور فطرت بہت سادہ بہت صاف ، بہت پاکیزہ اور Cleanslate ہے اس پر جو نقش ابھرتا ہے وہ بعد کا ہوتا ہے جو لکیریں بنتی ہیں وہ بعد کا عمل ہیں اور جو رنگ چڑھتا ہے وہ بعد کا رنگ ہوتا ہے۔ تو پھر کالے رنگ کو پیدائشی جرم قرار دینے کا کیا جواز ہے؟ افریقی زبان کو پیدائشی گناہ سمجھنا کہاں کی دانش مندی ہے؟ اور یونانی یا حبشی ہونے کو پیدائش خامی کہنا کون سی انسانیت ہے؟ جب کہ صدیوں تک انہی چیزوں کو کسی انسان کا "جرم" سمجھ کر اُسے بعض حقوق سے محروم رکھا گیا سوسائٹی میں اسکی حیثیت متعین کی گئی اور اسے ایک خاص نام دے کر حقیر و ذلیل سمجھا گیا۔ ارسطو جیسا "بابائے جمہوریت" اہل یونان کو "آقا" اور غیر یونانیوں کو "غلام" قرار دینے پر اپنا نتیجہ فکر اور زور قلم صرف کرتا رہا۔ آخر یونان میں پیدا ہونا کون سا سرمایہ فخر ہے اور مصر یا حبشہ میں جنم لینا کس طرح باعث ندامت ہے؟۔ آخر کسی بچے نے کہیں تو جنم لینا ہے؟ شاہی محل میں یا فقیر کی کٹیا میں، صحراء میں یا کوہستان میں، شہر

میں یا دیہات میں، گورے کے ہاں، یا کالے کے ہاں، ایشیا میں یا یورپ میں، عربی ماں کے بطن سے یا عجمی باپ کی پشت سے، اس نومولود بچے کو علاقے، زبان، آب وہوا، براعظم یا عرب وعجم کی سزا دینا کہاں کا انصاف ہے؟ یہی حال پیشوں کا ہے کوئی لوہا ڈھالتا ہے، کوئی چمڑا رنگتا ہے، کوئی کپڑا بنتا ہے، کوئی ہل چلاتا ہے، کوئی بان بٹتا ہے، کوئی اون کاتتا ہے کوئی نان بائی ہے، کوئی جلد ساز ہے کوئی مٹھائی فروش ہے، کوئی حجام ہے اور کوئی لکڑہارا، یہ سب لوگ انسانوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنے والے ہیں اور ہر صغیر وکبیر ان چیزوں کا محتاج ہے، پھر ان پیشوں کو حقارت سے دیکھنا بدمستی نہیں تو اور کیا ہے؟ ارسطو اور افلاطون کے بغیر تو شائد کار حیات چل جائے مگر ان لوگوں کے بغیر زندگی کی گاڑی مشکل سے چلتی ہے اور پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ مفت خور اہل زر معزز ہوں اور محنت کش صاحب ہنر حقیر پائیں اس سے بڑھ کر سکہ شاہی اور کیا ہوسکتی ہے؟ برتری وکمتری کا ایک اضافی مگر بہت ہی مصنوعی معیار، پیسہ'' بھی ہے لیکن یہ بھی سمجھ سے بالا ہے کہ پیسہ بذات خود قابل تعظیم کیسے ٹھہر گیا؟ اس طرح تو کئی اضافی معیار موجود ہیں مثلاً حسن کیوں نہ وجہ برتری قرار دیا جائے؟ اونچا قد مضبوط جسم، گھنے اور گھنگھریالے بال، سرمگیں آنکھیں یہ ساری باتیں بھی تو بڑائی کا پیمانہ بن سکتی ہیں۔ لیکن یہ سب خرافات اور توہمات ہیں۔

اس باب میں اسلام نے بنی نوع انسان کو ہر ٹیڑھ، زلیغ، ضلال، کجی اور افراط وتفریط سے بچا کر سواء السبیل اور صراط مستقیم فراہم کیا ہے اور وہ ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم یعنی کردار وعمل کی بالاتری اس لئے کہ کردار وعمل پیدائشی نہیں اکتسابی وصف ہے۔ جو محنت کرے وہ عزت پائے اور اس میں بھی قابل توجہ اور معنی خیز بات یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک وہ شخص مکرم ومعزز ہے جو صاحب کردار ہے وہ اس بناء پر لوگوں پر رعب نہ جھاڑتا پھرے نہ کوڑا ہاتھ میں لے کر اپنی تکریم وتعظیم دوسروں سے

منواتا پھرے وہ حسن کردار اور خوبی عمل سے اللہ کے ہاں مکرم بنتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی تکریم دوسروں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے گویا یہ چیز انسان اپنے لئے حجت نہ بنا لے بلکہ خدا کی نعمت سمجھے کہ اسے دنیا میں ناموری اور سرخروئی نصیب ہوگئی ہے۔

یہی معیار آفاقی، شرف انسانی کے عین مطابق، اونچ نیچ سے پاک، قابل فہم اور عقلی و عملی ہے، اور اسی سے توازلی حیات اور حسن کائنات قائم رہ سکتا ہے اور عالمی امن کا خواب پورا ہوسکتا ہے۔ ایک ''جولاہازادہ'' اپنے علم و عمل سے ''امام غزالی'' بن سکتا ہے اور دنیا کو ماننا چاہیے ایک ''غلام زادہ'' اپنی اہلیت کے بل بوتے پر ''سلطان قطب الدین ایبک'' بن سکتا ہے اور یہ اس کا حق ہے ایک ''حبش زادہ'' اپنے حسنِ کردار سے ''سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن سکتا ہے اور وہ اس عزت کا مستحق ہے اور ایک ٹوپی فروش کا بیٹا اپنی لیاقت و ذہانت کی بنیاد پر ''فلیسوفِ مشرق''، ''حکیم الامت'' علامہ اقبال بن سکتا ہے اور اسے دنیا کی کوئی طاقت ایسا بننے سے نہیں روک سکتی۔ اسلام کا دیا ہوا یہی معیار عزت دراصل اساسِ تمدّن ہے۔ شرف انسانی کا ضامن ہے امن عالم کا محافظ ہے، بین الاقوامیت کی روح ہے ارتقائے فکر و ذہن کا سرچشمہ ہے، جاہلی تعصّبات کی بیخ کنی کا موثر ذریعہ ہے اور خودی کا نگہبان ہے، رنگ و نسل اور زبان سب بتانِ وہم و گمان ہیں اور ان کی پوجا شرکِ محض، رنگ ایک ہی ہے یعنی، ''صبغۃ اللہ'' (اللہ کا رنگ) نسل ایک ہی ہے یعنی ''نسلِ آدم'' اور زبان ایک ہی ہے۔ یعنی محبت کی آفاقی زبان۔

تمیز رنگ و بو بر ما حرام ست
کہ، پروردہ یک نو بہاریم

19 جنوری 2000ء

عورت اور اسلام

اقوام متحدہ کی ایک قرارداد کے مطابق ۸ مارچ ''خواتین کا عالمی دن'' کے طور پر منایا جاتا ہے، یہ قرارداد ۱۹۵۶ء کو منظور کی گئی، خواتین نے اپنے حقوق کے حوالے سے ۱۹۰۷ میں پہلی آواز بلند کی، اور ریکارڈ کے مطابق یہ مارچ کی آٹھ تاریخ تھی۔ آگے چل کر یہ آواز توانا ہو گئی اور بالآخر اس کی صدائے بازگشت اقوام متحدہ میں سنی گئی اور یوں ایک دن عالمی سطح پر ''خواتین کا دن'' قرار پایا۔ یہ تو ہے خواتین کا عالمی دن منانے کا تاریخی پس منظر، لیکن اسلام اس بات میں تاریخی اعتبار سے ثابت شدہ اولیت اور سبقت کا حامل ہے، خطبہ حجۃ الوداع جسے اپنے مشمولات کے لحاظ سے منشورِ انسانیت کہنا زیادہ صحیح ہے اس میں حضور ﷺ نے عورت کے بارے میں اپنے سامعین، مخاطبین اور متبعین کو واضح ہدایات عطا فرمائیں، گویا یورپ، افریقہ اور امریکہ میں اٹھنے والی تحریک کی کل عمر تقریباً ایک صدی ہے جب کہ عورت کی شخصیت، شناخت، حقوق، شرف اور احترام کے حوالے سے اسلام کی آواز چودہ سو سال قبل گونجی، یہ امر نہ کوئی فکری مغالطہ ہے نہ تقریری مبالغہ بلکہ ایک تاریخی واقعہ ہے اور حدیث و سیرت کی تمام کتابوں میں خطبہ حجۃ الوداع درج ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔

''اے لوگ سنو! تمہارے اوپر تمہاری عورتوں کے حقوق ہیں۔ اس طرح ان پر بھی تمہارے حقوق ہیں عورتوں پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ اپنے پاس کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جو تمہیں پسند نہ ہو وہ کوئی خیانت نہ کریں اور کھلی بے حیائی کی مرتکب نہ

ہوں، تم انہیں اچھی طرح لباس اور خوراک مہیا کرو ان کے بارے میں خدا کا خوف اور لحاظ رکھو تم نے انہیں خدا کے نام پر حاصل کیا اور اسی کی اجازت سے وہ تم پر حلال ہوئیں۔ لوگو میری بات سمجھ لو۔

بلا شبہ عورت دنیا کی مظلوم مخلوق ہے اور اسے کمزور سمجھ کر مختلف علاقوں اور سوسائٹیوں میں دبا کر رکھا گیا اس کے شرف کی توہین کی گئی، اس کو بدلے اور انتقام کا نشانہ بنایا گیا، اس کے مالی و قانونی حقوق پامال کئے گئے، اسے دوسری جائیداد کی طرح لائق تقسیم و انتقال سمجھا گیا، اور غیرت کے نام پر اس کا خون بہایا گیا، یہ سب تاریخی حقائق و مشاہدات ہیں لیکن اسلام نے پہلی بار عورت کو مرد کی طرح ایکمکمل شخصیت اور سوسائٹی کے کارآمد فرد کی حیثیت سے تسلیم کیا، اس کے مالی مفادات اور قانونی حقوق کا تحفظ اور عائلی و خاندانی فرائض کا تعین کیا، یہ کھلے حقائق ہیں اور انکی تصدیق تاریخ کے اوراق، قرآن و حدیث کی ہدایات اور سیرت و فقہ کے صفحات سے بہ آسانی کی جاسکتی ہے۔ ایک کالم ان حقائق و واقعات اور دلائل و تفصیلات کا ظاہر ہے قطعاً متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اشارات پر اکتفاء کرنا ضروری ہے لیکن یہ اشارات وہ سنگ میل ہیں جو تاریخ کی شاہراہ پر نصب ہیں اور ہر منزل کا واضح پتہ دے رہے ہیں مرد کی طرح عورت کا آغاز اس کی پیدائش سے ہوتا ہے اور یہیں سے بات چلتی ہے۔

☆ عرب کے جاہلی دور میں بیٹی کی پیدائش منحوس سمجھی جاتی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے بیٹے اور بیٹی کی پیدائش کو نعمت یا نحوست نہیں بلکہ اپنی حکمت قرار دیا یعنی کسی کے ہاں بیٹا ہو تو کوئی شرف نہیں اور بیٹی ہو تو کوئی توہین نہیں یہ سراسر خدائی حکمت اور معاشرتی ضرورت ہے تا کہ نسل انسانی آگے بڑھے۔

☆ رسول اکرم ﷺ نے بیٹی کو ماں باپ کے لئے خدا کی رحمت اور قیامت کے دن وسیلہ شفاعت و مغفرت قرار دیا ہے۔

☆ جب بیٹی جوان ہوتی ہے اور شادی کی عمر کو پہنچتی ہے تو اسلام نے نکاح میں لڑکی کی رضامندی کو ضروری قرار دیا ہے۔ ایجاب و قبول کا یہی مطلب ہے ورنہ نکاح دینی اعتبار سے منعقد ہی نہیں ہوتا۔

☆ اسلام نے حق مہر کو عورت کا شخصی حق قرار دیا ہے اور مرد حق مہر کے بغیر کسی عورت سے نکاح نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی مرد حق مہر دینے سے انکار کر سکتا ہے نہ اس کو روک سکتا ہے اور نہ غصب کر سکتا ہے تا آنکہ عورت خود اس کی اجازت نہ دے۔

☆ عرب کی جاہلی قدیم مسیحی اور ہندو سوسائٹی میں عورت کو مرد کے پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا تھا مگر قرآن مجید نے عورت کو مرد کا اور مرد کو عورت کا لباس قرار دیا، یعنی جز ولاینفک اور ایک دوسرے کی ضرورت اور ہمراز و دمساز، کون سا آدم زاد ہے جو لباس کے بغیر رہتا ہو، پتھر اور غاروں کے زمانے کی بات اور ہے۔

☆ مرد کو عورت کے نان نفقے کا مکمل ذمہ دار قرار دیا گیا اس میں کوتاہی کی صورت میں مرد دنیا میں قانونی طور پر ذمہ دار اور آخرت میں اخلاقی طور پر جواب دہ ہے۔

☆ مرد کو جس طرح طلاق کے ذریعے عورت سے علیحدگی کا حق دیا گیا اسی طرح اسلام نے عورت کو خلع کے ذریعے مرد سے علیحدگی کا حق تفویض کیا۔

☆ جاہلی دور میں بیٹیوں کو زندہ در گور کیا جاتا تھا اسلام نے بیٹی کی پرورش کو ماں باپ پر لازم اور فرض قرار دیا۔

☆ مرد جو کمائے اس میں عورت کا حق ہے اور عورت اگر کمائے یا ماں باپ اسے کچھ دیں تو اس میں مرد کا کوئی حق اور حصہ نہیں۔ یہ بات قرآن، حدیث اور فقہ میں واضح طور پر ملتی ہے۔

☆ بجز کسی واضح اخلاقی انحراف کے اسلام نے عورت پر ہاتھ اٹھانے اور جسمانی سزا دینے کی ممانعت کی ہے۔ اور بڑی سے بڑی اخلاقی غلطی کی اصلاح کے بعد

مرد پر لازم ہے کہ وہ عورت کو مکمل تحفظ، محبت اور کفالت دے۔

☆ ہندو معاشرے میں ''ستی'' کی قبیح انسانیت سوز اور شرمناک رسم آج بھی ہے یعنی مرد کے مرنے کے ساتھ ہی عورت بھی جل مرے لیکن اسلام نے بیوہ کو چند ماہ کے سوگ کا حکم دیا اور اس کے بعد پھر سے خوشگوار ازدواجی زندگی کے آغاز کی ہدایت کی ہے اور بیوہ سے کسی ترجیحی سلوک کی ممانعت ہے خود رسول اللہ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا نکاح ایک بیوہ خاتون (حضرت خدیجہؓ) سے فرمایا۔

☆ شخصی، اخلاقی، مالی، قانونی سماجی اور کاروباری حق جو بھی مرد کو حاصل ہے وہی عورت کو حاصل ہے اسلام میں عورت کا احترام مرد کی طرح ہر ایک پر واجب ہے اس کا تحفظ سوسائٹی اور ریاست کی ذمہ داری ہے، عورت اپنے مال کی خود مالک ہے، وہ قانونی طور پر ایک ذمہ دار اور آزاد شہری ہے۔ سماجی اعتبار سے اسے وہ سہولت اور حق حاصل ہے جو مرد کو حاصل ہے۔ عورت تجارت اور کاروبار کر سکتی ہے ہر شعبے میں کام کر سکتی ہے عورت، ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر، سائنس دان، سیاستدان، سپاہی، تاجر، وکیل، صحافی، عالم، فقیہہ، مصنف، ممبر، سب کچھ بن سکتی ہے۔ اسلام اس پر کوئی قدغن نہیں لگاتا صرف ان اخلاقی حدود کا اسے پابند بناتا ہے جن کا مرد بھی پابند ہے، گویا اسلامی تاریخ و تہذیب میں حضرت حسن بصریؒ اور حضرت رابعہ بصریؒ دوش بدوش کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

☆ عہد جاہلیت میں عورت ترکے کی وارث نہیں ہوتی تھی اسلام نے میراث میں اس کا باقاعدہ حصہ مقرر فرمایا عورت خواہ ماں ہو، بیٹی ہو، یا بیوی ہو، سب کے حصے طے کر دیئے ہیں۔

اسلام نے عورت کیلئے اگر حجاب رکھا ہے تو مرد کیلئے غَضِّ بَصَر گویا دونوں اپنے اپنے دائرے کے پابند ہیں۔

☆ عہد جاہلیت میں عورت کسی جائیداد کی مالک نہیں بن سکتی تھی اسلام نے اسے یہ حق پہلے دن سے عطا فرما دیا۔ عورت، زمین، کارخانہ، مکان، موٹر، مکان اور زر نقد کی مالک ہو سکتی ہے اور یہ اس کا حق ہے۔

☆ اسلام نے مشاورت میں عورت کو مرد کے برابر حق عطا فرمایا ہے، اور شہادت میں بھی بعض حوالوں سے اس کی گواہی مکمل اور جامع ہے۔

☆ اسلام ماں کے لئے عزت، بیٹی کے لئے شفقت، بہن کے لئے مروت اور بیوی کے لئے محبت کی ہدایت کرتا ہے حضورﷺ اپنی رضاعی ماں کے لئے اپنی چادر بچھاتے اور اسے اپنی جگہ پر بٹھاتے تھے۔ بیٹی کے لئے احتراماً کھڑے ہو جاتے اور اس کا ماتھا چومتے تھے، رضاعی بہن کے لئے تحائف و ہدایا کا اہتمام فرماتے تھے اور بیوی کے لئے بے حد محبت و اپنائیت کا اظہار فرماتے تھے۔ یہ سارے واقعات سیرت کی کتابوں میں بڑے جلی الفاظ میں منقول ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ ۸ مارچ کو علامتی طور پر ''عالمی یوم خواتین'' منانا دنیا کی توجہ اس جانب مبذول کرانا ہے کہ اقوام متحدہ نے گویا پہلی بار عورت کے دفاع، مرتبہ اور شرف اور حق کا احساس کیا اور لحاظ رکھا ہے۔ حالانکہ یہ بہت بڑی غلطی فہمی ہے اس باب میں اسلام کو اولیت حاصل ہے یورپ جس انداز میں عورت کے حقوق اور آزادی کی بات کرتا ہے وہ تو اس کی حق تلفی اور توہین ہے یہ یورپی تہذیب ہے جو ماں، بیٹی، بہن اور بیوی کے امتیازات اور تشخصات کو تباہ کرتی ہے، عورت کو رقص، ماڈلنگ، ایکٹنگ اور مارکیٹنگ کے لئے استعمال کرتی ہے وہ اسے گھر جیسی محفوظ اور مقدس چار دیواری سے نکال کر کلب، تھیٹر، ڈانس ہال اور بازار جیسی مکروہ جگہوں پر لے آتی اور اس سے سفلی جذبات کی تسکین چاہتی ہے، یورپ میں طلاق کی روز افزوں شرح، بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ بنانے کی وبا،

کم عمر بچیوں پر جنسی تشدد کی آندھی، ماں باپ کی شناخت سے محروم بچوں کی بے تحاشا تعداد اور بوڑھی عورتوں کی بے بسی کی ہولناک تصویر اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ عورت اپنے شرف اور حق سے محروم ہو چکی ہے، جب کہ اسلام مہد سے لحد تک عورت کو درجہ بدرجہ احترام، تحفظ اور تقدس عطا کرتا ہے۔ ۸ مارچ کا خواتین کا عالمی دن سر آنکھوں پر مگر تاریخی حقائق اور تصریحات کو ذہن میں رکھ کر اسے منانا چاہیے اور عورت کے وہ حقوق جو ابھی تک اسے نہیں مل سکے ان کے بارے میں عورت کے اندر آگاہی پیدا کرنے، ان کے لئے آواز اٹھانے اور عورت کو اس کا جائز مقام دلانے کے لئے مزید جدو جہد کی ضرورت ہے اور اسلامی تعلیمات کے مطابق اسے معاشرے کا مفید اور کارآمد فرد بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ فکر و شعور ابھارنے کی کاوش کرنی چاہیے، عورت کو بھی مغرب کا اشتہار بننے کی بجائے اسلام کے حصار میں آ کر مصروفِ عمل ہونا چاہیے۔

۸ مارچ ۲۰۰۰ء

جاگیرداری...........راہ کا روڑا

جب سے فوجی حکومت آئی ہے اس نے مستقبل کے حوالے سے کچھ معنی خیز اشارے دیئے ہیں جن کے سبب مختلف حلقے اندر ہی اندر مضطرب اور بے چین ہو رہے ہیں۔ ان میں تاجر، سیاستدان، مذہبی راہنما اور جاگیردار شامل ہیں۔

جنرل سیلز ٹیکس اور ڈاکومنٹیشن کے حوالے سے تاجر، نئی اور بنیادی سیاسی و انتخابی اصطلاحات کے باعث سیاستدان، یکساں دینی نصاب تعلیم کی ترویج کے سبب مذہبی رہنما اور وسیع پیمانے پر ازسرِ نو زرعی اصطلاحات کے اعلان کی وجہ سے جاگیردار پریشان اور برہم ہیں۔ اگرچہ ابھی تک اس ضمن میں نہ تو کوئی باقاعدہ حکومتی تجویز اور اسکیم سامنے آئی ہے اور نہ ان تبدیلیوں اور اصطلاحات کی بابت کوئی ٹھوس اور نظر آنے والی پیش رفت ہوئی ہے، تاہم اس سرگوشی اور اموزہ پر جاگیردار سب سے زیادہ سٹپٹائے ہیں۔ اس لیے کہ یہ طبقہ سب سے زیادہ متاثر ہوگا، کیوں کہ انہی جاگیرداروں میں بہت بڑے کاروباری لوگ بھی ہیں۔ سیاست بھی انہی کے ہاتھوں یرغمال بنی ہوئی ہے انہی جاگیرداروں میں بڑے بڑے مشائخ، گدی نشین اور پیر بھی شامل ہیں اور خالص جاگیردار طبقہ تو ویسے بھی پریشان ہونا چاہیے، کہ وہ ان اصطلاحات کی زد میں براہ راست آ رہا ہے۔

ان سطروں کی اشاعت تک جاگیرداروں کا وہ اجلاس منعقد ہو چکا ہوگا جو پیر پگارا نے کراچی میں اپنی رہائش پر بلایا ہے، میں پورے یقین و اعتماد، ایمان و ایقان

اور وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ پاکستان میں دیکھا جانے والا ہر خواب نا آسودہ اور تشنہ تعبیر رہے گا جب تک کہ ملک کے فیوڈل ازم کا مکمل اور حقیقی معنوں میں خاتمہ نہیں کر دیا جاتا۔ کوئی نیشنل ایجنڈا اس لعنت کی موجودگی میں پروان نہیں چڑھ سکتا اور کوئی منصوبہ جاگیرداری کے ہوتے ہوئے نتیجہ خیز نہیں بن سکتا۔

جمہوریت کبھی فیوڈل سوسائٹی میں نہیں چل سکتی۔ فیوڈل ازم کے ہوتے ہوئے پارلیمنٹ کبھی اپنا حقیقی رول ادا نہیں کر سکتی۔ قانون شکنی اور سفارش کا کلچر جاگیر داروں کی وجہ سے قطعاً ختم نہیں ہو سکتا؟ ان کے ہوتے ہوئے الیکشن کبھی آزادانہ، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ نہیں ہو سکتے، فیوڈلز کے باعث اسلحہ کی روک تھام ناممکن ہے اور قانون ساز اداروں میں رائے عامہ کے حقیقی ترجمان لوگ کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ جاگیرداری راہ کا وہ روڑا ہے جسے ہٹائے بغیر نہ اخلاقی سفر ممکن ہے نہ سیاسی و معاشی پیش رفت ممکن ہے اور نہ آئینی و قانونی کلچر کا فروغ ممکن ہے، یہ بات پتھر کی لکیر اور حتمی و قطعی ہے۔ کوئی بھی حکومت ہو یا تو یہ فلسفہ مان لے یا پھر اپنی ہار مان لے، نصف صدی تو بیت گئی، اکیسویں صدی پوری بھی دیکھ لیتے ہیں "ہمیں گو ہمیں میدان" یہ بات کہہ کر کسی بنک لاکر میں محفوظ کر لی جائے ہماری اگلی نسل بھی اس خیال اور فلسفہ کی تائید و توثیق کرنے کی، کسی گہری اور تفصیلی بحث میں جائے بغیر چند سوالات یہ فلسفہ سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔

☆ جاگیرداری وجود میں کیسے آئی؟ اور اس کا شجرہ نسب کیا ہے؟ کسی سے پوچھ لیجیے یا کوئی سرکاری دستاویز اور تحقیقی کتاب پڑھ لیجیے یہ جاگیریں کسی فرد اور خاندان کی محنت کا حاصل اور ثمر نہیں بلکہ یہ تو زبردستی بے آباد زمینوں پر قبضے کے ذریعے ہاتھ آئیں، یا مختلف ادوار میں مطلق العنان اور عیاش بادشاہوں کی "علانیہ اور خفیہ" خدمات کے عوض ملیں، یا پھر انگریزوں نے "قوم فروشی" کے بدلے ان

لوگوں کو عنائت کیں اس قومی چوری کا کھرا ان تین گھروں تک جاتا ہے چوتھا گھر کوئی نہیں۔

☆ جاگیرداری نے قوم و ملک کو آج تک کیا دیا ہے؟ بجز چند خاندانوں کی سیاست و معاشرت پر اجارہ داری، سینکڑوں ہزاروں خاندانوں کی عزت نفس کی پامالی مختلف علاقوں میں غنڈہ گردی، ظلم و ستم اور تماش بینی، حکومتوں کے بناؤ اور بگاڑ میں دخل اندازی اور اونچے بنگلوں، طویل حویلیوں، قیمتی کتّوں، شوقِ شکار، اور مداخلت بہ کارِ سرکار کے اور کیا ہاتھ آیا ہے؟

☆ جاگیرداروں کے خانوادوں سے سوائے تین قسم کے افراد کے اور کوئی سامنے نہیں آیا ان میں اکثر مفت خورے نکمّے، تماش بین اور خوش فکرے ہیں، دوسرے سیاست برائے اقتدار کے کاروبار میں شریک اور حصہ دار ہیں اور تیسرے انگریزی کالجوں اور بیرونی یونیورسٹیوں میں پڑھ کر آتے اور افسر شاہی کا حصہ بنتے ہیں اس کے علاوہ ان لوگوں کی چوتھی کوئی قسم نہیں ان میں سے کسی نے نہ کوئی کالج قائم کیا نہ یونیورسٹی بنائی، نہ ہسپتال تعمیر کیا، نہ دین و مذہب کے دائرے میں کوئی خدمت سرانجام دی نہ شعر و ادب اور فلسفہ و سائنس میں کوئی حصہ ڈالا نہ تصنیف و تالیف کا کام کیا اور نہ کسی اچھے کلچر اور تمدن کا نمونہ پیش کیا۔

☆ صوفیاء کرام نے جو بے پناہ دعوتی و تبلیغی اور اخلاقی و روحانی اور علمی و اصلاحی کام کیا اور بے غرضی و بے لوثی کے ساتھ اشاعت اسلام کا فریضہ سرانجام دیا، اب ان عقابوں کے نشیمن میں زیادہ تر زاغوں کا بسیرا ہے اور بڑی بڑی گدیاں جاگیرداری میں بدل چکی ہیں۔ یہ پیر نما جاگیر خود تو ڈوبے ہیں اپنے بڑوں کو بھی لے ڈوبے ہیں۔ سندھ ہو یا پنجاب تمام کی تمام نامور خانقائیں اس کردار اور تشخص سے محروم ہو چکی ہیں جو تاریخ میں انہوں نے ادا کیا اور حاصل کیا تھا اللہ

، پیر گوٹھ، رانی پور، ملتان، پاکپتن، سمہ سٹہ، مہار وغیرہ کے تمام آثار و مناظر عوام کے سامنے ہیں اور جو لوگ اپنے بڑوں کے نقش قدم پر اب بھی چل رہے ہیں۔ وہ روز بروز اجنبی بنتے جا رہے ہیں اور انہیں سکہ بند پیر "مولوی" کہہ کر چٹکیوں میں اڑا دیتے ہیں یہ چند موٹے موٹے سوالات ہیں جو اس سارے مسئلے کو واضح کر دیتے ہیں۔

ہر چند کہ مختلف ادوار میں زرعی اصلاحات ہوئیں لیکن وہ اتنی بودی اور ناقص تھیں کہ مضحکہ بن کر رہ گئیں پچاس عشرے میں ایک تنظیم بنی تھیں۔ "انجمن تحفظ حقوق زمینداراں، تحت الشریعۃ" اور یادش بخیر اس کے کنوینئر ہمارے محترم نواب زادہ نصر اللہ خان تھے گویا زمینیں چھن گئیں تو شریعت کو خطرہ لاحق ہو جائے گا یہ لطیفے بھی ہمارے ملک میں رونما ہو چکے ہیں ہمارے بعض جاگیردار کہتے ہیں کہ جاگیریں رہی کہاں ہیں؟ اور پھر یہ کہ جاگیر تو وہ ہوتی ہے جس پر مالیہ اور آبیانہ نہ ہو جب کہ ہم تو مالیہ آبیانہ دیتے ہیں وغیرہ سوال یہ ہے کہ اگر جاگیریں نہیں رہیں تو واویلا اور آہ وفغان کس بات کی ہے؟ اس پر اکٹھ کرنے، کنونشن بلانے اور مشورہ کرنے کا کیا مطلب؟ اور جاگیریں تو نہیں رہیں مگر نئے ماڈل کی لینڈ کروزرز، کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں بنگلے اور شکار کے لئے قیمتی ساز و سامان کہاں سے آجاتا ہے؟

صورت واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جاگیرداری اگر زمین اور رقبے کے اعتبار سے فنی طور پر نہ بھی ہو مگر فیوڈل نفسیات بہر حال موجود ہے جو بہت سی سماجی و سیاسی قباحتوں کا سرچشمہ بنی ہوئی ہے۔ نمائشی کلچر، اسلحہ کلچر اور دشمنی کلچر یہ اسی نفسیات کے شاخسانے ہیں جو سیاسی و سماجی دونوں سطحوں پر بہت سے مسائل کھڑے کر رہے ہیں ہماری پختہ اور اپنے فہم کے مطابق یہ صائب رائے ہے کہ ملک میں ایک نیا بندوبست اراضی کیا جائے اس کے دو نقد فائدے تو یقیناً ہوں گے۔

ایک یہ کہ کاشتکار طبقے میں محنت کا جذبہ پیدا ہوگا، زراعت بڑھے گی اور ملک کو زرعی کفالت نصیب ہوگی کیوں کہ اب تک مزارع ایک طرح سے بیگار کرتا ہے اور اس کے لئے محنت کا کوئی داخلی اور سچا محرک نہیں وہ بہت بڑے جاگیردار اور بہت بڑی جاگیریں دیکھ کر عجیب سے نفسیاتی کرب اور خاص قسم کے احساس عدم تحفظ میں مبتلا ہے اگر اسے معلوم ہو کہ یہ قطعہ زمین بھی میرا ہے اور اس کا پھل بھی مجھے ملے گا اور میں اور میرے بال بچے کسی کے رحم وکرم پر نہیں تو وہ جی جان سے کھیتی باڑی کرے گا۔

دوسرے یہ کہ زمینیں اور رقبے دراصل جاگیرداروں کے محفوظ انتخابی حلقے ہیں، میلوں اور کئی بستیوں پر پھیلی ہوئی کس کی جاگیر میں کیسے ممکن ہے کہ لوگ اپنی مرضی کے ووٹ ڈالیں اور سیاسی عمل میں شرکت کریں پھر جاگیرداری نفسیات کے باعث ایک اور اصطلاح بھی بن گئی ہے وہ ہے ''نمک حرامی'' کی اصطلاح اگر کوئی مزارع ووٹ نہیں دیتا تو گردوپیش اسے ''نمک حرام'' کہتا ہے۔ کہ کھاتے تو فلاں کا ہوا اور ووٹ فلاں کو دیتے ہو، عام لوگوں میں معاشی احتیاج نہ رہے تو ان کی رائے اور سوچ بہت حد تک آزاد ہو جاتی ہے۔

۱۲مارچ ۲۰۰۰ء

لطیفہ

پہلے خبر ملاحظہ کیجئے، بعدازاں اس کی خبر لی جائے گی۔

''سابق وفاقی وزیر سید فیصل صالح حیات نے احتساب عدالت میں حضرت شاہ جیونہ کے عرس میں سجادہ نشین کی حیثیت سے شرکت کیلئے سترہ روز کیلئے پیرول پر رہائی کی درخواست کی ہے۔ درخواست میں موقف اختیار کیا گیا ہے کہ فیصل صالح حیات دربار شاہ جیونہ کے سجادہ نشین ہیں اور اس حیثیت سے ان کی عرس میں حاضری لازمی اور شعائر میں شامل ہے۔ عرس میں چراغ جلانے کی رسم ادا کی جاتی ہے شاہ جیونہ کے مریدوں کے عقیدے کے مطابق اگر اس موقع پر سجادہ نشین موجود نہ ہو تو وہ ایک سال کے عرصے میں فوت ہو جاتا ہے درخواست میں کہا گیا ہے کہ اس عرس میں کم از کم ایک لاکھ مرید موجود ہوتے ہیں اور چھ سات سو سال کے دوران کوئی سجادہ نشین بھی عرس کے موقع پر غیر حاضر نہیں ہوا، لہٰذا عرس کے موقع پر فیصل صالح حیات کو ۳ مئی سے ۱۹ مئی تک پیرول پر رہا کیا جائے (روزنامہ پاکستان، ۲۸ اپریل ۲۰۰۰)

قارئین عزیز! خبر آپ نے پڑھ لی، اور درخواست کا متن بھی دیکھ لیا، دل تو چاہتا ہے کہ اپنی قوم کی سادگی، جہالت، توہم پرستی، مذہب وروحانیت کے نام پر ٹھگ بازی اور کایاں لوگوں کی استحصالی ذہنیت پر زبردست مرثیہ لکھا جائے اور باقاعدہ ماتم کیا جائے کہ کس کس قماش کے پیر اور سجادہ نشین ہمارے مقدر میں آئے ہیں اور کن کن واہموں اور رسموں نے ہمارا گھیراؤ کر رکھا ہے؟ لیکن کیا کیا جائے کہ جہاں عوام اپنی

متاعِ عقل و دانش اور اپنی جنسِ عزت و خودداری بخوشی لٹانے اور بیچنے پر آمادہ ہوں وہاں بہروپئے پیروں اور سجادہ نشینوں کو کیا دوش دیا جائے؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ عرس میں حاضری لازمی مشاعر میں کیسے شامل ہو گئی ہے؟ اسلام کے لازمی شعائر میں تو نماز، حج، جہاد وغیرہ شامل ہیں جن میں حاضری لازمی اور موجبِ اجر و ثواب ہے عرس میں جانا نہ جانا ہر ایک کے ذوق کی بات ہے، جائے تو اس کی مرضی اور نہ جائے تو کوئی جرم نہیں۔ پھر کہا گیا ہے کہ سجادہ نشین آ کر عرس سے غیر حاضر ہو تو وہ سال کے اندر اندر فوت ہو جاتا ہے۔ یہ پہلی بات سے بھی زیادہ لایعنی اور بیہودہ ہے اسلام کے نظریے اور مسلمانوں کے مسلّمہ عقیدے کے مطابق موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے عرس سے غیر حاضری اور ایک سال کے اندر مر جانا کوئی ہندوانہ عقیدہ تو ہو سکتا ہے اسلامی نظریہ قطعاً نہیں حج جو صاحبِ نصاب پر فرض ہے اگر وہ نہ کرے اس کا اس پر گناہ تو ہے مگر یہ کہیں نہیں آتا کہ وہ اگلے حج سے پہلے فوت ہو جائے گا کیا بزرگوں کے عرس حج سے بھی بڑی "عبادت" ہیں جن میں ناغہ کرنے پر اللہ تعالیٰ اس قدر ناراض ہو جاتا ہے کہ وہ غیر حاضر ہونے والے کا رشتہ حیات منقطع کر دیتا ہے۔ اور ایک اہم بات یہ ہے کہ حضرت شاہ جیونہؒ بلا شبہ اللہ کے مقبول بندے ہوں گے بزرگ ہوں گے نیکوکار ہوں گے اور مستجاب الدعوات ہوں گے اور بہت سے بزرگ ہیں۔ پیران پاگارہ، مخدوم آف ہالہ، رانی پور وغیرہ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ ان بزرگوں کو اپنے سجادہ نشینوں پر صرف اس لئے کیوں غصہ آتا ہے کہ وہ عرس سے غیر حاضر ہوں تو فوت ہو جائیں گے لیکن یہ حضرات ملک کے بینک ڈکار جائیں ڈربی ریس میں حصہ لیں، مسجد میں جاتے ہوئے ان کے پاؤں جلیں نماز کا وقت ہونے پر انہیں تپ چڑھے، فلمی اداکاراؤں کے مجرے دیکھیں اور موقع ملے تو ان کو حبالۂ نکاح میں داخل فرما لیں، سوروں کا شکار کھیلیں، بڑے بڑے نسلی اور مہنگے کتے پالیں اور انہیں

اپنے مریدوں اور ملازموں سے زیادہ سہولتیں دیں اس کے باوجود انہیں نہ نزلہ ہو، نہ زکام، نہ کھانسی اور نہ فلو، ہاں اگر عرس میں شریک نہ ہوں تو فوت ہو جانے کا خطرہ پیدا ہوا بھلا اس سے بڑھ کر مضحکہ خیز بات اور کیا ہو سکتی ہے۔؟ ہے نا، ان دنیا کی تمام کثافتوں میں لتھڑے ہوئے نمائشی سجادہ نشینوں کا عوام کی جہالت سادگی اور توہم پرستی سے کڑا انداق، تاریخ میں جو بھی بزرگ گزرے ہیں ظاہر ہے وہ سبھی فرائض اسلامی کے پابند، متقی اور اصحاب خیر تھے، لیکن اب ان عقابوں کے نشیمن زیادہ تر زاغوں کے تصرف میں آ گئے ہیں اور یہ لوگ عوام کا خوب ذہنی واعتقادی استحصال کر رہے ہیں۔

ہمارے خیال میں سید فیصل صالح حیات کے بجائے احتساب کورٹ میں لمبی چوڑی درخواست دائر کرنے کے وہ مراقبہ میں چلے جاتے اور اپنی ''روحانیت'' اور ''کرامت'' کا ملبہ ججوں پر ڈال دیتے جنہوں نے انہیں کیمپ جیل میں کروڑوں روپے کا نادہندہ ہونے کے سبب بند کر رکھا ہے اور عرس میں نہیں جانے دے رہے۔ الٹا وہ کانپ رہے ہیں کہ میں حاضر نہ ہوا تو فوت ہو جاؤں گا حالانکہ اصلی قصور تو احتساب عدالت کا ہے جس نے انہیں روک رکھا ہے۔ مشہور ہے کہ ایک ہندو دیوی کا پجاری تھا مگر اس کا بیٹا آبائی عقیدے سے باغی اور منحرف، جب ہندو کام پر چلا جاتا ہے تو اس کا بیٹا دیوی کو اوندھا گرا دیتا اور یہ اُس کا روز کا معمول تھا اس لڑکے کے باپ کو مسلسل تین راتیں دیوی نے خواب میں آ کر کہا کہ اپنے بیٹے کو سمجھاؤ ورنہ میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گی ہندو پجاری نے عرض کیا، اس میں میرا کیا قصور ہے بے حرمتی تو میرا بیٹا کرتا ہے اور آپ ٹانگیں میری توڑیں گی یہ کیا ہوا؟ دیوی نے جھٹ سے کہا وہ نالائق تو مجھے مانتا ہی نہیں اس لئے افتاد تم پر پڑے گی۔ کچھ ایسا ہی معاملہ فیصل صالح حیات کا ہے کہ چونکہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ عرس میں نہ گئے تو فوت ہو جائیں گے اور ظاہر عدالت کا یہ عقیدہ نہیں اس لئے اُسے سجادہ نشین کو کیمپ جیل میں بند رکھنے پر بھی کوئی

خطرہ نہیں ویسے اصل بات یہ ہے کہ فیصل صاحب سمجھتے ہیں، پڑھے لکھے ہیں، وزیر رہے ہیں دنیادار ہیں اور روشن خیال ہیں مگر ان کے چکر میں پھنسے ہوئے لوگ کیونکہ دیہاتی ہیں ان پڑھ ہیں سادہ لوح ہیں یہ سب کچھ ان کے لئے ہے اگر یہ واہمے برقرار نہ رکھے جائیں تو پیری مریدی کا کاروبار کیسے چلے؟ مٹی کے دیئے کو ترسنے والے مرید نہ ہوں تو پیر کا گھر بجلی کے چراغوں سے کیسے روشن رہ سکتا ہے؟

پیر اور جاگیر

آج تک جو کچھ سننے کو آیا اور پڑھنے کو ملا ہے اس کے مطابق صوفیاء کرام کی کل متاعِ حیات، حق گوئی و بے باکی، تو شان استغناء، غیرتِ فقر، جفاکشی، سرکار دربار سے بے اعتنائی، اور حد درجہ قناعت تھی ان کا لباس ٹاٹ کا، جس پر پیوند ہوتے، ان کی غذا نان جویں اور ان کی رہائش ایک جھونپڑی تھی، نہ انہوں نے کبھی لباس فاخرہ پہنا اور نہ اس کیلئے ان کے دامانِ توکل پر کوئی دھبہ لگا، نہ انہوں نے مرغ و ماہی کی قامیں اپنے سامنے سجائیں اور نہ اس کیلئے ان کو شاہی مصاحبت اختیار کرنے کی ضرورت پیش آئی نہ انہوں نے اپنے لئے تاج محل کھڑے کئے اور نہ اس کیلئے ان کو غیرت فقر کا سودا کرنا پڑا، یہی وجہ ہے کہ ان کی صحبت میں تاثیر، کلام میں کشش اور کردار میں پختگی نظر آتی ہے۔ قریہ و ویرانہ سے بے نیاز جہاں بیٹھ گئے وہیں رونقیں اُگ آئیں صوفیاء کرام کے ذریعے اشاعتِ اسلام ہوئی، فاسقوں اور فاجروں کو توبہ کی دولت ملی اور خود دال بھات کھا کر لوگوں میں قند و نبات بانٹتے رہے، خطہ ہند میں جتنے بھی صوفیاء کرام کے حالات دستیاب ہیں ان سب میں یکسانی اور مشابہت ملتی ہے۔ خواہ وہ اجمیر کے خواجہ معین الدین چشتیؒ ہوں یا سرہند کے شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ ہوں یا بھر چونڈی کے حافظ محمد صدیقؒ، امروٹ کے خلیفہ تاج محمودؒ ہوں یا مٹھن کوٹ کے قاضی عاقل محمدؒ، تونسہ کے خواجہ سلیمانؒ ہوں یا مہار کے خواجہ نور محمد مہارویؒ علی ہذا القیاس، یہ درویشانِ

خدا مست اور خادمان دین وملت تھے۔ نہ ان کی جاگیریں تھیں، نہ حویلیاں، نہ بنگلے اور نہ بگھیاں، جس آن کے ساتھ وہ دنیا میں رہے اسی شان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے نہ جیتے جی آبروئے قناعت، بیچی اور نہ اپنے پیچھے بجز کردار کے کوئی اور دولت چھوڑی، مگر اب آنکھوں کے سامنے جو منظر ہے وہ بالکل ہی مختلف ہے نامور گدیوں کے سجادہ نشین اور مزاروں کے مجاور سب کے سب جاگیردار ہیں، لیکن جو بیچارے صرف اللہ اللہ کرنے والے ہیں وہ آج گمنام بھی ہیں اور بے زر ودام بھی، مگر نامی گرامی، روحانی رہنما، دوسرے جاگیرداروں سے بڑھ کر جاگیردار ہیں آخر اس کا کیا سبب ہے؟ بزرگوں کا اصل ورثہ تو ان کے ہاں نام کو نہیں لیکن چشم بددور زمینیں، جاگیریں، کوٹھیاں، بنگلے، گاڑیاں، حویلیاں، سواریاں اور اشرفیاں بڑی کثرت اور بہتات کے ساتھ ہیں ان چھنے آٹے کی روٹی، باسی دال کے ساتھ کھانے والوں، نہر کھال اور کنویں کا پانی پینے والوں، کھدر اور ٹاٹ کا کرتہ پہننے والوں، کچے چھپر اور جھونپڑیوں میں رہنے والوں اور میلوں پیدل چلنے والوں کا جانشینوں اور، ان "روحانی رہنماؤں" کے دستر خوان آج فائیو سٹار ہوٹل کے ڈائننگ ہال کا نقشہ پیش کر رہے ہیں ان کے فریج اور فریزر منرل واٹر، سافٹ ڈرنگ اور دیگر "ڈرنکس" سے معمور ہو گئے ہیں، ان کے کپڑوں کی چمک آنکھوں کو خیرہ اور ان کا ملبوساتی ذوق بڑے بڑے فلمی ہیروز کو شرمندہ کر رہا ہے ان کے بنگلے تاج محل کو ماند کرتے نظر آتے ہیں اور ان کی پیجارو اور لینڈ کروزر زرخراٹے بھرتی نظر آتی ہیں یہ کایا کلپ کیوں کر ہو گئی ہے؟ یہ انقلاب زمانہ کیسے برپا ہو گیا۔ اور یہ تغیر احوال کیسے آ گیا؟ کیا یہ صوفیاء کرام کے جانشینوں کا روحانی کمال ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو اصل صوفیاء جو بذات خود روحانیت، للہیت اور فیض کا سر چشمہ تھے یہ نعمتیں اور سہولتیں ان کو کیوں میسر نہ آئیں؟ ہزاروں لوگوں کی زندگیاں بدل دینے والے اپنا طرز زندگی بدلنے پر قادر کیوں نہ ہو سکے؟ آج

جن کے نام کا صدقہ یہ لوگ کھا رہے ہیں وہ خود فاقہ کشی کا شکار کیوں رہے؟ یہ بڑا اہم سوال اور بہت معنی خیز استفسار ہے کسی تاریخی کھوج کرید اور فلسفیانہ تشریح میں پڑے بغیر جو بات بدیہی طور پر سامنے آتی ہیں وہ یہ ہے کہ اصل صوفیاء کرام اور ان کے جانشینوں کے کردار میں واقع ہو جانے والے فرق نے یہ صورت حال پیدا کی ہے ورنہ کردار ایک جیسا ہوتا اسلوبِ روز گار بھی ایک جیسا ہونا چاہیے۔ آج نامی گرامی سجادہ نشینوں میں سے کوئی ایسا نہیں جو سینکڑوں ایکڑ اراضی کا مالک اور زرعی و سکنی جائیداد کا حامل نہ ہو اگر تو یہ سب کچھ مریدوں کا دیا ہے تو اس دور کے مریدوں نے تو از راہ عقیدت یہ مال ومتاع لنگر اور خدمت خلق اور اشاعت اسلام کے لئے دیا ہوگا اپنے شیخ اور بزرگ کو ''جاگیردار'' ''اہل اوز'' اور کارخانہ دار بننے کے لئے تو نہیں دیا ہوگا ورنہ وہ لوگ بجائے کٹیا نشین کے کسی جاگیر دار اور فیکٹری مالک کو اپنا پیر و مرشد بنا لیتے یہ تو عقلِ عام کی بات ہے۔ تصوف کی مستند تاریخ بتاتی ہے کہ صوفیا کرام نے اپنے لئے فقر کو اختیار کیا تا کہ اسلام تو نگر ہو جائے خود قناعت کو پسند کیا تا کہ اسلام کی حرمت محفوظ رہے خود کچے گھر میں رہے تا کہ اسلام کا قلعہ مضبوط رہے خود پیوند لگا لباس پہنا تا کہ اسلام کا دامن گرہ سے پاک رہے اور خود ویرانوں میں جا بسے تا کہ اسلام کی رونقیں بحال رہیں، مگر یہ جاگیریں اور وراثتیں درمیان میں کہاں سے آ گئیں؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ بعد میں آنے والوں نے صوفیاء کرام یعنی اپنے اسلاف کے عظیم الشان کام کے دام چکائے، ان کا نام نیلام کیا ان کے خرقہ، فقر کو حصول زر کا ذریعہ بنایا ان کی آبروئے قناعت کی قیمت وصول کی اور ان کی خدمت اسلام کا پورا پورا انعام پایا، نام لینے کی ضرورت نہیں سبھی عوام جانتے ہیں کہ موجودہ پیر صاحبان اور سجادگان کے اسلاف گرامی نے کبھی اپنے قدموں سے چل کر شاہوں سے ملاقات نہیں کی کوئی پا کو بجولاں لے گیا تو الگ بات ہے یا گئے تو کلمہ حق اس شان سے بلند کیا

کہ پورا دربار سناٹے میں آ گیا مگر بعد میں ان کے جانشین قومی و صوبائی اسمبلی کی ممبری کے ٹکٹ کے لئے کبھی ایوب خان کے در پر دست بستہ نظر آئے کبھی بھٹو کے سامنے دامن پھیلائے دکھائی دیئے۔ کبھی ضیاء الحق کی منقبت میں مصروف پائے گئے، کبھی بلاول ہاؤس کے دروازے پر چلہ کشی کرتے دیکھے گئے اور کبھی ماڈل ٹاؤن کا طواف کرتے ہوئے پکڑے گئے یہ سبھی لوگ نام تو اپنے بزرگوں کا استعمال کرتے اور عوام کا استحصال کرتے ہیں، مگر تاریخ کی صداقتیں اور کروٹیں اور لیل و نہار کی گردشیں گواہ ہیں کہ ان کے بزرگ کسی کلاہ شاہی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے کسی شاہی دسترخوان کے مرغ و ماہی پر دھیان نہیں دیتے تھے۔ کسی منصبدار اور چوبدار سے دوستانہ نہیں رکھتے تھے، کبھی خدا کے علاوہ کسی کے گھر کا طواف نہیں کرتے تھے اور کبھی خانقاہ کا جاہ و قار کسی کجکلاہ پر نثار نہیں کرتے تھے ان کا بسیرا کبھی قصرِ سلطانی کے گنبد پر نہیں رہا وہ مردہ شکار کو اپنے لئے حرام سمجھتے تھے اور کسی کی اترن پہننا اور کسی کی کھرچن کھانا ان کے نزدیک شرک جیسا جرمِ عظیم تھا آج پیر اور جاگیر ہم معنی لفظ بن گئے ہیں اس کا کھوج لگایا جائے تو بہت دور تک نہیں جانا پڑے گا بس زیادہ سے زیادہ پچھلا ڈیڑھ سو سال دیکھ لیا جائے ساری حقیقت سامنے آ جائے گی ایک سو سال انگریز اور پچاس سال اپنے، کچھ صدقہ نکلے گا فرنگی سلطان کا اور کچھ کرشمہ پاکستان میں رائج سیاست اور پھر ملنے والی ممبری اور وزارت کا۔

۲۶ اگست ۲۰۰۰ء

اے کشتۂ ستم، تیری غیرت کو کیا ہوا

دل کو شاعروں نے ''نادان'' قرار دیا اور عقل کو ''عیار'' کہا ہے اور سبب غالباً یہ ہے کہ دل جب کسی پر آنے پہ آجائے تو نہ آر دیکھتا ہے نہ پار بس اپنا آپ وار دیتا ہے نہ کوئی دلیل اور نہ کوئی وکیل، اپنی پہ آجائے تو کچے گھڑے کے سہارے چناب عبور کرنے پر تل جاتا، اور سوت کی کچی انٹی لے کر بازارِ مصر میں یوسف کو خریدنے نکل کھڑا ہو جاتا ہے اور عقل اس لئے عیار کہلائی ہے کہ اس کی زنبیل میں ہر فیصلے کے لئے ہر قسم کی ہر وقت ایک نہ ایک دلیل موجود رہتی ہے۔ خمار میں چاہنے کے لئے بھی اور غبار میں دیکھنے کے لئے بھی، اپنے زورِ استدلال پر چاہے تو منصور کو دار چڑھا دے، مجدد الف ثانیؒ کو قلعہ گوالیار بھجوا دے اور سرمد کی کھال کھنچوا دے اور جی میں آئے تو یزید کو ''امیر المومنین'' بنا دے۔ بچہ سقہ سے چام کے سکے چلوا دے اور رانجھے کو ہیرو بنا دے۔ دل کی نادانیوں اور عقل کی سوختہ سامانیوں کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ لیکن میرے دل نے پہلی بار نادان بننے سے اعتراز اور عقل نے عیار ہونے سے انکار کیا ہے۔ دل نے کہا پہلے خانہ ویرانی کم ہے کہ مزید نادانی کا مظاہرہ کروں اور عقل نے کہا کہ پہلے آزار تھوڑا ہے کہ اب عیار بن کر اس میں اضافہ کروں؟ میں نے دل ناداں کو بہت بہلایا اور عقل عیار کو بہت بہکایا ہے کہ وہ اس خوش فہمی میں میرا ساتھ دیں کہ موجودہ نظام بڑے کام کا ہے اور رائج الوقت سیاسی قیادت بڑی نعمت ہے میں

نے جذبہ و منطق کے سارے گر اختیار کرتے ہوئے دل و دماغ سے کہا کہ اس نظام میں حکومت لوگوں کے ووٹوں سے بنتی اور بگڑتی ہے اس میں ایک ادارہ سینٹ ہوتا ہے جس میں وفاقی اکائیوں کی برابر نمائندگی ہے قومی اسمبلی موجود ہے جو عوام کی اجتماعی رائے کا عکس اور مظہر ہے۔ کابینہ ہوتی ہے، جس کے فیصلے اجتماعی طور پر ہوتے ہیں وزیر اعظم ہوتا ہے جو لوگوں کے ووٹوں سے منتخب ہوتا ہے بیوروکریسی ہے جو بہت منظم اور ضابطہ پسند ہے صوبائی حکومتیں ہوتی ہیں جو اپنے اپنے صوبوں کی نمائندگی کرتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک آئین ہے جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہے اس سے بہتر نظام کیا ہو سکتا ہے؟ اس طرح ہماری سیاسی قیادت ہے آدھی آکسفورڈ کی پڑھی ہوئی اور آدھی ایچی سن ڈیرہ دون اور گورنمنٹ کالج کی فارغ التحصیل ہے، فر فر انگریزی بولتی اور کڑ کڑ کپڑے پہنتی ہے۔ آنکھیں شرر بار، چال برق رفتار اور چہرے گلنار ہیں ان میں کئی "قائد ملت"، کئی "مرد آہن"، کئی "قائد جمہوریت"، کئی "مرد حق"، کئی "قائد عوام"، کئی "دختر مشرق" اور کئی "قائد اعظم ثانی" ہیں ان سے بڑھ کر قائدین اور کس قوم کو میسر آئے ہیں؟ یہ دعوے کرنے پہ آئیں تو آسمان سے تارے توڑ لاتے ہیں اور وعدہ کرنے پہ آئیں تو دہلیز پر دودھ کی نہریں بہا دیتے ہیں۔

اے دل ناداں! تو اس سے زیادہ کس چیز کا خواہاں ہے اور اے عقل عیار! تجھے اس سے بڑھ کر آخر کیا درکار ہے! ہماری قیادت کا رنگ بھی اچھا ہے، بات کرنے کا ڈھنگ بھی اچھا ہے اور رونمائی کا آہنگ بھی اچھا ہے، اس سے بہتر قیادت کا آخر کیا تصور ہو سکتا ہے؟ میری اس قدر چرب زبانی اور خوش بیانی کے باوجود دل ناداں اور عقل عیار دونوں متفق ہو کر بولے کہ یہ نظام واقعی بڑے کام کا ہے لیکن دراصل بڑوں کے کام کا ہے لیکن "بڑوں کے کام کا" ہے اور جعلی سیاسی قیادت بڑی نعمت ہے مگر اس کی بنیاد بصیرت نہیں "وافر دولت" اور مکروہ نظام کی "نگاہ عنایت" ہے اگر سینٹ وفاق

کا مظہر ہے تو ہر بات پر اتفاق کمیاب کیوں ہے؟ اگر قومی اسمبلی عوام کی رائے سے بنتی ہے تو حکمرانوں کی مرضی سے کیوں چلتی ہے اگر وزیر اعظم "ہیوی مینڈیٹ" لیتا ہے تو برسر کاری اہلکار قوم کے لئے بہت بڑا "بینڈیٹ" (Bandit) کیوں بن جاتا ہے اگر کابینہ اجتماعی فیصلے کرتی ہے تو وہ اس قدر ڈھیلے اور پھسپھسے کیوں ہوتے ہیں؟ اگر بیورو کریسی بہت منظّم اور ضابطہ پسند ہے تو وہ احتساب سے ماوراء اور بلند کیوں ہے؟ اگر صوبائی حکمران صوبوں کے نمائندہ ہوتے ہیں تو ہر صوبہ اور ہر شہر مسائل کا پلندہ کیوں بنا ہوا ہے۔؟ اور آئین فی الواقع متفقہ دستاویز ہے تو ہر حکمران اس کی توہین پر کیوں آمادہ رہتا ہے؟ رہ گئی بات سیاسی قیادت کی یہ بلاشبہ انگریزی اور جھوٹ دونوں فرفر بولتی ہے۔ اس کے کلف لگے کپڑے تو اکڑے ہوتے ہیں لیکن ان کے ضمیر امریکہ کے سامنے ہمیشہ جھکے رہتے ہیں ان کی آنکھیں اپنوں کے لئے شرربار مگر غیروں کے آگے شرمسار رہتی ہیں ان کی چال برق رفتار سہی لیکن اپنے فائدے کے لئے ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتے اور قومی مفاد کے لئے یہ لوگ کچھوے بن جاتے ہیں ان کا چہرہ ضرور گلنار رہتا ہے مگر باطن تیرہ و تار یہ قائد ملت تو کہلائے مگر کردار کی قلت کا شکار ہے۔ مرد آہن بھی بنے مگر آلودہ دامن ہوئے، جمہوریت کی قیادت بھی کی اور ساتھ ہی آمریت کی پرورش بھی، مرد حق بھی ہوئے اور قوم کو کئی "فضلِ حق" بھی دے گئے۔ بہت سے قائد عوام بھی اٹھے مگر لوگوں کو اپنا اور اپنے خاندان کا غلام ہی سمجھا، بہت سے قائدِ تحریک بھی بنے مگر ان کے صدقے کراچی جیسا روشن نگر تاریک بھی ہوا، ہماری سیاسی قیادت میں دختر مشرق بھی ہیں مگر ان کا فکری قبلہ "مغرب" ہی رہا ہے اور ماشاء اللہ قائد اعظم ثانی بھی ہیں لیکن اکیسویں صدی میں مغلیہ طرز حکومت کے داعی اور بانی بھی، دل بولا، میں بہت نادان سہی مگر اب مجھ پر بہت کچھ عیاں ہو چکا ہے اور عقل نے کہا میں بہت عیار سہی لیکن اب اس نظام اور قیادت کے سارے راز مجھ پر آشکار ہو

چکے ہیں اب بیلنے اور بھکنے کا کوئی جواز نہیں، واقعہ بھی یہی ہے کہ دل نے بیسیوں بار ذوقِ گل بوسی میں کانٹوں پر زبان رکھی اور عقل نے سراب سے سیراب ہونے کے دلائل فراہم کیے مگر بجز خونِ جگر اور فریب نظر کے کچھ ہاتھ نہ آیا میرے دل و دماغ نے بیک آواز ہو کر کہا اگر تو پانی میں مدھانی مارنے سے مکھن نکل سکتا ہے تو اس نظام اور قیادت سے بھی توقع رکھی جائے۔ اگر بغیر بادل کے بارش ہو سکتی ہے تو آس باندھی جائے۔ اگر آم کے درخت پہ انگور اگ سکتے ہیں تو یہ خواب دیکھا جائے اگر کاغذی پھول خوشبو دے سکتے ہیں تو ضرور امید قائم کی جائے اگر بلی دودھ کی رکھوالی کر سکتی ہے تو یہ آرزو بھی پائی جائے اگر پانی پہ کوئی نقش جمایا جا سکتا ہے تو یہ تمنا سینے میں ضرور اُبھاری جائے اور اگر یہ سب کچھ خواب و خیال ہے تو اس نظام سے کسی خیر اور اس قیادت سے کسی فیض کا ظہور بھی امر محال ہے۔ میر بہت ہی سادہ تھا وہ اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتا رہا جس کے سبب وہ بیمار ہوا مگر ہم میر سے بہت بڑھ کر سادہ ہیں کہ جن کے ہاتھوں مرتے ہیں انہی کو اپنے جنازے کا امام بھی کرتے ہیں۔

اے کشتۂ ستم، تیری غیرت کو کیا ہوا؟

ضروری ہے کہ چہروں کے ساتھ نظام اور اس کے بنیادی ڈھانچے میں جوہری تبدیلیاں لائیں جائیں ورنہ عمر گزر جائے گی سفر کبھی طے نہیں ہوگا۔ آخر نصف صدی معمولی مدت تو نہیں۔

”قلمی طوطے“

تیسری دنیا کے حکمرانوں کو جو چیز سب سے زیادہ لے ڈوبتی ہے وہ ہے ان کی خوشامد پسندی کی حد سے بڑھی ہوئی عادت، یہ علت انہیں خدا کے قرب اور بندوں کے اعتماد دونوں سے بیگانہ کر دیتی ہے وہ خدا بنتے بنتے انسانی شرف سے بھی محروم ہو جاتے ہیں یہ لپکا اس کا صاف پتہ دیتا ہے کہ ان کا دفترِ عمل خالی اور دامن کردار تہی ہے ورنہ وہ ان لفظوں کا دھوکا نہ کھاتے جن کی جگالی ہر دور میں کی جاتی رہی ہیں اور کسی کی بھوک نہیں مٹی، خوشامدیوں کے طائفے کے طائفے ہر دور میں موجود رہے ہیں جو حکمرانوں کی نادانی سے فائدہ اٹھا کر اپنے دانے پانی کا بندوبست کرتے ہیں۔

ہمارے حکمرانوں کو قرونِ وسطیٰ کے شہزادوں کی طرح دربار سجانے، قصیدے پڑھوانے اور اشرفیاں لٹانے کا بڑا شوق رہا ہے۔ یہ ڈھول پٹوانے والے جب خود پٹتے ہیں تو پھر بچوں کی طرح روتے پیٹتے ہیں اور خوشامدی اگلے دربار میں ان کے جنازے گھسیٹتے نظر آتے ہیں مجال ہے جو کسی جانشین کو اپنے پیش رو سے عبرت حاصل ہوئی ہو۔

غلام محمد بیچارے ہکلاتے تھے مگر درباری ان کی ”خوش بیانی“ کی قسمیں کھاتے تھے، سکندر مرزا کا شجرہ نسب ”سکندر اعظم“ سے ملانے والے درجنوں میں تھے ایوب خان کو قد ماپنے والی مشین کے سامنے کھڑا کر کے ”ڈیگال“ (صدر فرانس) سے اونچا ثابت کرنے والے اس دور میں وافر مقدار میں تھے، یحییٰ خان جیسے بھدے

اور بے ڈول شخص کو جامہ زیب اور سمارٹ کہنے والوں کی ایک لمبی قطار نظر آتی تھی، بھٹو کو جنہوں نے "فخر ایشیا" لکھا اور "قائد عوام" کہا انہوں نے بعد میں خود ہی "بھٹو پھٹو" جیسے پمفلٹ چھاپے، ضیاء الحق کی "امیر المومنین" تو کل کی بات ہے کوئی انہیں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ سے ملا رہا تھا اور کوئی انہیں نور الدین زنگیؒ کا جانشین اور ہم پایہ ثابت کر رہا تھا جونیجو جیسے گئو ماتا وزیراعظم کو "قائد جمہوریت" کہنے والے بھی بیسیوں نکل آئے تھے رہ گئے میاں نواز شریف تو ان کے قصیدے ابھی ردی کی خانوں میں نہیں پہنچے ایڈیٹر کی ٹیبل پر ہوں گے کیوں کہ یہ تو آنکھوں کے سامنے کی بات ہے، کل دن ہی کتنے گزرے ہیں کہ لائبریریاں کھنگالنی پڑیں؟

انہیں قائداعظم سے زیادہ مینڈیٹ لینے کی لوری سنانے والے آج بھی دائیں بائیں گھوم رہے ہیں انہیں قائداعظم ثانی کہنے والے بھی ابھی تک موجود ہیں۔ شیر شاہ سوری کا لقب دینے والوں کے قلم کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہوئی ان کی کارگل سے شرمناک واپسی اور معاہدہ واشنگٹن کو "صلح حدیبیہ" سے تعبیر کرنے والے ابھی تک زندہ سلامت ہیں حالانکہ ڈوب مرنے کو ابھی راوی چناب اور جہلم کا پانی خشک نہیں ہوا۔ ایسے لوگوں کے لئے تو ایک چلو پانی بھی کافی ہوتا ہے۔ غلام محمد نشانِ عبرت بن گئے، سکندر مرزا دیارِ غیر میں دفن ہو گئے، ایوب خان گوشہ تنہائی کی نذر ہو گئے۔ یحییٰ خان طاقچہ فراموشی میں سج گئے، بھٹو تیسری دنیا کے لیڈر بنتے بنتے دوسری دنیا کو سدھار گئے۔ ضیاء الحق دل کی حسرتیں دل میں لے کر گزر گئے۔ جونیجو گہری قبر میں اتر گئے۔ مگر حوصلہ اور "دھن جگرا" ہے حکمرانوں کا کہ ٹھیک انہی درباروں کو الٹا زیادہ تنخواہ پر رکھ لیا، جنہوں نے اس سے پہلے کے اربابِ اقتدار کو تختہ دار پر پہنچایا تھا۔

جن لوگوں کو خدا حکومت کے ساتھ حکمت بھی دیتا ہے وہ قصیدہ گوئی پر کسی کی حق گوئی کو ترجیح دیتے ہیں۔ انہیں اپنی غلطی کے اعتراف میں کوئی حجاب نہیں ہوتا، وہ

مشورے کو اپنی توہین نہیں سمجھتے اور نصیحت کو اپنے حق میں فضیحت قرار نہیں دیتے۔
حضرت عمرؓ کو اپنے دور میں ذرائع ابلاغ اور وزارت اطلاعات کی سہولت حاصل نہیں تھی وہ دور ریڈیو اور ٹی وی سے محروم تھا ان کی تقریر لاؤڈ سپیکر کے بغیر ہوتی تھی ان کا لفظ لفظ ریکارڈ کرنے اور حرف حرف چھاپنے کے لئے کوئی گراموفون اور پریس مشین نہیں تھی لیکن ان کی باتیں آج تک ہر ایک کو ازبر ہیں ان کے فیصلے تاریخ میں معتبر ہیں اور ان کے اقدامات انسانی سوسائٹی کے لئے رہبر کا درجہ پائے ہوئے ہیں وہ دربار داری کے روز پر امر نہیں ہوئے بلند کرداری نے انہیں آج تک زندہ رکھا ہے ایک دوست ان کے سامنے کہنے لگے۔ یا امیر آپ کے انصاف نے مخلوق خدا کو خوش کر دیا ہے آپ کی سادگی نے لوگوں کو سکون بخشا ہے آپ جانشین صدیقؓ ہیں آپ کو رفاقت پیغمبر حاصل رہی آپ خدا کے احکام بے لاگ طریقے سے نافذ کرنے والے ہیں آپ کی میزانِ عدل نے حق اور باطل اور جھوٹ اور سچ کو دودھ اور پانی کی طرح چھانٹ کر الگ کر دیا ہے آپ کا عہد حکومت مخلوقِ خدا کے لئے سایہ طوبیٰ ثابت ہوا ہے، وغیرہ، آپ نے یہ سب کچھ سن کر فرمایا میرے بھائی میں اس کے باوجود صرف اس بات کا خواہاں ہوں کہ "میرا خدا قیامت کے دن مجھے برابر برابر چھوڑ دے یہی میرے لئے غنیمت ہی نہیں بہت بڑی نعمت ہے۔" حالانکہ ادب کی تمام باتیں سخن گسترانہ نہیں راست گفتارانہ تھیں وہ خودساختہ نہیں سچ سے آراستہ تھیں اور حصول منفعت کے لئے نہیں اظہار حقیقت تھیں مگر ایک ذمہ دار آدمی "دربار دار" نہیں ہوتا اور قصائد سے دل نہیں بہلاتا حکمرانوں کی کمزوری اپنی جگہ لیکن حیرت تو ان "قلمی طوطوں" پر ہوتی ہے جن کی چونچ پر ابھی پچھلی "چوری" کے ریزے لگے ہوتے ہیں کہ آنے والے لوگوں کی مدح خوانی شروع کر دیتے ہیں۔
آج کے حکمرانوں کو چاہیے کہ وہ اخباروں کے رنگین ایڈیشنوں اور ٹی وی کے

حسین تبصروں کے بھرے میں نہ آئیں کہ یہ بھی پیسے کھرے کرنے کی ایک چال ہوتی ہے۔ فیملی فوٹوسیشن سے بھی بچ کر رہیں کہ یہ بعد میں دل کی الجھن اور پاؤں کا بندھن بن جاتے ہیں۔ استقبالیہ خطبوں اور مجلسی سپاسناموں پر بھی توجہ نہ دیں کہ یہ ''خطبات تبریک'' پہلے ہی ملک کا مستقبل تاریک اور ''حروف سپاس'' اچھے خاصوں کا ستیاناس کر چکے ہیں قلمی طوطے اس تاک میں رہتے ہیں کہ وہ ہر حاکم کے مزاج، عادات، مذاق اور رجحان سے واقف ہو کر اس کے مطابق بولی بولیں کوئی دینی مزاج کا حکمران ہے تو اس کے حج عمرے اور تبلیغی چلّے نوکِ قلم بنتے ہیں اگر وہ مشرقی مزاج ہے تو پھر علی گڑھ کی شیروانی کے فضائل سے کالم سجائے جاتے ہیں اور حاکم ذوق مطالعہ رکھتا ہے تو پھر شعروادب کی محفلیں آراستہ ہونا شروع ہو جاتی ہے، یہ مشغلے نصف نصدی سے جاری ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ کوائف ''بعد کو بڑے لطائف'' جنم دیتے ہیں ہماری باتوں کا اعتبار نہ آئے تو قصائد کے گذشتہ انبار، ماضی کے اخبار، سابقہ ادوار اور کالموں کے طومار ایک نظر دیکھ لئے جائیں سب کچھ آشکار ہو جائے گا۔

حکومتی کلچر کی تبدیلی

جنرل پرویز مشرف کی حکومت کا واحد جواز یہ ہے کہ اُس نے...... احتساب اور اصلاح ...... کو اپنا مرکزی ایجنڈا بنایا ہے اور یہی دراصل عوام کا ایجنڈا ہے۔ احتساب ہر شخص کا اور اصلاح ہر شعبے میں۔

اصلاحات کا دائرہ بہت وسیع ہے پچاس سال کے سیاسی و معاشی اور سماجی و ادارتی بگاڑ کی اصلاح یقیناً وقت طلب اور مشقت طلب کام ہے عدالتی نظام میں کیا کیا کمزوریاں ہیں؟ انتظامیہ کن خرابیوں کا شکار رہیں؟ مقننہ میں کہاں کہاں نقائص ہیں؟ آئین میں کس قدر جھول ہیں؟ صوبوں کے معاملات میں کتنا بگاڑ ہے؟ مال، پولیس، انہار، زراعت، تعلیم، خوراک، تعمیرات، مواصلات وغیرہ محکموں میں کس نوع کی اصلاحات درکار ہیں؟ یہ موضوع بہت وسیع اور اس کا لائحہ خاصے غور و فکر کا تقاضا کرتا ہے یہ کام ایک آدھ ماہ یا دو چار سال میں ہونے والا نہیں ان تمام کاموں کے لئے کمیشن قائم کرنے پڑیں گے کمیٹیاں تشکیل دینی پڑیں گی بورڈ بٹھانے پڑیں گے، ماہرین بلانے پڑیں گے وغیرہ وغیرہ اور اگر حکومت بھی مخلص ہو، تمام کمیشن اور کمیٹیاں بھی بروقت تجاویز دے دیں اور اصلاحات کرنے والی ٹیم بھی مستعد اور جاندار ہو تب بھی یہ ایجنڈا دو چار برس لے جائے گا۔

اس اقدام کی مشکلات سے بھی ہم آگاہ ہیں اور رکاوٹوں کو بھی سمجھتے ہیں بگاڑ

جس تیزی سے ہوتا ہے اصلاح اتنی تیزی سے ہوتی ہے مگر ایک کام ایسا ہے جس کے لئے سر جوڑ کر بیٹھنے۔ باہر سے ٹیمیں منگوانے، فائلوں کے پلندے تیار کرنے اور لمبے چوڑے پیپر ورک کی ضرورت نہیں صرف نیک نیتی اور ایک حکمِ انتظامی درکار ہے۔

جنرل صاحب اگر خود اور ان کے رفقاء آمادہ اور قربانی دینے کے لئے تیار ہوں تو وہ تمام سرکاری دفاتر اور افسروں کے لئے ...... سادگی ...... کو قانوناً لازمی قرار دے دیں چار دائروں پر اس کا اطلاق ہونا چاہیے۔

☆ دفاتر کے لئے لمبی چوڑی عمارات، تزئین اور آرائش اور بے جا سہولیات و مراعات کا خاتمہ۔

☆ افسروں کے لئے قیمتی گاڑیوں، زرق برق لباس اور پروٹوکول کی بندش۔

☆ سرکاری ضیافتوں اور دعوتوں پر مکمل پابندی

☆ اب تک جو فرنیچر، لیٹر پیڈ، ٹیلی فون، قالین، پردے اور دیگر سامان آرائش ''جہاں ہے جیسے ہے'' کی بنیاد پر اُسے یہیں پر فریز (Freeze) کر دیا جائے، مزید کچھ خریدنے اور لینے کا جواز ختم۔

پرتکلف اور بارعب لائف سٹائل کے دو مقاصد ہوتے ہیں ایک عیش و راحت اور دوسرے ماتحتوں عوام اور بیرونی دنیا پر رعب اور دبدبہ

پہلے مقصد کی خرابی یہ ہے کہ جو قوم اور بالخصوص حکومت عیش کوش ہو وہ کام چور ہوتی ہے اور مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور دوسرے مقصد کا جواز اس لئے نہیں کہ رعب گاڑی اور کپڑوں سے نہیں پڑتا۔ منصب اور کارکردگی سے پیدا ہوتا ہے۔ ڈی سی اور کمشنر کھدر بھی پہنیں تو وہ ڈی سی اور کمشنر ہی رہیں گے۔ اطلس و کمخواب پہن کر ان کا گریڈ سکیل اور مرتبہ اونچا نہیں ہو جاتا نیز بیرونی دنیا ملک کی معاشی حالت، سائنسی اہلیت، ایٹمی قوت، جنگی صلاحیت اور سیاسی طاقت سے مرعوب ہوتی ہے قرضوں کی

معیشت، مصنوعی معیارِ زیست اور محل نما دفتروں سے متاثر نہیں ہوتی یہ احساس کمتری اور ذہنی مرعوبیت کی دلیل ہے۔

اگر چہ یہ باتیں ہم لوگ کہتے اور لکھتے ہیں لیکن ہمیں یہ بھی علم ہوتا ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا کیوں کہ عادات ونفسیات میں ایک بار اگر بگاڑ آ جائے تو نئے جنم تک اس کا سدھار ممکن نہیں ہوتا۔ ہماری حکومتوں، حکمرانوں اور قوم کے بالا دست طبقوں میں ایک بنیادی خرابی یہ بھی ہے کہ ان میں حسد، رشک اور مسابقت کا جذبہ بہت زیادہ ہوتا ہے، لیکن اچھے کاموں میں نہیں نمائشی میدانوں میں، مثلاً ہمارے حکمران سکندرو دارا، اکبر اعظم، غیاث الدین بلبن، رضا شاہ وغیرہ، کی نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں مگر منفی کاموں میں ان کے رعب وداب کی نقل کریں گے ان کے شاہی محلات کی نقل کریں گے ان کے جاہ وحشم کی نقل کریں گے ان کے آمرانہ اسلوب کی نقل کریں گے لیکن کبھی بھولے سے بھی حضرت عمرؓ حضرت علیؓ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سلطان ٹیپوؒ، نورالدین زنگیؒ اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسے لوگوں کی تقلید کی بات نہیں کریں گے۔

اس طرح انڈیا کی فلموں، ٹی وی، ڈراموں اور شادی بیاہ کی تقریبات وغیرہ کی نقالی تو ہم جلدی کرتے اور بڑی رغبت سے کرتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ آج بھی بھارت کے دفاتر میں ۱۹۴۷ء والا فرنیچر پڑا ہے۔ ٹوٹا پھوٹا، میلا کچیلا، اور آؤٹ آف فیشن، انڈیا کے بعد آج بھی فرش پر چادریں بچھا کر اجلاس کرتے ہیں ملک میں تیارہ کردہ گاڑیوں میں بیٹھتے ہیں اور ایک ایک گاڑی کئی کئی سال تک استعمال کرتے ہیں۔ انڈیا نے آزاد ہوتے ہی جاگیرداری کا خاتمہ کر دیا ہے ان کے ہاں بھی نگران حکومتیں بنیں ممکن اختیارات صفر کے برابر، نگران وزیراعظم ایک کلرک تک بھرتی نہیں کر سکتا ہے نہ سبکدوش، تاکہ دھاندلی اور طرف داری کا امکان نہ رہے ان باتوں میں ہم کبھی تقلید نہیں کرتے، ہاں کسی ملک کا گورنمنٹ ہاؤس پسند آجائے کسی بادشاہ کا طیارہ جی کو

بھا جائے، کہیں انوکھی اور چمکیلی گاڑی نظر پڑ جائے کسی شہزادے کا ڈرائنگ روم دل کو لگ جائے، کہیں استقبال کا انداز پرشکوہ لگے تو ہمارے حکمران اس کی نقل کرنے اور وہی کچھ حاصل کرنے میں دیر نہیں لگاتے خواں کروڑوں کا زرمبادلہ خرچ کرنا پڑے میں پورے یقین اور اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ایوان صدر اور وزیراعظم ہاؤس میں جو سامان وآرائش وزیبائش ہے اور جس قہر کا فرنیچر ہے اور جو طلسماتی ماحول پیدا کرنیوالے فانوس نصب ہیں ایسی اشیاء نہ وائٹ ہاؤس میں ہوں گی اور نہ ڈاؤننگ سٹریٹ میں، نہ پیرس کے صدارتی محل میں اور نہ ماسکو کے پریزیڈنٹ ہاؤس میں، یہ لپکا صرف ہمیں اور ہمارے جیسے دوسرے ممالک اور حکمرانوں کو ہے۔

سرکاری امور کے لئے جہاز درکار ہو، بہت بڑا اسیکرٹریٹ مطلوب ہو اور زیادہ عملہ ضروری ہو اس پر مجھے اور کسی دوسرے کو کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ سب کچھ کارکردگی کے مطابق ہو آخر صدر، وزیراعظم، گورنروں، وزراء، وزرائے اعلیٰ، چیف سیکرٹریوں اور دوسرے افسروں کے لئے بے تحاشا بنگلوں اور قیمتی گاڑیوں کی کیا ضرورت ہے۔؟ سیکورٹی اپنی جگہ، اس کا ضرور اہتمام کیا جائے اس کا تکلف اور تعیش سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے، دن میں تین بار پوشاک بدلنے سے کارکردگی قطعاً نہیں بڑھتی ایک ایک ضیافت میں بیسیوں کھانے سجانے سے ملک مضبوط اور خوش حال نہیں ہوتا اور چمکدار فرنیچر دفتری کام میں کوئی بہتری نہیں آتی یہ عیش پروری ہے اور ذات نوازی ہے۔

سادگی کلچر کے لئے آرڈی نینس اس وقت جاری ہوگا اور وہ حکمران جاری کرے گا جو سب سے پہلے یہ کڑوا گھونٹ بھرے گا، یہ بظاہر کڑوا گھونٹ درحقیقت آب حیات ہے اس ملک کی معاشی خوشحالی، انتظامی خوش اسلوبی اور عمدہ کارکردگی کے لئے، کلچر نہ نئے قوانین سے بدلتا ہے اور نہ نیا کلچر صرف کاغذی فرامین سے وجود میں آتا ہے، کلچر صرف بدلنے سے بدلتا ہے اور اپنانے سے فروغ پاتا ہے۔ خواہ زمانہ قبل مسیح کا ہو یا اکیسویں صدی کے آغاز کا۔

SHAM DEMOCARCY

مندرجہ بالا عنوان اس لئے قائم کرنا پڑا کہ کچھ عرصہ پہلے چیف ایگزیکٹو نے ٹھیک یہی الفاظ استعمال کئے تھے جس پر ارباب سیاست نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا اور کہا کہ جنرل صاحب نے SHAM DEMOCARCY کہہ کر جمہوریت کو بدنام کیا ہے حالانکہ SHAM یا SHAME یعنی جعلسازی ہو یا شرمندگی دونوں ہی مذموم الفاظ ہیں جمہوریت جعلی ہو یا شرمناک، دونوں الفاظ ایک ہی مفہوم کے حامل ہیں۔ بہر حال جنرل پرویز مشرف نے ملک میں رائج جمہوریت کو "جعلی" کہا تھا اور اس میں کسی ذی ہوش اور باضمیر شخص کو کوئی شک نہیں کہ یہاں فنی طور پر تو شائد جمہوریت کا عمل جاری رہا ہو مگر حقیقی حوالے سے جعلسازی ہوتی رہی، جمہوریت ایک طرز سیاست اور اسلوبِ حکومت ہے جب کہ ہمارے ہاں نہ طرزِ سیاست جمہوری رہا ہے اور نہ اسلوبِ حکومت جمہوری۔

جمہوری سیاست کا مطلب ہے، رائے عامہ کی بیداری، رائے کا آزادانہ استعمال، پارٹی منشور کا احترام، سیاسی راہنماؤں کی نظری و عملی تربیت، منتخب نمائندوں کا سیاسی عمل سے گزر کر ایوان تک پہنچنا وغیرہ اور جمہوری حکومت کا مطلب ہے آئین کے مطابق نظام ملک کا چلانا، اداروں کے ذریعے فیصلوں کا نفاذ، قانون کی بالادستی، پارلیمنٹ میں آزادانہ بحث و مباحثہ، مشاورت کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنا، ہر سطح کے

حکمران کا آئینی وقانونی اداروں کے سامنے جوابدہ ہونا اور صوابدیدی اختیارات کے بجائے آئین میں درج اختیارات کا آئین کی روح کے مطابق استعمال وغیرہ، لیکن ہماری نصف صدی کی تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ یہاں پارٹیاں بھی بنیں، منشور بھی مرتب ہوئے پروگرام بھی دیئے گئے،، لیڈر بھی ابھرے، انتخابات بھی ہوئے، حکومتیں بھی بنیں، بالا اور زیریں ایوان بھی تشکیل پذیر ہوئے مگر نہ پارٹیوں میں جمہوری کلچر فروغ پاسکا، نہ منشور کو کبھی لائق اعتناء سمجھ گیا نہ کسی پروگرام پر عمل ہوا، نہ لیڈر فطری انداز میں منصبِ قیادت پر فائز ہوئے نہ انتخابات اکثریتی رائے کا مظہر بنے نہ حکومتیں جمہوری اصولوں کے احترام سے آشنا ہوئیں اور نہ ایوان ہائے بالا زیریں اپنا آئینی کردار صحیح طور پر ادا کر پائے، اگر یہ مشاہدہ درست ہے اور یقیناً درست ہے تو پھر ایسے سسٹم اور ایسی جمہوریت کو ''جعلی جمہوریت'' کہنے میں کیا عذر اور رکاوٹ باقی ہے ؟ پوری تاریخ کا جائزہ لیا تو ان چند سطور کے ذریعے قطعاً ممکن نہیں تاہم سیاست و حکومت کے صرف ایک ایک پہلو کا حوالہ دینا اپنا مدعا واضح کرنے کے لئے کافی ہے ہماری طرز سیاست کیا رہی اور سیاسی لیڈر بالعموم کیسے بنے ؟ ۵۸ کے بعد کا آئینہ سامنے رکھ لیتے ہیں ۔ مجھے معاف رکھا جائے میں نام لینے پر مجبور ہوں ورنہ ہماری تجریدی اور مشاورتی بن کر رہ جائے گی۔ ۵۸ء میں مرحوم جونیجو وزیراعظم بن گئے اور ہمارے اجملہ ارکان اور ہمارے ایوان نے انہیں اپنا لیڈر مان لیا، آخر کس بنیاد پر؟ ایک بار وہ نواب کالا باغ کی کابینہ میں شامل ہوئے اور دوسری بار ضیاء الحق کی مارشل لائی کابینہ میں، وہ ہمیشہ ''بیک بینچر'' رہے ۷۰ء سے ۸۵ تک ان کا کوئی سیاسی رول اور جمہوری کردار نہیں رہا مگر وہ یکایک قائد ایوان اور مسلم لیگ کے صدر بن گئے۔

کیا یہی حقیقی جمہوری اسلوبِ سیاست و اندازِ حکومت ہے؟ کیا اس سارے عمل کو جعلی نہیں کہا جائے گا؟ ہمارے ہاں زیادہ تر لیڈر اسی طرح بنے ہیں یا کسی کی نگاہِ

عنایت سے پہلے دن حکومت میں آ گئے اور بعد میں لیڈر بن گئے یا کسی حکمران سے رشتہ داری اور دوست داری کے سبب ایوانوں میں پہنچے اور پھر لیڈر کہلائے، بیسیوں سیاسی کارکن عمر بھر کارکن ہی رہے۔ حالانکہ بحمداللہ ان کے پاس علم ہوتا ہے سیاسی دانش ہوتی ہے عوامی خدمات کا ریکارڈ ہوتا ہے اچھے سیاسی اور اصولی مزاج کا اثاثہ ہوتا ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے پاس حسن گفتار کا جوہر اور خلوص کردار کا سرمایہ ہوتا ہے مگر دو باتوں کی کمی ان کو ساری عمر لاحق رہتی ہے۔ ایک دولت کی کمی اور دوسرے حکمران خاندان سے دوستی اور قرابتداری کی کمی، کبھی انہیں، "جھونگے" میں کچھ مل جائے تو الگ بات ہے ورنہ ان کا استحقاق کوئی نہیں مانتا، آگے چلئے حاکم زرداری صاحب کیسے ایم این اے بن گئے؟ وہ تو بیچارے کبھی بلدیاتی کونسلر بھی نہیں بنے تھے۔ جواب واضح ہے کہ وہ بے نظیر کے سسر بن گئے اب کون سی طاقت انہیں ایوان میں جانے سے روک سکتی تھی؟ آصف زرداری کیسے ایم این اے اور وزیر بن گئے وہ تو اپنے سینما کے بکنگ مینجر تھے ان کا سیاست اور سیاسی دانش سے کیا واسطہ؟ مگر بن گئے وزیراعظم کے شوہر جو ٹھہرے، گلزار خان کس طرح سینٹ میں پہنچ گئے وہ تو ایک کاروباری آدمی تھے، نہ آگاہ سیاست نہ پیچھا سیاست، مگر چونکہ وہ محترمہ بے نظیر کے لاہور میں میزبان ہوتے تھے۔ اس لئے سینٹ کی ممبری کا ان سے بڑھ کر حقدار کون ہوسکتا تھا؟ غوث علی شاہ بیٹھے بٹھائے وزیراعلیٰ کیسے بن گئے وہ تو ۸۵ء میں سندھ اسمبلی کے ممبر بھی نہیں تھے بلکہ ہائی کورٹ کے جج تھے لیکن جناب ضیاءالحق کی نگاہ کرشمہ ساز نے پورے سندھ کی سیاست پر ان کو غالب کر دیا، اب شریف فیملی کو دیکھئے اگر جنرل جیلانی مرحوم میاں نواز شریف کو یکا یک وزیر خزانہ نہ بناتے تو وہ یا تو کرکٹ کھیل رہے ہوتے یا اتفاق گروپ کے کسی دفتر کو چلا رہے ہوتے پھر دیکھئے میاں صاحب وزیر اعظم بن گئے تو دیکھتے دیکھتے عباس شریف ایم این اے منتخب ہو گئے حالانکہ وہ گلے

میں چوخانے کا رومال ڈال کر تبلیغی چلے کاٹتے تھے ان کو اتنے ووٹ گھر بیٹھے کیسے پڑ گئے؟ نہ ان کا مزاج سیاسی، نہ اسلوب سیاسی، نہ گفتار سیاسی اور نہ کردار سیاسی، اور جتنا عرصہ اسمبلی میں رہے صرف رجسٹر میں ان کا نام درج رہا، کارکردگی صفر جمع صفر، اسحاق ڈار اور سیف الرحمٰن کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ کیا کچھ لکھا جائے اور کتنے نام گنوائے جائیں سوائے غصے سے رونگھٹے کھڑے ہونے، دماغ کا ماریل چٹخنے، دانتوں سے ہونٹ کاٹنے، مٹھیاں بھینچنے، کفِ حسرت ملنے، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے، خون کھولانے جبڑے سینے اور دیوار سے سر پٹخنے کے اس موضوع پر لکھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، یہ تو ہے ہمارے اندازِ سیاست اور سیاسی لیڈر بننے کا فارمولا، رہ گیا اسلوب حکمرانی اس کا مزا آج پوری قوم چکھ رہی ہے جسے چاہا سینٹ کا ممبر بنا دیا، جسے چاہا بغیر پوچھے صدارتی امیدوار نامزد کر دیا جسے چاہا کسی کمیشن کا چیئرمین بنا دیا جسے چاہا ایمبیسڈر ایٹ لارج بنا دیا اور جسے چاہا کسی قومی کمپنی اور اتھارٹی کا ڈائریکٹر جنرل بنا دیا نہ آئین، نہ قانون، نہ قاعدہ، نہ ضابطہ اور نہ خوفِ خدا اور نہ مخلوق کی شرم، لیکن اس سب کے اوپر لیبل جمہوریت کا چسپاں ہے برطانوی جریدے ''اکانومسٹ'' نے روس اور لاطینی امریکہ میں ایسی جعلی جمہوریتوں پر باقاعدہ ایک رپورٹ شائع کی ہے حالانکہ یہ جعلی جمہوریتیں دنیا کے بیشتر حصوں میں رائج ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا باباۓ جمہوریت امریکہ ذرا آنکھ کانی کر لیتا ہے اور یوں بہت سوں کا پردہ رہ جاتا ہے واقعہ یہ ہے کہ دنیا اور پاکستان ابھی حقیقی جمہوریت کی تلاش میں ہے۔ اب تک کا سفر سائے کے تعاقب کا سفر ہے نہ جانے کب تک جاری رہے؟۔

ریڈی میڈ فارمولا

بالآخر برف پگھلی اور قسم ٹوٹی اور جنرل پرویز مشرف نے سیاستدانوں سے ملاقاتیں شروع کر دیں بظاہر تو یہی بتایا گیا کہ یہ ملاقاتیں حکومت کے سات نکاتی ایجنڈے کا حصہ ہیں اوزان لیڈروں سے نئے بلدیاتی ڈھانچے، متوقع آئینی ترامیم اور آئندہ کے سیاسی نظام کے بارے میں گفتگو ہوئی ان ملاقاتوں کا کیا حاصل ہوگا؟ بڑے بڑے تجزیہ نگار دور کی کوڑی لا رہے ہیں، مفاہیم و معانی کیلئے نئے نئے جالے تراش رہے ہیں اور پھر وسیع و عمیق اثرات کی نوید سنا رہے ہیں، مگر ہم جیسے ''قنوطی'' تو اس سب کچھ کو ''ریڈی میڈ فارمولا'' ہی سمجھتے ہیں۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

ماضی کا تجربہ اور ہمارا تجزیہ یہ کہتا ہے کہ جنرل ضیاء کے دور کا مسئلہ بھٹو تھا اور جنرل مشرف کا مخمصہ نواز شریف ہے، ہمیں نہ کبھی بھٹو صاحب نے Attract کیا اور نہ میاں صاحب نے Fascinate کیا ہم کچھ اور ہی خوابوں کے صورت گر اور دوسری ہی منزلوں کے راہی ہیں لیکن کوئی حکومت یا انتظامیہ اگر قومی ایجنڈے کے بجائے کسی فرد کو آگے بڑھانے یا پیچھے دھکیلنے کو اپنا ہدف بنا لے تو اس سے کچھ وقتی فائدہ تو حاصل ہوتا ہے کوئی پائیدار سیاسی نقشہ اور کوئی ٹھوس فکری لائحہ سامنے نہیں آتا، ہماری

سیاسی تاریخ ان ریڈی میڈ فارمولوں سے بھری ہوئی ہے۔ ضیاء صاحب نے چاہا کہ پیپلز پارٹی یا بھٹو فیملی کا توڑ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ پی پی کے سیاسی و اعصابی مرکز سندھ میں نیا سیاسی گروہ ابھارا جائے یوں آج یہ اوپن سیکرٹ ہے کہ ایم کیو ایم کی وجہ تخلیق یہی خواہش تھی البتہ بڑے لوگوں نے سکیم یوں بنائی کہ ایک تیر سے دو نہیں تین شکار ہو جائیں ایک تو سندھ مستقل طور پر دو سیاسی حصوں میں تقسیم ہو جائے اور سندھ میں کوئی پارٹی تن تنہا حکومت نہ بنا سکے یا تو ایم کیو ایم کو ساتھ ملائے یا پھر آزاد ارکان اور دوسرے انفرادی ممبران کو راضی کرے اور یوں مکسچر تیار ہوا اور فیصلہ کن قوت کوئی اور رہے۔ دوسرے کراچی میں جماعت اسلامی اور جمعیت علماء پاکستان کے محفوظ ووٹ بنک کو غیر محفوظ بنا دیا گیا لیکن آگے چل کر یہی ایم کیو ایم ملک، قوم، عوام، سندھ اور خود تخلیق کاروں کے لئے درد سر بن گئی۔ اب اسے نگلنا اور اُگلنا دونوں طرح دشوار ہو رہے ہیں ضیاء صاحب کے بعد بھی بھٹو فیکٹر سے نجات نہ ملی تو آئی جے آئی کی صورت گری کی گئی اور ظاہری مقصد دائیں بازو اور اینٹی پی پی ووٹ کو منقسم ہونے سے بچانا بتایا گیا اور کچھ ہی عرصے بعد میاں نواز شریف کو اس کا صدر چن لیا گیا حالانکہ وہ اپنی جماعت کے صوبائی سربراہ تھے، آخر وہ کس میرٹ پر ایک قومی سطح کے جماعتی اتحاد کے سربراہ چنے گئے؟ ایک خوبی شائد سامنے رکھی گئی ہو کہ وہ اس وقت پنجاب کے وزیراعلیٰ تھے اس سے خود آئی جے آئی کی سیاسی قوت اور بنیاد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے بالآخر نواز شریف آگے بڑھتے بڑھتے دو بار وزیراعظم بنے اب اپنے ہی تخلیق کردہ، نواز شریف ''مسئلہ'' بن گئے۔ یہ تو مرکزی مثالیں ہیں ورنہ جام صادق علی کا وزیراعلیٰ بنایا جانا، میر افضل کو آگے لانا جتوئی کا نگران وزیراعظم نامزد ہونا وغیرہ یہ سارے دراصل اندر کے مُہرے تھے جو بعد میں قوم کیلئے مسئلہ بن گئے۔ میاں نواز شریف ۹۳ء کے بعد خاص ہاتھوں سے نکل کر عوام کی محفل میں آ گئے۔ اور دوسرے لفظوں میں ''خود شناسی'' کے

مرحلے میں داخل ہو گئے اور یوں مسلم لیگ پہلی بار پی پی کی طرح عوامی جماعت بن گئی اب میاں صاحب وہاں ہیں جہاں بھٹو صاحب کو لے جایا گیا ہمارے نزدیک بھٹو اور نواز شریف دونوں آئیڈیل سیاستدان اور حکمران نہیں دونوں کی اٹھان کا انداز قریب قریب ملتا جلتا ہے مگر ایک بات بہر حال طے ہے کہ ان دونوں نے قومی سطح کی پارٹیاں متعارف کرائیں اور یہ لسانی قومیتی اور علاقائی پارٹیوں کی یلغار اور شورش میں بڑی غنیمت ہے۔

اب یوں لگ رہا ہے کہ جس طرح پی پی سے پیچھا چھڑانے کے لئے کچھ نسخے آزمائے گئے قومی مفاد، وسیع تر ملکی استحکام ''مفاہمت کی ضرورت'' ''جمہوریت کی بحالی'' جیسے خوشنما جملوں سے باور کرایا گیا کہ بھٹو کو Minus کر کے بات آگے بڑھنی چاہیے اس طرح آج بھی میاں کو الگ کر کے سیاسی دشواریوں پر قابو پانے کی کوششیں ہو رہی ہیں، الفاظ اور جملے وہی پرانے ہیں افراد البتہ نئے ہیں گذشتہ ادوار میں حنیف رامے سے مساوات پارٹی بنوائی گئی جتوئی سے این پی پی اور کوثر نیازی سے پروگریسو پیپلز پارٹی کھڑی کروائی گئی مقصد صرف یہ تھا کہ پی پی کا توڑ کیسے ہو؟ بڑے بڑے ناموں والے لوگ ان خانہ ساز جماعتوں میں شامل ہوئے یا کروائے گئے، مگر پرنالہ وہیں؟ ۸۸ء میں جب صحیح معنوں میں سیاسی و جماعتی انتخابات ہوئے تو سارا تانا بانا بکھر گیا اور بھٹو کی پارٹی ایوان اقتدار میں داخل ہو گئی اور بے نظیر ایک انتقامی نفسیات کے ساتھ حکومت میں پہنچیں اور ایک ناقابل رشک حکومت کا تجربہ سامنے آیا اب بھی کہیں ایسا نہ ہو کہ میاں فیملی کو الگ کر کے باقی لوگوں کے ساتھ معاملات طے کئے جائیں اور جب کسی مرحلے پر سیاسی موسم کھلے تو میاں نواز شریف بھٹو کی طرح پھر قومی سیاست پر سایہ فگن ہو جائے۔ بھٹو کو الگ کر کے باقی پی پی سے گذشتہ دور میں معاملہ کرنا اور آج نواز شریف کو چھانٹ کر مسلم لیگ سے تعلقات بڑھانا کیسے قرین

انصاف ہے کہ اگر خرابیوں کی ذمہ دار ہے تو ساری پارٹی ہے اس کے وزراء، ممبران حاشیہ نشین، مراعات یافتگان اور عہدیداران سب اس خرابی کے حصہ دار ہیں، انہی لوگوں نے بھٹو اور نواز شریف کو کندھوں پر ہی نہیں بانس پر چڑھا رکھا تھا یہ اس سارے عمل سے بری الزمہ کیسے ہو سکتے ہیں۔

ہمارے نزدیک مسئلے کا حل کچھ بنیادی اصلاحات ہیں اور وہ بھی اپنی ذات اور موافق و مخالف شخصیات سے اوپر اٹھ کر کی جائیں اس سے شائد ہوا کا رخ بدلے، اگر پرانی شراب نئی بوتلوں میں بھر کر لائی گئی تو لیبل بدلنے سے اس کا رنگ ذائقہ اور مزاج تو نہیں بدل جائے گا۔ اصلاحات کچھ اس نوعیت کی ہوں کہ جن کا مقصد یہ ہو کہ کوئی کرپٹ شخص ایوان میں نہ پہنچنے پائے۔ نہ یہ کہ فلاں شخص نہ آنے پائے، دریں اثناء یہ ضرورت بھی محسوس کی جا رہی ہے کہ حشرات الارض کی طرح اُگی اور پھیلی ہوئی جماعتوں کا قلع قمع کیا جائے جس کے پاس چار پیسے آتے ہیں یا اسے کوئی اپنی جماعت سے نکالتا ہے یا اسے تصویر اخبارات میں چھپوانے کا شوق چراتا ہے تو ایک جماعت کھڑی کر کے "سیاسی آلودگی" میں اضافہ کر دیتا ہے۔

ہماری گزارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ سیاسی عمل کو کھلا شفاف اور دوستی و دشمنی کی نفسیات سے پاک رکھا جائے اس سے قوم کی سیاسی تربیت ہوگی اور سیاسی عمل پر عوام کا اعتماد بڑھے گا اور یہی چیز اصل میں سیاسی استحکام کے ساتھ ساتھ ملکی استحکام کے لئے شاہ کلید کا درجہ رکھتی ہے سیاسی راہنماؤں سے ملاقات صرف ان کے "ویوز" لینے کیلئے ہوں انہیں، ویوز کرنے کیلئے نہ کی جائیں، اس سے مستقبل میں نئے مسائل کھڑے ہو سکتے ہیں اونٹ کی کمر پہلے ہی بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔ آخری تنکا نہ ہی رکھا جائے۔

"ہمتِ مرداں، مددِ خدا"

ملک جس حال کو پہنچ چکا ہے اور مستقبل جو نظر آ رہا ہے اگر چند سخت فیصلے نہ ہوئے، جرأت کے ساتھ نہ ہوئے اور بروقت نہ ہوئے تو جو نتائج نکل سکتے ہیں ان کو سمجھنے اور دیکھنے کے لئے نہ زیادہ ذہانت درکار ہے اور نہ وافر مہلت میسر۔

جنرل صاحب آپ براہ کرم فائل ورک سے باہر نکل کر مسائل و مشکلات کا براہ راست فہم اور ادراک حاصل کیجئے، یہ نہ دیکھئے کہ آئین اور قانون کی کتابوں میں کیا لکھا ہے بلکہ پڑھنے کی کوشش کیجئے کہ لوگوں کے چہروں پر کیا لکھا ہے یہ نہ سوچئے کہ پارلیمان کا تقاضا کیا ہے بلکہ دھیان دیجئے کہ پبلک کی حرمت اور جان کو کیا مسئلہ درپیش ہے، اس کی پروانہ کیجئے کہ جمہوری روایات کیا ہیں بلکہ اس پر توجہ دیجئے کہ عوام کی مشکلات کیا ہیں۔

آپ کا کوئی جاگیردارانہ پسِ منظر تو ہے نہیں کہ حکومت آپ کا مسئلہ ہو اور چوہدراہٹ آپ کا پرابلم، آپ کا خاندان سرمایہ دار بھی نہیں کہ کاروبار آپ کے دردِ سر ہو، آپ تو ایک سپاہی ہیں اور روباہی ایک سپاہی کی فطرت میں ہرگز شامل نہیں ہوتی آپ گھر بیٹھے بٹھائے "جرنیل" نہیں بن گئے اور ورثے کے طور پر چیف ایگزیکٹو نہیں بنے سخت محنت نے آپ کو جرنیل بنایا اور قدرت نے چیف ایگزیکٹو بننے کا موقع فراہم کیا اس کے لئے آپ کو وہ دن یاد رہنے چاہئیں جب پیشہ وارانہ فرائض کے طور پر آپ

کومورچوں میں راتیں بسر کرنی پڑی ہوں گی، فاقے اٹھانے پڑے ہوں گے، پیاس سہنی پڑی ہوگی اور نیند کو ترسنا پڑا ہوگا، یہ سب کچھ تو آپ کے کیریئر کا لازمہ تھا مگر ان لاکھوں خاندانوں اور کروڑوں انسانوں کو دیکھئے جنہیں اس نظامِ زر اور عہدِ جبر نے مورچہ نما تنگ گھروں میں رہنے پر مجبور کر رکھا ہے ورنہ کھلی فضا میں رہنے کو کس کا جی نہیں کرتا؟ سردیوں میں دھوپ تاپنے اور گرمیوں میں تازہ ہوا لینے کی کس کو خواہش نہیں ہوتی ؟ اس قارونی نظام نے سرتوڑ محنت کے باوجود لاکھوں لوگوں کو فاقے کرنے پر مجبور کر رکھا ہے ورنہ دو وقت کی روٹی کس کی ضرورت نہیں؟ یہ اس ابلیسی نظام نے عام آدمی کے لئے روح افزا نہیں محض صاف پانی حاصل کرنا جوئے شیر کھودنے کے برابر بنا رکھا ہے اور اس شدادی نظام نے خوف و ہراس اور مال و جان اور آبرو لوٹے جانے کے باعث ہر شخص کی آنکھوں سے نیند چھین رکھی ہے ورنہ دن بھر کی مشقت کے بعد کمر سیدھی کرنے اور گہری نیند لینے کی کس کو تمنا نہیں ہوتی ؟ جناب جنرل صاحب ! نظام رواں کے یہ ضابطے سر سر مغالطے اور دفتری فائلیں شیطانی زنبیلیں ہیں مغالطے صاف کر دیجئے اور زنبیلیں چاک کر ڈالئے جو ظالم کو سر چڑھاتی اور مظلوم کو ڈالتی اور دباتی ہیں، آپ ایک مسلمان سپاہی اور مسلمان فوج کے سالار ہیں۔ آپ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے چیف ایگزیکٹو اور اسلامیان پاکستان کے امور و معاملات کے نگہبان ہیں آپ کے ایک مسلمان ہونے کے ناطے زمانے بھر کی ضمانتیں اتنی اہم نہیں جتنی خدا کی ضمانت اہم ہونی چاہیے قرآن مجید کی فراہم کردہ تین ضمانتیں آپ کے سامنے ہونی چاہئیں اور اللہ کا نام لے کر کام کا آغاز کر دیجئے۔ خدا اپنے وعدے کے خلاف کبھی کچھ نہیں کرتا ارشاد خداوندی ہے۔

"اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت بدلنے کا عزم نہ کرلے۔" (الرعد،١١)

محترم پرویز صاحب، آپ اپنی اور قوم کی نفسیات بدلنے کا عزم کر لیجئے اللہ تعالیٰ قسمت بدل کر رکھ دے گا۔

دوسرا فرمان الٰہی ہے "میرا رب میرے ساتھ ہے وہ ضرور مجھے راستہ دکھائے گا۔" (الشعراء،۶۲)

آپ اپنے رب کو اپنا مددگار، ہمراہی اور معاون بنا لیجئے وہ آپ کو ضرور سیدھا اور سہل راستہ بتادے گا اور راہ کی جملہ مشکلات دور کر دے گا۔

تیسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "جو ہمارے لئے جدوجہد کریں ہم انہیں اپنے راستوں کی ہدایت عطا کر دیتے ہیں۔" (الروم ۲۹)

جناب عالی! آپ بھی اپنی حکومت کے قیام اور اقتدار کے دوام کی بجائے اللہ تعالی کی خوشنودی کی خاطر مخلوق خدا کی سہولت اور خدمت کے لئے جہاد شروع کر دیجئے خالق اکبر آپ کے لئے راستے کھولتا جائے گا اور برابر توفیق اور راہنمائی عطا فرماتا جائے گا گویا تین لازمی تقاضے ہیں اگر وہ پورے کر دیئے جائیں تو وہ اللہ کی ضمانت فراہم کر دیتے ہیں۔ عزم بالجزم، رفاقت الٰہی کا یقین، اور جدوجہد کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول، آپ عزم کر لیجئے کوئی طاقت آپ کو ہضم نہیں کر سکے گی آپ خدائی رفاقت پر بھروسہ کیجئے آپ کو کوئی دھوکہ نہیں دے سکے گا، آپ سب کچھ اللہ کے لئے کیجئے کوئی بندہ آپ کی منزل کھوٹی نہیں کر سکے گا اہل دنیا کی روایات بدلتی رہتی ہیں اللہ کی عنایات کا پیمانہ وہی ہے جو پہلے تھا کوئی ابراہیمؑ بن کر نمرود کی آگ کا سامنا کرنے پر آجائے تو خدا اس الاؤ کو گل و گلزار کر دیتا ہے کوئی موسیٰؑ بن کر دریائے نیل میں کودنے کا ارادہ کر لے تو خدا ایک نہیں بارہ راستے نکال دیتا ہے کوئی حسینؓ کربلا میں خیمے گاڑ دے تو خدا بنوامیہ سے عمر بن عبدالعزیز پیدا کر دیتا ہے کوئی مجدد الف ثانی کا پیروکار بن جائے تو مغلوں میں اورنگ زیب عالمگیر اٹھا دیتا ہے۔ اور کوئی شاہ ولی

اللہ کی للکار اپنا لے تو مرہٹوں کے سر کچلنے کیلئے احمد شاہ ابدالی پہنچ جاتا ہے، تاریخ اسی نشیب و فراز کا نام ہے تاریخ مصلحت سے نہیں ہمت سے بنتی اور تقدیر افسر شاہی کی موافقت سے نہیں خدا کی معاونت سے بدلتی ہے۔

قابل احترام جرنیل صاحب! ''ہمتِ مرداں مددِ خُدا'' کا محاورہ کسی نے گھر بیٹھ کر نہیں گھڑا یہ تاریخ کے پیچ در پیچ واقعات اور انسانی زندگی کے تجربات سے ابھرا ہے۔ آپ جس نازک صورتحال سے گزرے آپ جس طرح کئی ہزار فٹ کی بلندی میں معلق رہے آپ جس موت وحیات کی پل صراط پر چلے اور آپ جس کشمکش میں رہے۔ قریب تھا کہ آپ جاں سے گزر جاتے، عین ممکن تھا کہ آپ کے حوصلوں کا گراف نیچے آجاتا قرین قیاس تھا کہ آپ اس پل صراط سے لڑھک جاتے اور یقینی نظر آتا تھا کہ آپ ذہنی واعصابی طور پر شکست در بخت کا شکار ہو جاتے لیکن جس طرح آپ نے یہ مراحل بڑی ہمت سے طے کئے جب کہ آپ کے پاؤں کے نیچے زمین بھی نہیں تھی مگر اب آپ کے زیر قدم تو پایہ تخت ہے۔ آپ کے زیر کمان ایک مسلح اور بے حد منظم فوج ہے اور آپ کے زیر اثر ایک پورا ریاستی اور حکومتی ادارہ ہے اب آپ پہلے سے نسبتاً تھوڑی ہمت کریں تو زیادہ نتائج نکل سکتے ہیں۔ خدا کی حمایت بندوں سے مشروط ہے، ہمتِ مرداں مددِ خُدا۔

عصر حاضر میں علماء کا سکڑتا ہوا کردار

یہ حقیقت بہت تلخ سہی مگر اسے مان لینا چاہیے اور ماننے کے علاوہ چارہ بھی نہیں کہ عصر حاضر میں روائتی دینی علماء اور مذہبی زعماء کا کردار بالخصوص پاکستانی معاشرہ میں سکڑ کر رہ گیا ہے اور برابر سکڑتا سمٹتا چلا جارہا ہے۔ جب کہ دینی مدارس کا ایک وسیع وعریض سلسلہ ہے مساجد کی تعداد ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہے دینی تعلیم کے حصول میں مصروف طلباء بھی لاتعداد ہیں۔ مذہبی تقریبات کے انعقاد کا غلغلہ بھی چاروں طرف ہے۔ اذانوں کی آواز سے پورا ملک گونج رہا ہے اور صلوۃ وسلام کے نغمے ہر شہر اور قصبہ تو کیا ہر کوچہ ومحلّہ سے اٹھ رہے ہیں لیکن بایں ہمہ علماء کا کردار محض رسمی اور ضمنی نظر آتا ہےکہیں بھی قائدانہ اور بنیادی دکھائی نہیں دیتا یہ منظر دیکھ کر ایک گونہ حسرت اور حیرت ہوتی ہے ایک طرف تو دنیا بھر میں اسلام کا چرچا ہے اور جادو بن کر ہر ایک کے سر چڑھ کر بول رہا ہے، مغرب اور امریکہ نے اپنی مادی اور بے خدا تہذیب کے جملہ مالی، سیاسی، فکری، ذہنی اور علمی وسائل اسلام کی راہ روکنے اور اسلام پسندوں کا ناطقہ بند کرنے کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں اور مغرب کو سب سے زیادہ پریشانی اگر کسی جانب سے ہے تو وہ اسلام کے بڑھتے ہوئے سیاسی کردار اور فکری وروحانی یلغار سے ہے، امریکہ اور مغرب میں ریسرچ ونگ قائم ہو رہے ہیں، نئے فلسفے تراشے جارہے ہیں۔

گونا گوں تہمتیں گھڑی جا رہی ہیں اور اکیسویں صدی کے لئے نئے حوالے ڈھونڈھے جا رہے ہیں یہ سارا اہتمام صرف اور صرف اس دین کی روک تھام کے لئے ہے جس کی تہذیب اور فکر اکیسویں صدی کا جلی عنوان اور روشن نشان بنتی دکھائی دے رہی ہے۔ وہ مسلم ممالک جہاں کمیونزم اور مغرب نے اپنے سارے ذرائع صرف کر کے اسلام اور اس کے فلسفے کو سرنگوں اور لوگوں کو اس سے بیزار کر دیا تھا وہاں پھر سے اسلام لوگوں کے لئے نقطہ سکہ اور قوتِ جاذبہ بنتا جا رہا ہے۔ انڈونیشیا ہو یا الجزائر، ترکی ہو یا سوڈان، وسط ایشیائی ریاستیں ہوں یا اردن اور افغانستان ہو یا سابق یوگوسلاویہ ہر جگہ احیائی عمل اور رجوع الی الاصل رو روں پر ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک آدھ ملک چھوڑ کر جہاں بھی احیائی اسلامی تحریکیں جاری ہیں، وہاں ان کی رہنمائی اور لوگ کر رہے ہیں جو ہیں تو مخلص اور سچے مسلمان، لیکن روائتی حلقہ علمائے سے ان کا تعلق نہیں اور ان کا شمار با قاعدہ صفِ علماء میں نہیں ہوتا اس کا مطلب یہ ہوا کہ دین اپنی انقلابی قوت اور فکری کشش سے تہی دامن نہیں کچھ کمی ہے تو اس کے وارثوں اور علمبر داروں میں ہے یعنی

رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

شیخ الاسلام شیخ القرآن، شیخ التصوف، اربابِ محراب و منبر، استادانِ مکتب اور ارباب جبہ و دستار عوام کے لئے مراجع و مراکز نہیں بن رہے اور سیاسی و سماجی معاملات میں لوگ ان کی قیادت پر مطمئن اور ان کی رہنمائی کے لئے طالب نظر نہیں آتے۔

یہ ناخوشگوار واقعۂ لحہ فکر یہ تو ہے ہی نقطہ اصلاح بھی بن سکتا ہے بشرطیکہ گردو پیش پر کوئی غور کرنے اور اپنے انداز پر نظر ثانی کیلئے تیار ہو، آخر آج امام مالک رضی اللہ عنہ اور ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے وارث دوسروں کے محتاج اور ضمیمہ کیوں دکھائی دیتے ہیں؟

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے پیرو دوسروں کے ترجمان اور ناطق کیوں بنے ہوئے

ہیں؟ آج امام ابن تیمیہ اور ابن القیم کے معنوی فرزند چھوٹے چھوٹے دائروں میں بند ہو کر کیوں رہ گئے ہیں؟ اور آج مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی فکر کے امین سمٹ سمٹ کر گوشہ نشین کیوں ہو گئے ہیں؟

موتیوں سے کھیلنے والے آج سنگریزوں سے دل بہلا کر کیوں خوش رہتے ہیں؟ وقت کا امام کہلانے والوں سے کارِ جہاں کی زمام کیوں کر چھن گئی ہے؟ اور قافلہ سالار کس لئے بے یار و مددگار اور دوسروں کی معاونت کے طلب گار نظر آتے ہیں ظاہر ہے اتنے بڑے حادثے کے کچھ اسباب ہوں گے کچھ خوشگوار اور کچھ ناگوار

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

ان اسباب کا تجزیہ بھی ضروری ہے اور عصری ضروریات کا جائزہ لینا بھی لازمی ہے اس کے بغیر عروج و زوال کی یہ داستان مکمل نہیں ہوتی، یہ موضوع ممکن ہے بعض ماتھوں پر تیوریاں چڑھا دے لیکن قوی امکان ہے کہ لاکھوں اہل دل کے لئے یہ ایک ایسا سنگ میل ثابت ہو جس کے اندازہ کرنے میں آسانی رہے گی کہ ہم منزل سے کتنے دور رہ گئے ہیں یا کتنے قریب آ گئے ہیں؟ اس باب میں اگر سارا قصور علماء کا نہیں تو تمام بوجھ عوام پر بھی نہیں ڈالا جا سکتا، یہ رشتہ الفت اگر ٹوٹا ہے تو کسی کشاکش کی نشاندہی کرنی پڑے گی اللہ نے توفیق دی اور قارئین نے دلچسپی لی تو اس موضوع پر محتاط اور مہذب عنوان سے بات کا سلسلہ آگے بڑھے گا۔ انشاء اللہ

اگر اس سلسلہ میں کوئی صاحب اپنے تاثرات سے آگاہ کرنا چاہیں تو میرا پتہ اور فون نمبر نوٹ فرما لیں۔

۲۲۔ ایچ مرغزار کالونی عقب اعوان ٹاؤن ملتان روڈ لاہور۔ فون 5212005

BAMBOOZLE

پرُ اسرار تہوں میں چُھپا وہ منصوبہ بالآخر ۱۴ اگست کی شام کو ٹی وی سکرین کے ذریعے سامنے آ گیا، جسے جنرل پرویز مشرف اپنے سات نکاتی ایجنڈے میں ٹاپ پیرائرٹی قرار دیتے ہیں یعنی نچلی سطح پر تفویضِ اختیارات کا منصوبہ۔ جنرل صاحب نے اپنی طویل نشری تقریر میں اس کے حتمی خدوخال پیش کیے ہیں اور اب دسمبر میں اس پر عمل درآمد کا آغاز ہوگا، فوج نے اقتدار سنبھالنے کے بعد شروع شروع میں جب اس منصوبے پر اظہار خیال کیا تو سیاستدانوں، صحافیوں اور دانشوروں کے کان کھڑے ہونے شروع ہو گئے تھے، پھر جنرل صاحب نے ۲۳ مارچ کو اس کی تفصیلات سے قوم کو آگاہ کیا اور ۱۴ اگست تک اس پر لوگوں کو بحث کرنے اور تجاویز دینے کی دعوت دی۔ ادارہ قومی تعمیر نو کا یہ فکری شاہکار پہلے بھی متنازعہ رہا ہے، اب آخری اور حتمی شکل میں بھی قبولیت عام حاصل نہیں کر سکا لیکن حیرت ہے کہ ۱۶ اگست ۲۰۰۰ء کے وفاقی کابینہ کے اجلاس میں اس منصوبے پر اطمینان کا اظہار کیا گیا اور بتلایا گیا کہ کابینہ نے نوٹ کیا ہے کہ چند سیاستدانوں کو چھوڑ کر پوری قوم نے اس منصوبے کو قوم کے مفاد کا مظہر اور اجتماعی امنگوں کا ترجمان قرار دیا ہے اب یہ خدا بہتر جانتا ہے کہ ہماری وفاقی کابینہ کو کیسے معلوم ہو گیا یا اس کے پاس کہاں سے اطلاع آئی ہے کہ یہ منصوبہ بہت قابل عمل، نتیجہ خیز، اور تسلی بخش ہے؟ اطلاع کے دو ہی ذریعے ہو سکتے ہیں ایک قومی ریفرنڈم اور دوسرا اخبارات، ریفرنڈم تو ابھی ہوا نہیں کہ پتہ چل

سکے عوام کی کیا رائے اور مرضی ہے؟ رہ گئے اخبارات تو اس میں کسی منڈی ڈھاباں سنگھ کے معطل کونسلر یا واں رادھا رام اور کنگن پور کے کسی سماجی کارکن کا بیان اس کے حق میں آیا ہو تو الگ بات ہے ورنہ ملک کی معروف اور مسلّم سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کی اکثریت نے اسے Bomboozle قرار دیا ہے یعنی جھالنا یا گورکھ دھندا جس کے لئے پنجابی زبان میں بڑا شاندار لفظ متبادل کے طور پر ملتا ہے یعنی ''بھمبل بھوسا''۔

جناب طاہر القادری صاحب چونکہ حکومت کی حمایت میں اپنے دستخطوں کے ساتھ ایک ''بلینک چیک'' کاٹ چکے ہیں ایک تو انہوں نے حمائت کی ہے دوسرے مولانا سمیع الحق نے جو ویسے انتخاب کو ''امر فضول'' قرار دیتے ہیں رہ گئے اعجاز الحق تو ان کا مخمصہ آج تک معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ ہے کیا؟ انہوں نے بھی اس کی تائید کی ہے ورنہ مولانا فضل الرحمان نے کہا ہے کہ ''حکومت نے پاکستان توڑنے کی بنیاد رکھ دی ہے'' پروفیسر غفور احمد نے ردعمل دیتے ہوئے کہا ہے ''چیف ایگزیکٹو صاف کہہ دیتے ہیں کہ عوام کو اقتدار منتقل نہیں کرنا'' ایم کیو ایم کے آفتاب شیخ کا بیان ہے ''نیا نظام مسترد کرتے ہیں۔ اے این پی کی بیگم نسیم ولی نے کہا ہے ''جنرل صاحب نے جو پڑھ کر سنایا خود ان کی سمجھ سے باہر تھا'' مسلم لیگ کے سردست مسلمہ ترجمان راجہ ظفر الحق کی رائے ہے۔ ''یہ بلدیاتی نظام خاصا پیچیدہ ہے'' بے نظیر بھٹو کے ترجمان کا کہنا ہے'' ایوبی دور واپس لانے کی کوشش کی گئی ہے۔'' نوابزادہ نصر اللہ خان کی پارٹی کے مطابق ''نہ یہ کوئی نیا منصوبہ ہے اور نہ کوئی نئی بات''

اگر تو یہ سیاسی جماعتیں کسی حد تک رائے عامہ کی ترجمان ہیں تو ان کی رائے بہرحال نئے بلدیاتی نظام کے حق میں خوشگوار نہیں کسی سے اتفاق و اختلاف اپنی جگہ اور پسند اور ناپسند ایک طرف بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ ملک میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ایک بڑے ووٹ بینک کی حامل ہیں جماعت اسلامی ایک باشعور اور سیاسی تدبر

رکھنے والی جماعت ہے۔ اے این پی کو صوبہ سرحد میں ایک مقام حاصل ہے۔ ایم کیو ایم کراچی کے عوام میں بڑا اثر و رسوخ رکھتی ہے۔ جمعیت علماء اسلام سرحد اور بلوچستان میں بہت قابل ذکر اور اہم جماعت ہے۔ نواب زادہ نصر اللہ اپنی ذات میں انجمن اور سرد و گرم چشیدہ اور درجنوں سیاسی تجربات و حادثات کے عینی گواہ ہیں۔ ان سب کی رائے پر وفاقی کابینہ کے تاثر کو ترجیح دینا کسی صورت موزوں اور معقول بات نہیں۔ یہ الیکشن حکومت کرواتی ہے اور پارٹیاں اس میں حصہ بھی لے لیتی ہیں پھر بھی اسے سندِ جواز نہیں کہا جائے گا اس کی حیثیت بامر مجبوری کی رہے گی کس کی نیت کیا ہے؟ اس سے قطع نظر حکومت کے علانیہ اور خفیہ مقاصد کیا ہیں اسے ایک طرف رکھتے ہوئے سیاستدانوں کے نجی اور سیاسی مفادات کیا ہیں؟ اس سے بھی صرف نگاہ کرتے ہوئے ہمارے نزدیک چند باتیں ایسی ہیں جو مستقبل کے سیاسی و سماجی منظر کو دھندلانے کیلئے کافی ہیں۔

نیا بلدیاتی نظام بہر حال ایک فرد اور اس کے ماتحت ایک سرکاری ادارے کا تخلیق کردہ ہے اس کے پیچھے کوئی آئینی قوت اور عوامی رائے نہیں کسی بڑے سے بڑے فرد کی رائے بہر حال قومی و اجتماعی شعور کا متبادل نہیں ہوتی کجا کہ اسے برتری اور بالا دستی حاصل ہو اس لئے یہ نظام برگ و بار لانے والا نظر نہیں آتا، اور یہ پائے چوبیں سخت بے تمکین ہے۔

اس باب میں جنرل ایوب خان کو اولیت حاصل ہے کہ اس طرح کا ایک نیا نظام سب سے پہلے انہوں نے تخلیق کیا تھا لیکن وہ نظام نہ ان کو سہارا دے سکا اور نہ قوم اور ملک کو کوئی فائدہ پہنچا سکا اور ان کے دور کے دس سال سیاسی کتاب میں کورے کاغذ کی طرح رہے کہیں اب بھی ایسا نہ ہو کہ سفر تو طے ہو جائے لیکن منزل کی دوری اپنی جگہ رہے۔

نیا بلدیاتی نظام جب حسب سابق غیر جماعتی بنیادوں پر استوار ہوگا، ایوب

خاں اور ضیاء الحق کا غیر جماعتی انتخابی نظام ملک کو برادری ازم کی بھینٹ چڑھا گیا اور کچھ ناپختہ اور اتھلی قیادت کو سامنے لایا، موجودہ تجزیہ آخر پہلے دو تجزیوں سے کیسے مختلف ہوسکتا ہے۔؟

یونین کونسل کے بعد اگلے انتخابی مراحل بلاواسطہ کی بجائے بالواسطہ ہوں گے ان کا صاف مطلب ایسے افراد اور سسٹم کو پروموٹ کرنا ہے جو حکمرانوں کے لئے آسانی سے (Mangeable) مینج ایبل ہو اس طرح کی حکومتی مینجمنٹ ہمیشہ قوم کے لئے غیر مفید ثابت ہوئی ہے اور بہت سے شکوک وشبہات کے باعث اس کے اچھے پہلو بھی گرد آلود ہو جاتے ہیں۔

ملک کے ستر فیصد دیہی اور قصباتی علاقوں میں جاگیرداری کا جبڑا توڑے اور برادری ازم کا بھیجا پھوڑے بغیر انتظامیہ کو منتخب سیاسی لوگوں کے ماتحت کر دینا علاقے بھر کے جاگیرداروں زمینداروں اور بھتہ خوروں کے مظالم اور جراثیم کو قانونی چھتری مہیا کرنے کے مترادف ہے، ہم اسے ہزار بار خام خیالی کہیں گے کہ دیہی علاقوں میں نئی قیادت ابھرے گی ایسا ہرگز نہیں ہوگا راجن پور میں مزاری اور دریشک، ڈیرہ غازی خان میں لغاری اور کھوسے نواب شاہ میں جتوئی، رحیم یار خاں میں مخدوم اور گجر، سرگودھا میں ٹوانے اور قریشی، اوکاڑہ میں وٹو اور راؤ، شکار پور میں سومرو، جیک آباد میں بجرانی، ملتان میں گیلانی اور قریشی اور میاں والی میں روکھڑی اور نوانی ہی برسر اقتدار آئیں گے۔ یہ لکھی پڑھی بات ہے۔

موجودہ بلدیاتی نظام میں عورتوں کا تناسب کسی بھی اعتبار سے درست نہیں، نہ سیاسی لحاظ سے اور نہ سماجی پہلو سے معلوم نہیں کس ''بزرجمہر'' نے اتنا بڑا جمپ لگانے کو کہا ہے کراچی، لاہور اور اسلام آباد پر باقی نوے فیصد شہروں، قصبوں اور دیہات کو قیاس سخت بے عقلی اور نادانی ہے۔

ہمیں خطرہ ہے کہ دو سال بعد جب نئی اسمبلی وجود میں آئے گی اگر تو وہ آزادانہ اور جماعتی بنیادوں اور موجودہ فوجی حکمرانوں کے اثر سے پاک ہوئی تو پہلے روز کے افتتاحی اجلاس میں تلاوت کلام پاک کے بعد سب سے پہلے اسی نظام کی منسوخی کی قرارداد پیش کرے گی اور اگر اس نظام کو سپریم کورٹ کے دیئے ہوئے اختیار کے مطابق آئین میں ترمیم کر کے دستوری جواز بھی فراہم کیا گیا تو اگلی اسمبلی وقت آنے پر اس ترمیم کو اڑا دے گی اور یوں برسوں کی محنت اور قوم کا سرمایہ ضائع چلا جائے گا۔

نئے انتظامی اور سیاسی تجربات کے بجائے بہتر یہ ہے کہ آئین میں درج چیزوں کو اس کی پوری روح کے مطابق نافذ العمل کرنے کی کوشش کی جائے، نئے تجربات وقت بھی زیادہ لیتے ہیں اور مشقت بھی زیادہ کرواتے ہیں مگر ان کی افادیت اور منفعت اس کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے کہیں یہ تجربہ بھی ملک کو سیاسی اعتبار سے بہت مہنگا اور سماجی لحاظ سے ضرر رساں ثابت نہ ہو۔

ضلع کونسل کے چیئرمین کی بجائے ''ناظم'' کہلانے سے مسائل حل نہیں ہوں گے اور محض قانون سازی سے انسان سازی نہیں ہو جاتی، اگر مسائل دیرینہ اور پیچیدہ ہوں علاقے کے احوال و معمولات حسب سابق ہوں، فکری و ذہنی سانچہ سابقہ ہو، افراد پہلے والے ہوں اور امراض بھی برسوں پرانے ہوں تو محض سیاسی ڈھانچہ بدلنے اور قانون کی نوک پلک ٹھیک کر دینے سے انقلاب نہیں آ جاتا۔ بوسیدہ بنیاد پر نئی عمارت آخر کتنے دن کھڑی رہ سکتی ہے؟۔

مولانا فضل الرحمٰن کہہ رہے تھے

کونسل آف نیشنل افیئرز (CNA) کی ہفتہ وار نشست کے مہمان خصوصی اس مرتبہ مولانا فضل الرحمٰن تھے، اگرچہ انہیں اگلی صف میں جگہ اور میدان سیاست میں پہچان ان کے والد گرامی مفتی محمودؒ کے حوالے سے ملی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جلد ہی انہوں نے وراثت پر اپنی اہلیت کو غالب کر لیا اور یوں موروثی اپروچ سے بڑھ کر ان کی سیاسی سوچ ان کیلئے اگلی راہیں ہموار کرتی چلی گئی۔ ایم آر ڈی کے قیام کے وقت ان کا حکومتی حلقے میں رہنے کی بجائے اپوزیشن کیمپ میں بیٹھنے کا فیصلہ انہیں بہت جلد قد آور اور سیاسی لیڈر بنا گیا۔

مولانا فضل الرحمٰن اس وقت جمعیت علماء ہند کی جانشین جمعیت علماء اسلام کے امیر ہیں۔ جمعیت علماء ہند اگرچہ علماء کی جماعت تھی مگر انگریزی استعمار کی نفرت اور ہندوستان کی آزادی کے "موٹو" نے اس کے اکابر و اصاغر کو صد فیصد سیاسی ڈھانچے میں ڈھال دیا اور یوں سیاست کے اسرار و رموز ان پر کھلتے چلے گئے اور پھر کانگرس کے ساتھ جمعیت کی ہم آہنگی سیاسی رنگ کو چوکھا کرنے کا موجب بنی۔

مولانا فضل الرحمٰن ایک ہمہ وقت اور بھرپور سیاسی شخصیت ہیں اگر ان کے نام کے ساتھ مولانا نہ لگا ہو اور کوئی ان کا سراپا دیکھے بغیر صرف ان سے گفتگو سنے تو وہ سمجھے گا کہ وہ صرف اور صرف ایک سیاستدان کی گفتگو سن رہا ہے۔ مولانا سیاست کے

معروضی تقاضوں اور زمینی حقائق کا گہرا ادراک رکھتے ہیں اس لئے وہ ہر بات میں مثالیت کی بجائے عملیت کو ترجیح دیتے ہیں CNA کے چیئرمین جناب غلام مصطفیٰ میرانی نے مہمان خصوصی کو کونسل کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا اور میں نے مولانا سے ارکان کا تعارف کرانے کے بعد انہیں خطاب کی دعوت دی تو مولانا نے آغازِ کلام ہی اس بات پر کیا کہ ہم جب ۸۸ء میں پارلیمنٹ میں گئے تو بڑے آدرش اور بڑی آشائیں لے کر وہاں پہنچے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ احساس ہوا کہ یہ سینٹ یہ قومی اسمبلی اور یہ منتخب ادارے محض "چلمن" ہیں ان کے پیچھے "چہرہ زیبا" کوئی اور ہے جو سارے فیصلے اور قومی حسن و قبح طے کرتا ہے، ہمیں اندازہ ہوا کہ اصل اقتدار فوج کے پاس ہے۔ اور ایوان صدر فوج کا ترجمان ہے اور قومی سلامتی اور ملکی سالمیت کے حوالے سے جو فیصلے ہوتے ہیں تو یہ سلامتی اور سالمیت کا مفہوم ایک خاص طاقت متعین کرتی ہے اور پھر جب چاہتی ہے اسے روبہ عمل لاتی ہے۔"

مولانا نے مجوزہ نئے بلدیاتی نظام پر سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

یہ بلدیاتی نہیں بلکہ نو آبادیاتی نظام لگتا ہے۔ تیرہ کروڑ آبادی کے ملک کو بلدیاتی اداروں کی بنیاد پر چلانا دراصل وہی عمل دہرانے کے مترادف ہے جو انگریز نے ہندوستان میں کیا تھا کہ ہند جیسے بڑے ملک کو رفاہ اور خود مختاری کے نام پر پہلے چھ سو ریاستوں میں تقسیم کیا اور پھر اس کو تاج برطانیہ کے ماتحت کر دیا، مجھے اندیشہ ہے کہ یہ ملک میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کے اقتدار کا پیش خیمہ بن جائے پچاس ساٹھ لاکھ یا ایک کروڑ آبادی کے ملک کو تو اس انداز میں شائد چلایا جا سکتا ہو لیکن تیرہ کروڑ آبادی پر مشتمل اور لاکھوں مربع میل پر محیط ایک مملکت کو اس طرح بلدیات کی سطح پہ تقسیم کر دینا تو قومی سالمیت کے منافی ہے۔" مسئلہ کشمیر پر مولانا فضل الرحمٰن کا کہنا تھا

"کشمیر ہماری خارجہ پالیسی کا Corner State ہے تاہم اس پر ہمیں

معروضی سیاسی حقائق کی روشنی میں فیصلے کرنے چاہئیں ہمارے بعض جذباتی دوست کہہ دیتے ہیں کہ اس کا واحد حل جہاد ہے اور بھارت سے مذاکرات کا کوئی فائدہ نہیں، ہمارے نزدیک جہادی تحریکوں کو دہشت گردی قرار دینا اور نوجوان مجاہدین کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کرنا پرلے درجے کی سنگدلی ہے تاہم یہ ایک پہلو ہے لیکن مسئلہ حل کیسے ہوگا؟ اس کا ایک دوسرا زاویہ ہے ہمارا قومی موقف ہے کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق کشمیری عوام کی امنگوں سے ہم آہنگ فیصلہ درست فیصلہ ہے نیز شملہ معاہدہ میں طے پایا تھا کہ بھارت کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے بات آگے بڑھائی جائے گی بعض لوگ بیک جنبش قلم شملہ معاہدہ کو رد کر دیتے ہیں ہمارے نزدیک یہ جذباتی اپروچ ہے شملہ معاہدہ ایک ریاستی اور قومی معاہدہ ہے جسے اس وقت کی پارلیمنٹ کی توثیق حاصل ہے اور یہ ابھی زندہ ہے تا آنکہ پھر کوئی پارلیمنٹ اسے Re Open کر کے بحث کرے اور حکومت اس معاہدہ کو منسوخ کر دے تب بات بنے گی، ہم سمجھتے ہیں کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کو اور شملہ معاہدہ کو مدنظر رکھنا ہمارے قومی مفاد اور بین الاقوامی برادری میں اپنا اعتماد اور وقار بحال رکھنے کے لئے ضروری ہے واجپائی کے دورہ لاہور کے حوالے سے مولانا اپنا نقطہ نظر بیان کر رہے تھے۔

ہم نے اس دورے پر قدرے اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ چلو اس طرح مسئلہ کشمیر بیوروکریسی کے نرغے سے نکل کر کم از کم سیاستدانوں کے درمیان تو آیا مگر کارگل ایشو نے ہمارے لئے بہت سی الجھنیں پیدا کر دیں اور آج تک ہم اقوام عالم کو اس بارے میں مطمئن نہیں کر سکے اس سے ہمارے بین الاقوامی اعتماد اور وقار کو سخت ٹھیس پہنچی ہے۔

کالا باغ ڈیم پر بڑی مفصل گفتگو رہی اگرچہ اس پر ان کی ایک آدھ رائے آف دی ریکارڈ تھی تاہم انہوں نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

''کالا باغ ڈیمؒ دراصل اعتماد کے بحران کا مسئلہ بن چکا ہے اگر چہ یہ مسئلہ فنی ہے مگر اب اسے محض فنی بنیادوں پر حل کرنا تقریباً ناممکن ہو چکا ہے۔ ہماری اس بارے میں واضح پالیسی ہے کہ ہم اس پر ''ہو یا نہیں'' کے قائل نہیں بلکہ جو دلیل سے بات سمجھا دے ہم مان جائیں گے اسے پنجاب اور سرحد کے تناظر میں دیکھنا غلط ہے یا اس پر بعض مطالبات کے حوالے سے سودا بازی کرنا بھی غلط ہے اسے قومی نقطہ نظر سے دیکھا جائے اور اس کی فنی اور قومی ضرورت کو اولیت دی جائے چونکہ میں کوئی فنی ماہر نہیں ہوں مگر سوچنے پر مجبور ہوں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اس کے خلاف پنجاب کو چھوڑ کر باقی تین صوبوں کی اسمبلیاں کیوں متفقہ قرارداد پاس کر چکی ہیں۔ اے این پی تو چلو سیاسی مخالفت کے حوالے سے آگے ہے مگر سرحد کی مسلم لیگ کے تمام ارکان اسمبلی نے بھی قرارداد پر دستخط کیے ہیں اسی طرح سندھ کے مسلم لیگی وزیر اعلیٰ نے بھی مخالفت کی ہے۔ کالا باغ کے حوالے سے بیوروکریسی نے بھی دوغلی اور غلط اطلاعات پر مبنی پالیسی اپنائی ہے مثلاً سرحد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے جنوبی اضلاع بنوں، کوہاٹ ڈیرہ اسماعیل خان کو فائدہ پہنچے گا حالانکہ یہ بے بنیاد بات ہے اس کا مقصد صرف وسطی اور جنوبی اضلاع میں دوری پیدا کرنا ہے، اس طرح شمس الملک جب تک ایس ای واپڈا رہے ان کی رپورٹ ہے کہ یہ منصوبہ نا قابل عمل ہے مگر جب چیئرمین بنے تو وہ اس کے علمبردار قرار پائے۔ بہر کیف اس سب کے باوجود ہماری جماعت اس معاملہ میں کسی تعصب یا ضد کا شکار نہیں دلائل جس کیمپ کے بھاری ہوں گے ہمارا فیصلہ اسی کے حق میں ہوگا۔

پاکستان میں دینی جماعتوں کے سیاسی کردار کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے مولانا کا فرمانا تھا۔

پاکستان کے پڑوس میں دو بڑے انقلاب برپا ہو چکے ہیں ایک ایران میں اور

دوسرا افغانستان میں اور دونوں جگہوں پر دینی قیامت سامنے آئی ہے اس طرح پاکستان ان اثرات سے کیسے الگ تھلگ رہ سکتا ہے۔؟

ملک میں اسلامی نظام کے حوالے سے ان کا نقطہ نظر بڑا واضح تھا ان کے مطابق ''ہم سنی شیعہ اور بریلوی دیوبندی کے چکر میں نہیں پڑتے اور نہ ہی سیکولر عناصر کے اس الزام کی وضاحت در وضاحت میں جاتے ہیں کہ کس کا اسلام؟ اور کون سا اسلام؟ یہ کہتے ہیں کہ اسلامی نظریاتی کونسل ایک آئینی ادارہ ہے اس میں تمام مکاتب فکر کے نمائندہ علماء موجود رہے ہیں اور کونسل کی حتمی رپورٹیں پارلیمنٹ کو مل چکی ہیں جو بھی قوانین اور فیصلے اس کونسل کے ذریعے آئے ہیں حکومت انہیں نافذ کرے یہ کسی مُلا، یا جماعت کا اسلام نہیں بلکہ ایک ایسے ادارے کا فہم اسلام ہے جو ایک طرف تو نمائندہ ادارہ ہے اور دوسری طرف جس کی حیثیت رضا کارانہ نہیں بلکہ دستوری اور آئینی ہے اس کے لئے مزید فیڈرل شریعت کورٹ موجود ہے وہاں کے فیصلے لے لئے جائیں تا کہ کوئی ابہام باقی نہ رہے۔''

چونکہ مولانا فضل الرحمٰن کے ساتھ دو گھنٹے کی طویل نشست رہی اور بہت سی باتیں ہوئیں سوال و جواب کا سلسلہ بھی رہا۔ مگر اس ساری گفتگو کو احاطہ تحریر میں لانا ممکن نہیں تاہم ایک کالم سے بھی مولانا کا نقطہ نظر اور ان کی تنظیم کا ذہن بہت حد تک واضح اور سامنے آجاتا ہے۔ اس دوران یہ بات بہر حال سامنے آئی کہ اظہار کا قرینہ اور بات کا سلیقہ نہ ٹیڑھا منہ بنا کر انگریزی بولنے سے آتا ہے اور نہ خواہ مخواہ کی روشن خالی کا لیپ چڑھانے سے، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ راقم کو بیسیوں سیاسی رہنماؤں دانشوروں اور اپنے اپنے شعبے کے بڑوں سے ربط وضبط اور تبادلہ خیال کا موقع ملا ہے میں سمجھتا ہوں کہ مکتب و مدرس کے فاضلین اور چٹائی نشین ابلاغ اور اعتماد کے جوہر سے بہت سارے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ آراستہ ہیں۔

محمود رپورٹ اور ہماری طرز عمل

ایک بھارتی اخبار کے ذریعے حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے بعض اہم حصوں کی اشاعت پر رائے زنی، تبصرہ آرائی اور تجزیہ نگاری کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا ہے اور اسے Talk of the town کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا، صحافتی، سیاسی، حکومتی اور دفاعی حلقے برابر اس پر اظہار خیال کر رہے ہیں، اگرچہ یہ رپورٹ اپنے تک یہ "آفیشل سیکرٹ" تھی اور اس کے ہر حرف ولفظ سے آگہی کا تو کسی کو دعویٰ نہیں رہا تا ہم اپنے مندرجات کے لحاظ سے ایک "کھلا راز" رہی اس کے حوالے سے بہت سی باتیں مختلف سیاستدان، اخبار نویس اور سابق فوجی افسران وقفے وقفے سے کرتے رہے ہیں، اور اب جو رپورٹ چھپی ہے تو بہت حیران کن اور ششدر کر دینے والی بلکہ فضا میں پہلے سے موجود صداؤں سے کافی حد تک مماثل اور مشابہہ ہے، ظاہر ہے سقوط ڈھاکہ کا واقعہ نہ تو ایک دن میں رونما ہوا اور نہ بہت چپکے سے اور راز داری کے ساتھ انجام پایا، بلکہ یہ برسوں کا پرورش کیا ہوا حادثہ اور چہار جانب سنائی دینے والا دھماکہ تھا اس لئے عدالتی کمیشن کے بغیر بھی اس کے اسباب و وجوہ معلوم ہو سکتے تھے اور ہزاروں لوگوں کو معلوم تھا۔ یہ واقعہ بھوسے میں گری ہوئی سوئی کی مانند نہیں تھا کہ اسے ڈھونڈنے کے لئے خوردبین کی ضرورت پڑتی، ۱۹۵۱ء کے بعد مسلسل رونما ہونے والے واقعات اس انجام کی خبر دیتے چلے آرہے تھے جو بالآخر سامنے آنا تھا بیں

برسوں میں رونما ہونے والے کی خبر دیتے چلے آرہے تھے جو بالآخر سامنے آنا تھا بیں برسوں میں رونما ہونے والے واقعات اور متوقع بلکہ یقینی نتائج سے پتہ پتہ اور بوٹا بوٹا تو واقف تھا کوئی گل اس سے بے خبر ہو تو دوسری بات ہے مشرق پاکستان کے محترم سیاسی رہنما رخواجہ ناظم الدین کو جس طرح نشانہ تضحیک بنایا اور بے بس اور برطرف کیا جاتا رہا آخر اس کا کچھ اثر ظاہر ہونا تھا حسین شہید سہروردی کو کھڈے لگانے کا نتیجہ یقیناً شیخ مجیب کی شکل میں نکلنا تھا اور اقتدار کی راہداریوں، افسروں کے دفتروں اور حکمرانوں کی نجی محفلوں میں بنگالیوں کو "سازشی" جل پھٹاک، شرارتی، نان مارشل اور غیر مہذب کہنے کا بہرحال ایک دن ردعمل سامنے آنا تھا حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ چونکہ بھارت کے ایک اخبار میں شائع ہوئی ہے۔ اب یہ کج بحثی بھی شروع ہونے لگی ہے۔ کہ یہ رپورٹ وہاں کس نے پہنچائی، کس نے چھپوائی؟ اور یہ جعلی رپورٹ ہے اب اس نکتہ آفرینی اور سراغ رسانی کی ضرورت نہیں سچی رپورٹ ہے تو چھپ گئی ہے جعلی ہے تو اس کا اثر زائل کرنے کے لئے اصلی رپورٹ قوم کے سامنے لائی جائے اس میں تیسری کوئی بات نہیں، ادھر ادھر کی بات کرنا قافلہ لٹنے کے دکھ کا مداوا نہیں بن سکتی۔ مسئلہ کسی راہزن کا نہیں بلکہ راہبر کا ہے راہبر منزل سے بے خبر نااہل یا غافل ہو تو راہزن کو گھات میں بیٹھنے اور شبخون مارنے سے کیسے روکا جا سکتا ہے۔ رات کو گھر کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا جائے اور پھر چور کو کوسنے دے کر اپنی غفلت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جائے تو یہ حرکت نہ قرین عقل ہے اور نہ مبنی بر انصاف ہے۔

پاکستان کے خواص و عوام کو اپنے فرمانرواؤں سے یہ گلہ ضروری ہے کہ ان کے پاس ہر قومی راز اور انکشاف انگیز معلومات، اندر کی خبریں اور محلاتی سازشیں ہمیشہ بیرونی ذرائع سے معلوم ہوتی ہے۔ آخر کیوں یا تو ہمارے حکمران قوم کو ذمہ دار قوم نہیں سمجھتے یا ملک کی وفادار نہیں بظاہر تیسری کوئی وجہ نہیں آخر یہ کیا بات ہوئی کہ جب

سارا افسانہ سرِعام آجاتا ہے اور گردوپیش کے چار محلے سن لیتے ہیں تب اصل لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ کہانی کیا ہے؟ اگر حکمرانوں کو اپنے عوام پر اعتماد نہیں تو پھر اعتماد کا بحران...... ہمیشہ رہے گا۔ اور وقفے وقفے سے طوفان اٹھتا رہے گا۔

دلوں کو الجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

ہم جس دین کے پیروکار اور ماننے والے ہیں اس میں نہ تو یہودیوں کی طرح یہ ہے کہ گناہ سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں اور نہ عیسائیوں کی طرح عقیدہ ہے کہ ہر گناہ کا کفارہ پہلے ادا ہو چکا ہے بلکہ اسلام میں اب گناہ اور اعتراف گناہ ساتھ ساتھ چلتا ہے اور یہی توبہ ہے اور ایک حدیث نبویؐ کی رو سے توبہ کا دروازہ مغرب سے سورج طلوع ہونے تک کھلا رہے گا یعنی قیامت کے روز تک سرے سے گناہ کا سرزد نہ ہونا یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے اور اس کا چپک کر رہ جانا بھی فطرت انسانی کے خلاف ہے۔ اسلام کا مسلک اعتدال یہ ہے کہ کوئی جرم ہو جائے تو یہ بری بات ہے لیکن اس سے توبہ کر لی جائے تو بہت اچھی روش ہے غلطی فرد سے بھی ہوتی ہے اور قوم سے بھی اور توبہ کی گنجائش دونوں کیلئے ہے۔ بات کو دبا دینا بھی درست نہیں اور عمر بھر کے لئے کسی کے ماتھے پر چپکا دینا بھی صحیح نہیں۔ رپورٹ کی روشنی میں ہمارے کار پرداز، ذمہ دار لوگ، حکومتی زعماء، سیاستدان اور خود عوام اگر اپنا طرز عمل درست کر لیں تو رپورٹ کا سیکرٹ رہنا یا اوپن ہونا ثانوی چیز بن جاتا ہے۔ اصل مسئلہ تو اصلاح احوال ہے اگر معاملات جوں کے توں رہیں اطوار و عادات حسب سابق ہوں اور نجی و اجتماعی معمولات اپنی جگہ برقرار رہیں تو رپورٹ نہ بھی چھپے نقصان ہوتا رہے گا اگر ہم اپنا ظاہر و باطن ہم آہنگ کر لیں اور اپنے اندر غلطی کے ماننے کا حوصلہ پیدا کر لیں تو ایک راز کیا ہزاروں راز بھی دنیا کھولتی پھرے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جاپان ۴۵ء میں پاش

پاش ہو گیا آج وہ صنعتی عفریت بن چکا ہے دنیا کی نظر اب اس کے ماضی پر نہیں حال پر ہے اور اس کے مستقبل کو رشک آمیز نظروں سے دیکھ رہی ہے جاپان کو آخر مور کی طرح اپنے بدصورت پاؤں کی طرف بار بار دیکھ کر نادم ہونے کی کیا پڑی ہے؟ وہ اپنے پروں میں چھپے رنگ و حسن کے چمنستان کو دیکھتا ہے اور قوموں کی برادری میں اگلی صف اس کیلئے مخصوص ہوتی ہے کل تک امریکہ ایک ''بیگار کیمپ'' تھا فرانس وسط میں ایک دلدل تھا اور چین ایک زمانے میں افیون زدہ تھا لیکن آج یہ مختلف اور معزز حیثیتوں کے مالک ہیں اے۷ء میں ہم سے غلطی ہوئی، ایک بڑی غلطی، ہم ہوس اقتدار، غرور و تکبر اور ذاتی مہم جوئی سے مغلوب ہوئے تھے ہم یہ سب کچھ کر جان کر آئندہ کیلئے ان تینوں ''جراثیم'' سے چھٹکارا پالیں تو ہمارا ماضی فی الواقع ماضی کی گرد میں گم ہو جائے گا اگر عبرت پذیری سے گریز پا رہے تو ماضی ہی ہمارے حال اور مستقبل پر ڈراؤنے خواب کی طرح چھایا رہے گا ہمارے بیورو کریٹ ہمارے جرنیل اور ہمارے سیاستدان کوئی انبیاء کرام تو ہیں نہیں کہ عصمت جن کا خاصہ ہو، ان تینوں طبقوں سے غلطیاں ہوئیں انہیں مان لینے سے کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔ ہماری قومی زندگی آئندہ سقوط ڈھاکہ جیسے کسی حادثے سے اگر محفوظ ہو جائے تو ایک رپورٹ کیا سو رپورٹیں بھی چھپ جائیں ہمیں منہ چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔

حمودر پورٹ اور لمحات

اسے اتفاق کہیے کہ انہی دنوں جب کہ اخبارات میں حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ کا تذکرہ اور چرچا ہے خرم مراد مرحوم کی سوانح حیات ''لمحات'' میرے زیر مطالعہ رہی ہر ایک کو معلوم ہے کہ خرم مراد صاحب (جن کا انتقال ۱۹۹۶ء میں ہوا) اپنے آخری دنوں میں جماعت اسلامی پاکستان کے نائب امیر اور ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' کے مدیر تھے۔ قبل ازیں وہ طالب علمی کے دور میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم اعلیٰ رہے بنیادی طور پر وہ انجینئر تھے اور اپنے شعبے میں بہت کامیاب اور باوقار اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ بایں ہمہ ان کا اول و آخر ذہنی و قلبی اور فکری و عملی تعلق جماعت اسلامی سے استوار رہا وہ پاکستان کے انتہائی پر آشوب، ہولناک اور نازک ترین دور یعنی ۱۹۷۰ء میں ڈھاکہ شہر کے امیر جماعت تھے، سقوط ڈھاکہ کے بعد وہ جنگی قیدی کے طور پر بھارت کی اسیری میں رہے۔ ان کی سوانح حیات حال ہی میں چھپی ہے جسے ''لمحات'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں ایک باب ہے ''المیوں کا سال'' اس باب میں مرحوم نے مشرقی پاکستان میں ۱۹۷۰ء کے دوران رونما ہونے والے واقعات اور اپنے تاثرات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پس منظر اور منظر دونوں کی صراحت ملتی ہے۔ میں اخبارات میں قسط وار اور چھپنے والی حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ بھی پڑھ رہا ہوں۔ اور اسی دوران ''لمحات'' کا مطالعہ بھی مکمل کر لیا ہے۔ اسے حیرت انگیز

اتفاق کہا جاسکتا ہے کہ رپورٹ اور لحات کے مندرجات بہت حد تک ملتے جلتے ہیں۔

اس کی بدیہی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ چونکہ حمود کمیشن ایک عدالتی کمیشن تھا اس لئے اس نے اپنی رپورٹ عدالتی تقاضوں اور وقار کے مطابق مرتب کی یعنی ذمہ دار اور غیر جانبدارانہ اور اسی طرح خرم مراد صاحب کا ذہنی سانچہ اور فکری تانا بانا دینی، ملّی تھا وہ کسی لسانی، گروہی اور علاقائی عصبیت کا شکار نہیں تھے چونکہ جماعت اسلامی سے عمر بھر وابستہ رہے اور جماعت اسلامی بہر حال مشرقی پاکستان بچائے، صوبائی عصبیت سے دور رہنے عوامی لیگ کے کھلم کھلا سیاسی اختلاف رکھنے بلکہ بہت حد تک عوامی لیگ کے غیظ و غضب کا نشانہ بننے والوں میں شامل تھی اور ظاہر ہے خرم مراد صاحب جماعت کے ایک ذمہ دار فرد تھے اور آخری دم تک اپنے مورچے میں ڈٹے رہے اس لئے ان کے تاثرات نہ تو یکطرفہ کہلائے جاسکتے ہیں اور نہ کسی صوبائی لسانی اور علاقائی تعصب پر مبنی سمجھے جاسکتے ہیں، وہ اور ان کی جماعت ۷۱ء میں سیاسی اقتدار کی رسہ کشی میں کسی صورت فریق نہیں تھے۔ کیوں کہ مغربی پاکستان میں جماعت اسلامی کو چار سیٹیں ملی تھیں اور مشرقی پاکستان میں ایک سیٹ بھی نہیں، وہاں تو عوامی لیگ کا نعرہ ''انا ولا غیری'' گونج رہا تھا۔ بناء بریں خرم مراد صاحب کے محسوسات اور تاثرات کو کسی بھی صورت میں رنگین شیشوں سے نظارہ نہیں کہا جاسکتا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ مرحوم نے کم وبیش وہی باتیں کہی ہیں جو ہمارے دائیں بائیں سننے اور پڑھنے کو ملتی ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب نہ تو دشمن کے فراہم کردہ غلط اعداد و شمار پر مبنی ہیں۔ نہ بد خواہوں کی طرازیوں کا شاخسانہ ہیں اور نہ محض سیاسی مخالفین کی افسانہ سازیوں کا نتیجہ، بلکہ جو کچھ سننے پڑھنے کو ملتا ہے وہ ''زبانِ خلق'' ہے اور زبان خلق بہر حال ''نقارۂ خدا'' ہوتی ہے جس کی آواز ہر سو پھیل جاتی ہے۔

''المیوں کا سال'' کتاب کے صفحہ نمبر ۲۸۳ سے لیکر تاختم کتاب یعنی صفحہ نمبر

۵۲۵ تک پھیلا ہوا ہے اگر اس باب کا خلاصہ سامنے لایا جائے تو کچھ یوں بنتا ہے۔

☆ مغربی پاکستان والوں نے پیریٹی کا اصول قائم کر کے مشرقی پاکستان والوں کو ذہنی طور پر اپنے سے دور کر لیا۔

☆ مغربی پاکستان کی سول اور خاکی بیوروکریسی بنگالیوں کو ہمیشہ تحقیر سے دیکھتی ان کے ساتھ توہین سے پیش آتی اور ان کی تضحیک کرتی تھی۔

☆ بنگالیوں کے نزدیک مغربی پاکستان سے بھی مراد زیادہ تر پنجاب تھا اور وہ اقتدار کا مرکز پنجاب کو سمجھتے تھے اس لئے کہ فوج کا زیادہ تر حصہ پنجاب پر مشتمل تھا۔

☆ ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کے فوجی ایکشن نے مشرقی پاکستان کے تمام لوگوں کے اندر پاکستان کے حق میں موجود فضا کو بھی مسموم کر دیا۔

☆ فوجی ایکشن کے بعد فوج نے بنگالیوں کے ساتھ وہ رویہ اختیار کیا جو ایک فاتح اپنے مفتوح دشمن سے اختیار کرتا ہے جس کے نتیجے میں ردعمل بہت منفی اور منظم ہو گیا۔

☆ فوج جیسے قومی اور انتہائی منظم ادارے کو سیاسی لیڈروں کی کوتاہیوں اور منفی رویوں پر اس قدر شدید اور اجتماعی ردعمل ظاہر کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ فوج اور قوم ایک دوسرے کے مدمقابل آجائیں مگر ایسا ہوا۔

☆ مشرقی پاکستان میں موجود فوجی انتظامیہ اور افسروں کی حد سے بڑھتی ہوئی خوش فہمی اور طاقت کو مسئلے کا حل سمجھنے کی غلط سوچ سقوط ڈھاکہ کا حتمی سبب ثابت ہوئی۔

یہ خلاصہ کتاب کے متعلقہ باب سے اخذ کردہ ہے اگر اقتباسات دیئے جائیں تو کالم بہت پھیل جائے گا تاہم ایک دو حوالوں سے بات بہت حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے اس وقت کے حکمرانوں اور ان کے حواریوں نے بنگال کا مسئلہ کس طرح Tackle کیا یحییٰ خان کو مستقبل کا صدر بننے کی فکر لاحق تھی، بھٹو صاحب،

فوری طور پر اقتدار میں حصہ پانے کے خواہاں تھے۔ مشرقی پاکستان کے اس وقت کے فوجی کار یز داز نشہ قوت میں مبتلا تھے اور سول بیوروکریسی جلد سے جلد اپنے کندھوں سے بنگالیوں کا بوجھ اتارنے کو بے تاب تھی اگر مسئلے کا حل نکالنے کی حکمت عملی یہ ہوگی تو نتائج بھی سقوط ڈھاکہ کی صورت میں نکلیں گے ایک جگہ خرم صاحب لکھتے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں فوجی کاروائی نہ صرف نا انصافی پر مبنی تھی بلکہ بہت ظالمانہ اور غیر انسانی تھی اس میں وہ سارے کام ہو رہے تھے جو پچھلی صدی کی کوئی فاتح فوج کر سکتی تھی اس زمانے میں ہم جنرل فرمان علی اور دوسرے ذمہ دار لوگوں سے ایک بات کہا کرتے تھے اس عرصے میں امریکی سامراج سے آزادی حاصل کرنے والے ویت نامی گوریلوں کے علاقے ''مائی لائی'' سے منسوب ایک واقعہ تھا جس میں امریکی فوجیوں نے بلا جواز بے گناہ ویت نامی متحدیوں کو مار ڈالا تھا واقعے کی تشہیر کے بعد امریکہ نے ان افسروں کو فوج سے برطرف کر دیا تھا ان پر مقدمہ چلایا تھا اور ان کو سزا ہوئی تھی میں نے جنرل فرمان سے کہا آپ کے ہاں مائی لائی جیسے واقعات ہو رہے ہیں مگر حیرت ہے کہ آپ کی نظر میں ایک ہی واقعہ ایسا نہیں جس کا آپ اعتراف کریں۔ اور اس کے ذمہ دار فرد کو سزا دیں ...... میں آج بھی کہتا ہوں کہ ہمارے ہاں تمام نہیں بلکہ کچھ تفصیلات معلوم ہو جائیں تو لوگ حیرت کریں گے ایسے ہی پے در پے واقعات سے عام بنگالی آبادی خلاف ہوگئی تھی وہ نوجوان جو بالکل غیر سیاسی تھے وہ بھی آہستہ آہستہ مکتی باہنی میں شامل ہونے لگے۔'' (ص ۵۱۰)

ملک اور قوم میں بحران آتے رہتے ہیں یہ نہ انہونی بات ہے اور نہ بہت اضطراب انگیز، لیکن قیادت اگر کسی بحران سے اس طرح نمٹنے کہ سانپ تو مر جائے اور لاٹھی بچ جائے تو یہ حکمت کی اعلیٰ ترین صورت ہوتی ہے۔ سانپ مر جائے اور لاٹھی بھی ٹوٹ جائے اس صورت کو بھی قدرے قابل قبول کیا جاتا ہے مگر لاٹھی ٹوٹ جائے اور

سانپ بچ جائے یہ بڑی حماقت شمار ہوتی ہے ہمیں حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ اور ''لمحات'' کے مصنف کے تاثرات سے یہ اخذ کرنا چاہیے کہ بحران اگر درپیش ہو تو ہمیں ایسے مواقع پر نہ پرانی رنجشیں نکالنی چاہئیں نہ ذاتی مفادات کو ترجیح دینی چاہیے نہ منفی نفسیات اور ردعمل کا شکار ہونا چاہیے نہ طاقت کو مسئلے کے حل کی شہ کلید سمجھنی چاہیے اور نہ خوش فہمی کی چھتری اپنے اوپر تان لینی چاہیے اچھی حکمت عملی کے تین اجزاء بتائے جاتے ہیں اگر بحران درپیش ہو تو اس سے نبرد آزما ہونے کے لئے ضروری ہے کہ

☆ توقع بہترین نتائج کی رکھی جائے۔

☆ قناعت کمترین نتائج پر کی جائے۔

☆ تیاری بدترین اور نتائج کے لئے کی جائے۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے ہر بحران کے موقع پر کم وبیش تیاری کمترین سطح پر کی گئی توقع بہترین نتائج کی رکھی گئی اور قناعت بدترین نتائج پر کرنا پڑ گئی۔

ٹماٹر، انڈہ اور ڈنڈا

۲ جولائی کو منعقد ہونے والی آل پارٹیز کانفرنس (APC) کن محرکات کے تحت منعقد ہوئی؟ پسِ پردہ عوامل کیا تھے؟ اس کا پیش منظر کیا بنتا ہے؟

یہ باتیں سیاسی تجزیے کا موضوع ہیں، سر دست ہمارے پیش نظر کچھ دوسری باتیں ہیں مثلاً ہماری سیاسی اخلاقیات اب کس درجے پر آ گئی ہے؟ ہماری قوت برداشت کا کیا عالم ہے؟ اور کچھ لوگ اچانک کہیں سے نمودار ہو کر اپنے بھاڑے کے ٹٹو ہونے کا کس طرح تاثر دیتے ہیں؟

بہت سے قارئین نے ۴ جولائی جمعۃ المبارک کو مشاہدہ کیا ہو گا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پورا مال روڈ بینروں سے بھر گیا جن پر اے پی سی کے خلاف نعرے درج تھے۔ اور چشم زدن میں پچھلے پہر وہ سارے بینر اتر گئے، بنیر لگانے والے کون اور انہیں اتارنے والے کون تھے؟ یہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔

چند ہی روز میں تین تنظیمیں سامنے آ گئیں، ایک مُحبانِ پاکستان، دوسری پاکستان بچاؤ موومنٹ اور تیسری احتساب تحریک ان تینوں تنظیموں نے اے پی سی کے خلاف بینر لگائے اور خبریں چھپوانے کی مہم شروع کر دی اور کانفرنس کے روز متعدد رہنماؤں کی گاڑیوں پر ٹماٹر اور انڈے پھینکے۔ سیاسی دنیا میں جلسے، جلوس، مظاہرے یہ سب معمول کا حصہ ہیں لیکن شرط یہ ہوتی ہے کہ جلسے، جلوس اور مظاہرے کرنے والے

مجہول لوگ نہیں ہوتے معروف سیاسی ورکر ہوتے ہیں خواہ وہ کسی حکومت کے خلاف نکلیں یا کسی پارٹی کے مقابلے میں لیکن ہمارے ہاں ایک خاص قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو اچانک کھمبیوں کی طرح راتوں رات اگتے اور دن چڑھتے ہی دھند کی طرح چھٹ جاتے ہیں وہ اوران کی تنظیم کا نام نہ پہلے کسی کو معلوم ہوتا ہے اور نہ بعد میں ان کا سایہ تک کہیں نظر آتا ہے، خدا معلوم یہ سلمانی ٹوپی اوڑھ کر رہنے والے لوگ چھلاوے کی طرح کدھر سے نکلتے اور کہاں غائب ہو جاتے ہیں؟ یہ اخلاقی دیوالیہ پن کے شکار اور مریض لوگ ہوتے ہیں چاہیے انہیں کوئی تاجر تنظیم استعمال کر لے، کوئی سیاسی گروہ کرایہ پر لے آئے یا حکومت دیہاڑی دے کر ان سے کام لے لے یہ (Let me) قسم کی مخلوق بہت ارزاں نرخوں پر دستیاب ہوتی ہے ان کے سارے مظاہرے انتہائی مضحکہ خیز مناظر ہوتے ہیں نئے بننے والے وزیراعظم اور وزیراعلیٰ، گورنر اور وزیر میئر اور چیئرمین کے لئے خیر مقدمی بینروں کی بہار یہی لوگ سجاتے ہیں، اور کسی سربراہ یا افسر اعلیٰ کے دورہ شہر کے موقع پر خوش آمدید کے بینر بھی یہی مخلوق آویزاں کرتی ہے لیکن ایسے لوگوں کا شجرہ نسب آج تک معلوم نہی ہوسکا اب خود ہی اندازہ کر لیجئے" پاکستان بچاؤ موومنٹ نام کی کوئی تنظیم اس سے پہلے کسی نے سنی یا پڑھی؟ ہرگز نہیں یہ سیکنڈوں منٹوں میں اچانک جنم لینے والے "محبان پاکستان" کہاں سے ٹپک پڑے اور یہ پہلے کہاں تھے؟ کسی کو کچھ پتہ نہیں اور یہ "احتساب تحریک" کس مہینے کی کس تاریخ کو وجود میں آئی؟ قطعاً کسی کے نوٹس میں نہیں۔ یہ لوگ دراصل وہ ہیں جو رینٹ اے کار، شرنگ کے سامان اور ٹینٹ قناعت اور کراکری کی طرح کرائے پر ہیں خواہ وہ کاروردات کے لئے جا رہی ہو، شرنگ کا سامان چاہے قبرستان کی چاردیواری اور کمرے کی تعمیر کے لئے ہو یا ٹینٹ قناعت کسی کی قل خوانی کے لئے درکار ہوں اس سے ان چیزوں کو کوئی سروکار نہیں، مالک کو اپنے کاروبار سے دلچسپی ہوتی ہے، البتہ یہ

پاکستان کے ''محبان'' پاکستان کو ''بچانے والے'' اور ''احتساب'' کے حامی اتنے سیانے ضرور نکلے ہیں جیسا کہ اخبارات میں رپورٹ ہوا ہے کہ جب مولانا فضل الرحمٰن کی گاڑی آئی اور یہ فدائی آگے بڑھے تو ان کی نظر مولانا کے مسلح باڈی گارڈز پر پڑی تو ان کا سارا جوش و فورخاک و کافور ہو گیا۔

یہی صورت تحریک جعفریہ کے وفد کی آمد پر ہوئی، تاہم پروفیسر طاہر القادری کی تشریف آوری پہ یہ لوگ بالکل نارمل رہے۔ اس کا سبب پروفیسر صاحب کے کانفرنس سے بائیکاٹ کی شکل میں سامنے آیا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان ''یاجوج ماجوج'' حضرات کو اس کا مکمل ادراک رہا کہ ٹماٹر اور انڈا اپنا مگر فیصلہ کن چیز ڈنڈا ہے اس سے بچ کر رہنا ہے۔ گویا جس طرح قبائلی و جاگیرداری دور میں ڈنڈا سب سے طاقتور تھا آج اکیسویں صدی میں بھی اصل فوقیت اور حاکمیت ڈنڈے کو حاصل ہے۔ خواہ وہ کسی کے پاس ہو، ویسے میری تجویز ہے کہ حکومت کو انکوائری کرنی چاہیے کہ مہنگائی کے اس دور میں ٹماٹروں اور انڈوں کی اتنی بڑی مقدار ضائع کرنا کوئی شخص افورڈ نہیں کر سکتا۔ کیا یہ ساری رقم ان کی جیب سے نکلی یا کہیں سے فراہم کی گئی؟ اگر جیب سے نکلی ہے تو محکمہ انکم ٹیکس والوں کو ان سے فوراً رابطہ اور حساب کتاب کرنا چاہیے۔

آملے ہیں سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک

آل پارٹیز کانفرنس اپنے Display کے اعتبار سے بلاشبہ ایک ''گرینڈ شو'' تھا لیکن نتائج واثرات کے لحاظ سے اس کی کیا اہمیت ہے؟ اس کے لئے ''وقت'' ہی اس کا بہترین جواب ہے۔ کیا اس کے بطن سے کوئی نیا اتحاد وجود میں آئے گا؟ کیا اس سے حکومت کو اپنا ایجنڈا مختصر کر کے اپنے کام جلد نمٹانے پڑیں گے۔ کیا سیاسی منظر میں کوئی نئی صورت گری متوقع ہے؟ کیا مسلم لیگ اور پی پی پی کے اشتراکِ عمل کے امکانات بڑھے ہیں؟ کیا پی پی پی کے ساتھ مسلم لیگ کا سیاسی مصافحہ اگر معانقے کی طرف بڑھا تو مسلم لیگ اندرونی نظریاتی اور تنظیمی خلفشار کا شکار ہو جائے گی؟ اور کیا فوجی حکومت پی پی پی کے ساتھ کوئی معاملہ بندی کر کے اپنی قریبی حریف مسلم لیگ کو Defuse کرنے کی حکمتِ عملی اپنائے گی؟ یہ سارے ممکنہ سوالات ہیں، ان کا کوئی بھی حتمی جواب صرف اور صرف وقت کے پردے میں پوشیدہ ہے، اس وقت کسی نوع کی پیش گوئی شائد درست نہ ہو اور اس کا درجہ محض قیاس آرائی ہو، تاہم اس کانفرنس کے نتیجے میں دو باتیں تو ہو گئیں ایک نواب زادہ نصر اللہ خان نے ''بزم آرائی'' کا اپنا ریکارڈ قائم رکھا اور دوسرے مسلم لیگ ۱۲ اکتوبر کے بعد جس ''سیاسی تنہائی'' کا شکار تھی اس کے لئے یہ اے پی سی حبس کے موسم میں ہوا کا ایک جھونکا ثابت ہوئی خواہ گرم لو ہی سہی، لیکن جو چیز اس حوالے سے کہنے والی ہے وہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہماری سیاست

شروع دن سے واضح اور متعین مقصد سے محروم اور طے شدہ ایجنڈا سے خالی چلی آرہی ہے اگر کوئی چیز سیاسی جدو جہد کے لحاظ سے نمایاں ہے تو وہ صرف۔ حصولِ اقتدار ہے۔ ہر وقت اور ہر قیمت پر اقتدار مل جائے تو سارے پرانے عہد و پیمان اور نعرے گوشۂ افراموشی کی نذر ہو جاتے ہیں، اے پی سی کے کئی نکاتی اعلامیے کا حاصل اور خلاصہ ہے۔ بحالی جمہوریت۔ اس سے نہ اے پی سی کے شرکاء کو اختلاف ہے، نہ بائیکاٹ کرنے والوں کو، نہ غیر حاضر سیاسی جماعتوں کو اور نہ ہی موجودہ حکومت کو اگر یہ سچ ہے تو پھر اختلاف فکر و نظر اس قدر وسیع اور عمیق کیوں ہے؟ اس کا بدیہی سبب ہے کہ ہر ایک کا فلسفہ جمہوریت اپنا ہے۔ مسلم لیگ سمجھتی ہے کہ پارلیمنٹ بحال کر دی جائے اور ۱۲ اکتوبر سے پہلے کی پوزیشن واپس آجائے تو گویا جمہوریت بحال ہو گئی پی پی کا خیال ہے کہ نئے انتخاب فی الفور ہو جائیں (جن میں وہ کامیابی کا اپنے طور پر امکان سمجھتی ہے) تو اس کے نزدیک یہی بحالی جمہوریت ہے، جماعت اسلامی کا نقطہ نظر ہے کہ زور اور زر کی جمہوریت کے بجائے کسی اصول اور قدر کی بنیاد پر جمہوریت رائج ہو جائے تو وہی صحیح جمہوریت ہے اور حکومت کا گمان یہ ہے کہ سیاستدان محرومی اقتدار کی صورت میں جس جمہوریت کا قصیدہ پڑھتے اور ورد کرتے ہیں حکومت میں آتے ہی سب سے پہلے اسی کا گلا گھونٹتے اور گردن دبوچتے ہیں لہٰذا کچھ بنیادی اور ضروری اصلاحات کر کے جمہوریت بحال کی جائے حکومت کا موقف تو حکومت جانے اور اس کی وضاحت اس کے اپنے ترجمان کریں اور نیت بھی ہم ہر ایک کی اللہ پر چھوڑتے ہیں کہ وہی دلوں کے بھید جاننے والا اور عالم الغیب ہے، لیکن ظاہری کردار اور عمل کا جائزہ لینا، تجزیہ کرنا اور کوئی نتیجہ نکالنا بہر حال ہر ایک کے لئے جائز بھی ہے اور ضروری بھی، سرِ دست ہم اس موقف پر زیادہ بحث نہیں کرتے کہ جمہوریت فی الاصل کیا ہے؟ اس کے بنیادی تقاضے کیا ہیں؟ اس کی اخلاقیات کیا ہیں؟ اور کیا

ہمارے ہاں کی کسی بھی دور کی جمہوری حکومت ان اصول واخلاق پر پوری اتری ہے؟

ان نکات پر نہ اختلاف ہے اور نہ دوسری رائے اصل سوال تو ان پارٹیوں سے ہے جنہیں ایک سے زائد بار اقتدار میں آنے کا موقع ملا، آج مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی غیر مشروط جمہوریت کی بحالی کی بات کرتی ہیں اور بہت اونچے سُروں میں اس کا راگ الاپتی ہیں، کیا یہ باتیں ان کے منہ سے زیب دیتیں اوران کے کردار وعمل سے مناسبت رکھتی ہیں؟ جو آج حادثہ آج مسلم لیگ کو پیش آیا ہے اور جس بامِ بلند سے وہ گری ہے، یہی بجلی ۷۷ء میں پی پی کے آشیاں پر گر چکی ہے۔ گیارہ سال تک پیپلز پارٹی مسلسل جوگی اور سنیاسی بن کر صحراؤں کی خاک چھانتی رہی مگر جب ۸۸ء میں اسے اقتدار ملا کیا اس نے جمہوریت کی کچلی ہوئی روح پر مرہم رکھنے کی کوئی شعوری کوشش کی؟ ہم سب اور اے پی سی کے ''دولہا'' نواب زادہ نصر اللہ خان محترمہ بے نظیر سے پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ جب تو سیاسی تنہائی کا موسم تھا اور بہت سے سیاسی پنچھی اپنے اپنے آشیانے چھوڑ گئے تھے، مارشل لاء کے کوڑے تھے سندھ اور پنجاب کے گرم موسموں میں جلسے اور جلوس اور مظاہرے تھے تب تو نواب زادہ نصر اللہ صاحب کے بغیر سانس لینا بھی امر دشوار تھا مگر جب صدارتی الیکشن کا مرحلہ آیا تو پی پی کے امیدوار جناب غلام اسحاق خان ٹھہرے اس سے قطعِ نظر کہ وہ دراصل کسی کے امیدوار اور حمایت یافتہ تھے لیکن سوال تو پی پی کی سیاسی اخلاقیات کا ہے کہ اس وقت اس کا کیا طرزِ عمل تھا؟

پھر دوسرا مرحلہ آتا ہے کہ یہی غلام اسحاق خان پی پی حکومت کو رخصت کر کے اس کے محبوب ٹھہرتے ہیں اور خود بی بی بے نظیر نے پارلیمنٹ ہاؤس میں ''گو بابا'' کے نعرہ لگا کر اور ڈیسک پیٹ کر اپنا گلا بٹھا اور ہاتھ سرخ کر لئے تھے۔ مگر جب اس اسحاق خان نے نواز شریف حکومت توڑ دی تو بیگم صاحبہ لندن سے دوڑ کر ایوان صدر پہنچیں اور اپنے میاں کو نئی عبوری وزارت میں شامل کر کے نواز شریف اور اسحاق خان دونوں

سے انتقام لے لیا یہ بحالی جمہوریت تھی یا انتقامی سیاست؟ کیا گیارہ سال کی سیاسی چلہ کشی کا یہی اثر ظاہر ہوا۔؟

اب آتے ہی میاں صاحب کی طرف وہ ۹۰ء میں برسر اقتدار آئے وہ خدا کو حاضر ناظر جان کر انگلی رکھ کر بتائیں کہ وہ کون سی مثبت سیاسی اور جمہوری روایت تھی جسے انہوں نے قائم کیا ہوا آئی جے آئی کے اندر اور اپنے سیاسی مخالفین کے لئے باہر؟ ۹۳ء میں بی بی صاحبہ پھر اوپر آگئیں رہی سہی کسر دوسرے دور میں نکال دی اخبارات کی فائلیں اور واقعات کی کڑیاں اس کی گواہ ہیں مقدمے، انکوائریاں، گرفتاریاں سب کچھ عوام کے سامنے ہے، وقت نے پلٹا کھایا کہ مسلم لیگ کی حکومت اس کے اپنے صدر غلام اسحاق خاں نے توڑی اور پی پی گورنمنٹ اس کے صدر فاروق خاں لغاری نے تحلیل کی، کسی غیر سے کیا گلہ؟ خیر میاں صاحب پھر حکومت میں آئے، فروری ۹۷ء سے لے کر ۹۹ء تک کس طرح کی جمہوریت بحال رہی، یہ کسی تبصرے کی محتاج نہیں، احتساب بیورو، سیف الرحمٰن، ون مین شو، جماعت اسلامی پر بیہمانہ تشدد، سپریم کورٹ میں پھڈا، جہانگیر کرامت سے بگاڑ وغیرہ کیا میاں صاحب نے ۹۰ء اور ۹۳ء کے ادوار سے کوئی سبق لیا؟ ہرگز نہیں، آج پھر وہی نعرے ہیں وہی مطالبے ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ وہی شخصیتیں ہیں اور وہی جماعتیں، ٹھیک ہے، نعرے نہیں بدلے مگر شخصیتیں بھی تو نہیں بدلیں۔ اگر پہلے رویہ نہیں بدلا تو اب اس پر کیسے یقین آئے؟

نہ تم بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیسے اعتبار انقلاب آسماں کر لوں

اے پی سی نے سینہ چاکانِ چمن کو ملا تو دیا ہے مگر پہلے وہ اپنا گریبان رفو کریں پھر عوام کے دامن کی بخیہ گری کریں تب جا کر ''لمبی جمہوریت'' کے نعرے میں جان پڑے اور وعدے کی شان بڑھے گی۔

دو مستقل مزاج طبقے

مستقل مزاجی ویسے تو اچھی چیز ہے لیکن اُس ''خان صاحب'' جیسی نہ ہو جب
ان سے ایک بار پوچھا گیا جناب آپ کی عمر کتنی ہے؟ تو فرمایا چالیس سال! کوئی بیس
سال بعد جب بھری محفل میں پھر ان سے سوال کیا گیا خاں صاحب آپ کی عمر کتنی ہے وہ
تڑاخ سے بولے چالیس سال پوچھنے والے نے حیرت سے کہا آپ نے بیس سال پہلے
بھی اتنی عمر بتائی تھی خان صاحب بولے ''خو چہ مرد کا بچہ ہے جو منہ سے نکل گیا سو نکل گیا''
کچھ ایسی ہی مستقل مزاجی کا مظاہرہ ہمارے ہاں طبقے مسلسل کرتے چلے آ
رہے ہیں ایک ہمارے سیاستدان اور دوسرے عوام، رنگ اگر سیاستدانوں نے نہیں
بدلا تو ماشاء اللہ اپنا ڈھنگ عوام نے بھی نہیں بدلا، شائد ہی کوئی اہل قلم شاعر اور خطیب
ہوگا جس نے اپنا سارا اسلوب نثر، قرینۂ سخن اور زورِ بیان اس پر صرف نہ کیا ہو کہ خدا
کے بندو جنہیں تم رہبر بناتے ہو پلٹ کر دیکھو تو یہی کمین گاہ میں بیٹھے نظر آتے ہیں،
جنہیں تم امیدوں کا چراغ سمجھتے ہو تمہارے مقدر کی تاریکیاں انہی کے دم سے ہیں
جنہیں تم کندھوں پر بٹھاتے ہو تمہیں اندھے کنوؤں میں یہی گراتے ہیں جنہیں تم
آزادی کا نشان سمجھتے ہو یہی تمہاری بربادی کا عنوان ہے یہ صبا نہیں صرصر ہیں یہ ضیاء
نہیں ظلمت ہیں یہ دمساز نہیں دغا باز ہیں، یہ سرفروش نہیں وطن فروش ہیں اور یہ
ارباب سیاست نہیں بندگان تجارت ہیں مگر کیا مجال کہ ہمارے سیاسی رہنماؤں کی

پیشانی پر کبھی قطرۂ عرقِ ندامت اُبھرا ہو یا ہمارے عوام کو متاعِ کارواں لٹنے پر کبھی
احساس زیاں ہوا ہو اور تو اور حکمرانوں نے اپوزیشن کا شجرہ نسب کھنگال ڈالا اور
اپوزیشن نے حکمرانوں کی سات پشتیں کھود ڈالیں گویا یہ دونوں ایک دوسرے کے ''
سلطانی گواہ'' ٹھہرے پھر بھی مستقبل مزاج عوام نے نہ اپنا قبلہ بدلا اور نہ رخ بدلا ،
کوچہ سیاست میں کیا کیا قیامتیں نہیں اٹھیں حتیٰ کہ مردے تک قبروں سے نکل آئے۔
مگر آفرین ہے عوام کی جبین نیاز پر، کہ جہاں دھری تھی دھری رہ گی، نوشکی سے کراچی
اور کراچی سے خیبر تک جتنے بھی امامان سیاست ہیں سب کے احوال واطوار پر نثر میں
کتابوں کے انبار اور شاعری میں بیاضوں کی بھر مار نظر آتی ہے، کس کا شجرہ نسب کہاں
جاملتا ہے؟ کس کا رقبہ کس کا عطیہ ہے؟ کس کی سیاست کس کس کی عنایت ہے؟ اور کس
کی شان کس کی داں ہے؟ سب پر لکھا گیا اور سب کچھ لکھا گیا مگر حضرت میراب بھی
مصر ہیں کہ وہ دوا اسی عطار کے لڑکے سے لیں گے جو ان کی بیماری کا اصل موجب ہے
،صحافیوں، دانشوروں، شاعروں اور خطیبوں نے کس کس عبا کو نہیں کھولا، کس کس قبا کو
نہیں اتارا، کون کون سا بخیہ نہیں ادھیڑا؟ کون کون سا نقاب نہیں سرکایا؟ اور کس دستار
کے پیچ وخم اور کلاہ کے نشیب وفراز پر مضمون نہیں باندھا؟ مگر نہ حسن کے تیور بدلے ہیں
اور نہ حُسنِ نظر کے قرینے، لیڈروں کی پختہ مزاجی اگر زندہ باد کی حقدار ہے تو عوام کی
آشفتہ سری مبارک باد کی مستحق ہے، ایک نے طے کر رکھا ہے کہ وہ بالا خانوں میں
رہے گا اور دوسرے نے قسم کھائی ہوئی ہے کہ وہ اسے ایوانوں میں پہنچا کر رہے گا۔
بلوچوں کو پتہ ہے کہ ان کے سردار کیسے اور کیوں کر بنے ہیں؟ سندھ کے ہاریوں کو
خوب معلوم ہے کہ ان کے وڈیروں کی جاگیر کہاں سے آئی ہے؟ پنجابیوں کو بھی خبر ہے
کہ یہاں کے چوہدری کب سے اور کس سبب سے چوہدری بنے ہیں؟ اور پختونوں کو
بھی علم ہے کہ ان کے خوان کی طاقت اور دولت کا سرچشمہ کہاں سے پھوٹتا ہے؟ اس

سب کے باوجود بلوچ اپنے سردار کا وفادار ہے، ہاری وڈیرے کا حواری ہے، پنجابی چوہدری کی ہم رکابی کرتا ہے، اور پختون خود کو خواتین کا ممنون سمجھتا ہے اہل دانش عوام کو بتا بتا کر تھک گئے ہیں کہ اسی خطے میں جب سرفروشوں کے لئے دار و رسن قائم تھا ان خان زادوں کو جاگیریں الاٹ ہو رہی تھیں اور جب آہنی زنجیریں صلۂ سیاست بنی ہوئی تھیں یہ لوگ قیادت و سیادت کے تمغے سینوں پر سجائے پھر رہے تھے۔ آخر کیا سبب ہے کہ فرنگیوں کے دور میں اگر ان کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں تو اب بھی ان کا سر کڑاہی میں ہے؟ برصغیر کا منظر بدل گیا مگر ان کا "گھن چکر" اور عوام کا مقدر نہیں بدلا، دل کے جلے پھپھولے پھوڑنے کے لئے اور عوام کی سوچ موڑنے کے لئے شورس کاشمیری مرحوم کے چند اشعار حاضر ہیں جو انہوں نے ۱۹۸۵ء کے سیاسی پس منظر میں کہے تھے۔

ہر راہ نما کے لئے پرچم ہی کفن ہے
مل جائے وزارت یہی موقف یہی فن ہے
ہر دل میں سمائی ہوئی اپنی ہی لگن ہے
کچھ قوم سے مطلب ہے نہ کچھ فکرِ وطن سے
تولہ کی طرح ہیں کبھی ماشے کی طرح ہیں
ہر چند گنہ گار کے لاشے کی طرح ہیں
پانی کے کٹورے میں بتاشے کی طرح ہیں
جتنے بھی ہیں یہ لیڈر تماشے کی طرح ہیں
اب کیسے کہوں کس سے کہوں کون ہیں کیا ہیں
بازار میں بیٹھی ہوئی کسبی کی حیاء ہیں

بادشاہی آرڈیننس

جب سے موجودہ حکومت برسر اقتدار آئی ہے قطعِ نظر اس سے کہ وہ کیسے برسر اقتدار آئی ہے ہم انہی کالموں کے ذریعے برابر گزارش کرتے چلے آرہے ہیں کہ عوام کو آم کھانے سے غرض ہے یا پیڑ گننے سے۔ چونکہ یہ حکومت ایک ایسی حکومت کو ختم کر کے آئی ہے جس نے عوام کی آرزوں کا بہت خون کیا اور تمناؤں کو راکھ بنایا تھا، اس لئے آئینی وقانونی رموز ونکات سے ہٹ کر لوگوں نے اس کا خیر مقدم کیا چنانچہ ہم نے بارہا گزارش کی کہ اگر سیاست سے واقعی گند صاف اور نئی اور مثبت روایات قائم کرنے کا موقع ہاتھ آیا ہے تو اس کے لئے شرط اول یہ ہے کہ جنرل صاحب ہر فیصلہ اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر کریں خواہ وہ ان کے خلاف ہی کیوں نہ جاتا ہوتا کہ آئندہ کوئی حکمران اپنی ذات کو سامنے رکھ کر فیصلہ نہ کرے اور اگر ایسا کریگا تو چاروں طرف سے اس پر نفرت وحقارت کے پتھر پڑیں گے۔ مگر ۹ اگست ۲۰۰۰ء کو جاری ہونے والے آرڈی ننس نے ہمارے نیک جذبے پر اوس ڈال دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ سزا یافتہ شخص سرکاری عہدے کے ساتھ ساتھ پارٹی عہدے سے بھی محروم قرار پائے گا یہ آرڈی ننس اگرچہ ایک ایسی شخصیت کے نام پر جاری ہوا ہے جو وفاق کی عدالت اور انقلاب کے بعد بچ جانے والی آخری منتخب شخصیت ہے مگر یہ عوامی یا صدارتی نہیں سراسر "نادرشاہی آرڈی ننس" ہے، صاف بات ہے عزیز اے منشی، جاوید جبار، گورنر صفدر یا کوئی حکومتی ترجمان لاکھ باتیں بنائیں، قانونی نکتے نکالیں، آئین کی دفعہ ۶۲، ۶۳،

کے حوالے دیں اور اسے عوامی امنگوں کا مظہر بتائیں، یہ آرڈی ننس جنرل صاحب کی اس خواہش اور ترجیح کا عکاس ہے جو گاہے بگاہے اخبارات کے ذریعے عوام تک پہنچتی رہتی ہے کہ میں قوم اور حکومت کو دوبارہ بے نظیر اور نواز شریف کے حوالے نہیں کروں گا۔

مجھ جیسے لاکھوں کروڑوں لوگ کب چاہتے ہیں کہ موصوفہ اور موصوف ضرور باری باری ہمارے مقدر سے کھیلیں، ہم بلاشبہ سول حکومت کے قائل اور مداح ہیں بشرطیکہ وہ ''سویلائزڈ'' ہو لیکن بے نظیر اور نواز شریف کو آرڈی ننس کے ذریعے سیاسی عہدوں سے محروم کرنا کسی وقتی تسکین کا باعث تو ہوسکتا ہے دوررس حوالے سے اس کی کوئی افادیت نہیں میں جو مثال دینے لگا ہوں اس کا مطلب شخصیات میں مماثلت نہیں بلکہ صورت واقعہ کی تشریح ہے مثلاً گاندھی کانگریس کے کیا تھے؟ صدر نائب صدر؟ جنرل سیکرٹری؟ کچھ بھی نہیں مگر پوری کانگریس پر ان کی چھاپ تھی ۔ ۷۷ء کی پی این اے کی انتخابی مہم اور تحریک میں اصغر خاں کے پاس کوئی پارٹی عہدہ نہیں تھا یعنی وہ پی این اے کے صدر اور سیکرٹری وغیرہ نہیں تھے بلکہ واقفانِ راز جانتے ہیں کہ بھٹو صاحب نے اپنے ذرائع استعمال کر کے ائیر مارشل کو پی این اے کا صدر نہیں بننے دیا۔ مگر عوام آج بھی گواہ ہیں کہ عوامی کشش اور مقبولیت میں خان صاحب سرفہرست تھے اسی طرح بے نظیر یا نواز شریف فنی طور پر پی پی پی اور مسلم لیگ کے سربراہ نہ بھی رہیں مگر لوگوں پر ان کا اثر اور وزن ان کے ساتھ رہے تو یہ آرڈی ننس زیادہ سے زیادہ انہیں حکومتی عہدے سے محروم کرے گا عوامی مقبولیت اور پارٹی پر گرفت تو اپنی جگہ موجود رہے گی یہ آرڈی ننس خالصتاً بیوروکریٹک تھنکنگ کا عکس ہے، بیوروکریسی اس معاملہ میں لکیر کی فقیر واقع ہوئی ہے اس کے نزدیک جلسہ منتشر کرنا، کسی اجتماع کو روکنا، برف کے گولوں اور قلفیوں پر قدغن لگانا اور سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کو BNA کرنا ایک جیسے کام ہیں یعنی ایک انتظامی آرڈر اور بس، اللہ اللہ خیر صلا بیوروکریسی کے نزدیک جس طرح افسر

بالا کے ایک حکم سے تقرری، تبادلہ، ترقی اور تنزلی ہو جاتی ہے اس طرح وہ سمجھتے ہیں کہ ایک آرڈی ننس کے ذریعے کسی شخص کو عوامی لیڈر بنایا جا سکتا ہے اور کسی کو عوامی حیثیت سے محروم کیا جا سکتا ہے اس سوچ کو بوالعجمی نہیں تو سادہ لوحی ضرور کہا جائے گا، لیڈر ہو یا بنا دیا گیا ہو بہر حال یہ عمل دو دنوں میں نہیں ہوتا، محترمہ بے نظیر کو تو بھٹو صاحب کی وراثت اور مظلومیت نے لیڈر بنا دیا، مگر میاں صاحب تو خیر سے مدتوں آرائش و نمائش سے گزر کر اور سرکاری میک اپ روم سے بن سنور کر باہر نکلے ہیں اور پھر عوام نے بھی انہیں ذہنی طور پر قبول کر لیا، اب انہیں الگ کرنے کے لئے ایک حکم انتظامی کافی نہیں، جنرل ضیاء الحق نے اپنی عمر انہیں لگا دی تھی وہ چاہتے تو انہیں وزیراعظم بنا دیتے لیکن انہیں بھی معلوم تھا کہ ابھی لیل و نہار کی بہت سی گردشیں پڑی ہیں اور کچھ مرحلے ابھی قابل عبور ہیں ۔ ظاہر ہے بنانے میں وقت صرف ہوا ہے تو ہٹانے میں بھی کچھ دیر چاہیے ۔ ہیلی کاپٹر کیس، کرین آپریشن اور حالیہ آرڈیننس میاں نواز شریف کی سیاسی عمر بڑھانے کا باعث بنے ہیں اور عوام کو ان کے قریب کرنے کا سبب، ہماری تو ایک ہی تجویز ہے اس پر جنرل صاحب آج عمل کر دیں اگر محترمہ اور محترم دونوں ہمیشہ کے لئے عوام کی نظروں سے نہ گر جائیں تو ہم کالے چور کی سزا بھگتنے کو تیار ہیں اور وہ تجویز یہ ہے کہ جو کچھ بیگم صاحبہ اور بابو صاحب نے عوام کے ساتھ کیا ہے جنرل صاحب اس کا ازالہ کر دیں لوگ سب لیڈر وڈیڈر بھول جائیں گے اور کرنے کا کام کیا ہے؟

- ☆ جنرل صاحب پولیس کو ''نتھ'' ڈال دیں
- ☆ ضروریات زندگی کی اشیاء سستی کر دیں (چینی، دال، آٹا، گھی)
- ☆ بجلی، گیس، پانی، فون جیسے یوٹیلٹی بلز کم کر دیں
- ☆ ٹرانسپورٹ کے کرائے عوام کی پہنچ تک لے آئیں
- ☆ عدالتی اور کچہری کے نظام کو ہنگامی بنیادوں پر درست کر دیں۔

اے شمع تجھ پر رات یہ بھاری ہے جس طرح

زندگی کے اتار چڑھاؤ، حالات کے نشیب و فراز اور زمانے کے الٹ پھیر پر گہری نگاہ رکھنے والوں نے درست کہا ہے

دشمن مرے تے خوشی نہ کریئے سجناں وی مر جانا ہو

یہ اصول بالکل صحیح ہے، ورنہ رسمِ دنیا یہی ہے کہ وہ دو مواقع پر اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکتی، ایک فتح میں اور دوسرے شکست میں، خوشی اور رنج کے دونوں لمحے لوگوں کو بے خود کر دیتے ہیں جیتنے والوں کے لئے بغلیں اور شادیانے بجانا اور ہارنے والوں کے کفن اتارنا، خوش ہونے والوں کے ساتھ مل کر قہقہے مارنا اور پھنس جانے والوں کی لاش پر گدھ بن کر جھپٹے مارنا، ظاہر ہے یہ موقع پرستی اور کینہ پروری کی دلیل ہے لیکن کچھ مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ انسان از راہ نصیحت اور عبرت اپنا ردِّ عمل ظاہر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آج کل میاں برادران، سیف الرحمٰن، امین اللہ چوہدری اور رانا مقبول پر سخت افتاد ہے، ان لوگوں سے ہماری کیا دوستی اور کیا دشمنی؟ کہاں ہم جیسے خاک بسر اور کہاں یہ وارثانِ دارا و سکندر؟ دشمن ہونے کے لئے بھی برابر نہیں تو کم از کم انیس بیس تو ضرور ہونا چاہیے، سو وہ بھی ہم نہیں، لیکن ان کے نالہ و شیون سن کر ضرور لب پہ آتا ہے۔

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے

میاں نواز شریف نے پہلی پیشی کے موقع پر فرمایا "میں بد بودار پانی پینے پر مجبور ہوں میرا کمرہ 8x10 کا ہے۔"

میاں شہباز شریف نے کہا ہے "میری کمر میں درد ہے مجھے لانگ واک اور سوئمنگ کا موقع نہیں دیا جارہا اور میرے باتھ روم میں سخت بد بو ہے۔"

رانا مقبول نے عدالت سے روتے ہوئے کہا "مجھے اپنی ماں سے ملنے دیا جائے۔" امین اللہ چوہدری چیخ اٹھے "مجھ پر سخت دباؤ ہے یا تو میں وعدہ معاف گواہ بن جاؤں گا یا پھر خود کشی کر لوں گا۔"

یہ جذباتی باتیں جانگیہ پہن کر کھیلنے والے بچوں اور کوڑیوں اور بنٹوں سے دل بہلانے والے معصوموں کی نہیں بلکہ ان میں ایک دو بار وزیر اعظم بننے والے، دوسرے وزیر اعلیٰ پنجاب تیسرے آئی جی پولیس اور چوتھے ڈی جی سول ایوی ایشن ہیں۔

اللہ برا وقت کسی کو نہ دکھائے لیکن یہ باتیں پڑھ کر بے اختیار زبان سے نکلا

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

جس پانی کو بد بودار کہا جارہا ہے پانی بد بودار نہیں میاں صاحب کے نتھنے پہلی بار اس سے آشنا ہوئے ہیں، ورنہ عوام تو صدیوں اور برسوں سے یہی عام پانی پی رہے ہیں، ٹینکوں، حوضوں، جوہڑوں، نلکوں، کنوؤں اور نہروں کا پانی، کروڑوں لوگوں کو اس سے بد بو نہیں آتی، بد بو صرف انہیں محسوس ہوتی ہے جو امپورٹڈ منرل واٹر پیتے ہیں جن کی صبح کا آغاز سیب کے جوس سے ہوتا ہے جن کے ناشتے، ظہرانے، عصرانے اور عشائیے میں تازہ پھلوں کا رس لازمی جزو ہوتا ہے جن کا مشام اور حلق انگور، سیب، آم، چیری، پیچی، مالٹے، اور سٹرابری کی خوشبو اور ذائقے سے بسا ہوا ہو، وہ بے رنگ، بے بو، اور بے ذائقہ پانی سے بد مزہ کیوں نہ ہوں گے؟

بڑے میاں صاحب کو یہ بھی گلا ہے کہ انہیں 8x10 کے کمرے میں رکھا گیا ہے یہ گلہ بھی بجا ہے کہ کہاں آدھا اسلام آباد پر محیط وزیر اعظم ہاؤس اور کہاں یہ کمرہ؟ اور کہاں ساٹھ ایکڑ کا رائیونڈ کا بنگلہ اور کہاں یہ ڈربہ؟ گھٹن تو ضرور ہوتی ہو گی لیکن انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ غنیمت ہے انہیں اکیلے یہ کمرہ میسر ہے جب کہ پاکستان میں لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو اس طرح کے کمرے میں پورے خاندان سمیت رہنے پر مجبور ہیں، جوان بچے بچیوں کے ساتھ، میاں صاحب نے تو جیل پہلی بار دیکھی ہے ان کی ''رعایا'' تو نسلوں سے ایسی جیلوں کے ساتھ مانوس ہے۔ میاں شہباز شریف کمر درد کا رونا روتے ہیں انہیں خبر نہیں کہ عوام کیکمر تو ٹوٹی ہوئی ہے۔ افسروں کے ظلم مہنگائی، بیروزگاری اور بیماری سے، غنیمت ہے کہ میاں شہباز شریف کو صرف کمر کا درد ملا ہے کاش انہیں دردِ دل ہوتا؟ تو اتنی سی بات کا رونا نہ روتے۔ یہ بھی کوئی تکلیف ہے لاکھوں ایڑیاں رگڑنے، خون کی الٹیاں کرنے، درد کی انگڑائیاں لینے، شدت غم سے کروٹ بدلنے اور رات بھر تڑپنے پر مجبور ہیں صرف اس نظام کے باعث جس نے ہر ایک کو باؤلا اور کاٹ کھانے والا بنا رکھا ہے رانا مقبول کو اس کڑے وقت میں ماں کی یاد آئی ہے ماں کا وجود ہر ایک کیلئے بسا غنیمت بلکہ الٰہی نعمت ہے، لیکن انہی کے دور میں اور ہزاروں مائیں ہوں گی جن کی بانہیں اپنے بیٹوں کے لئے تڑپتی ہوں گی جنہیں رانا صاحب نے جرم بے گناہی میں پکڑ کر جیل میں ڈال رکھا ہو گا اور ہزاروں جوان ماں کی گود کے لئے مچلتے ہوں گے جو پولیس کی سکھا شاہی کے باعث بلاوجہ حوالات کی نذر ہوتے ہیں۔

امین اللہ چوہدری خودکشی کی دھمکی دے رہے ہیں، حالانکہ ایسے ہی معاشی و معاشرتی دباؤ کے باعث سینکڑوں عورتیں اور مرد اور جوان خودکشی کر رہے ہیں اور کر چکے ہیں ان کا خون کس کے سر ہو گا؟ کاش یہ سارے لوگ ''عرشی مخلوق'' بن کر نہ

رہتے تو آج فرش پر انہیں کوئی تکلیف نہ ہوتی، یہ ایسے ہی رہتے جیسے عوام رہتے ہیں یہ وہی کچھ کھاتے جو عوام کھاتے ہیں یہ وہی پہنتے جو عوام پہنتے ہیں اور وہی پیتے ہیں جو انہیں نہ کمرے کی تنگی ستاتی نہ کھانا بدہضمی کرتا، نہ انہیں گرمی اور سردی لگتی اور نہ پانی سے ''ہمک'' آتی سیف الرحمان نے کہا کہ بکتر بند گاڑی کا دروازہ کھلا رکھا جائے پہلی بار اس میں بیٹھا ہوں گرمی لگتی ہے کوئی پوچھے تو کیا گاڑی کے اندر چلچلاتی دھوپ میں ہل چلانے، گڈ کھینچنے، روڑے کوٹنے، اینٹیں اٹھانے، گندم کی کٹائی کرنے، بھٹی میں لوہا پگھلانے اور میلوں پیدل چلنے سے بھی زیادہ گرمی ہوتی ہے؟ اور یہ کام لاکھوں لوگ مئی جون میں کرتے ہیں جب کہ یہ باتیں نومبر کے آخر میں کہی جا رہی ہیں۔ جب لوگ لحاف لینے لگے ہیں ہے نا نازک اندامی اور زخموں پر نمک پاشی!

اگر یہ سارے لوگ انصاف اور احسان سے حکومت کرتے تو انہیں بھی حضرت عمرؓ کی طرح دھوپ میں درخت کے نیچے اینٹ کا سرہانہ رکھ کر سونے میں کوئی عار نہ ہوتی اور نہ نیند میں خلل پڑتا، عمرؓ بھی کوئی ساربان نہیں تھے ان کی طرح اور ان سے بڑے ملک کے حکمران تھے، مگر

؎ نصیب اپنا اپنا ، مقام اپنا اپنا

بیا کہ دامنِ اقبالؔ را بدست آریم

رواں صدی کے دوران مشرق میں بے پناہ مقبولیت، بے اندازہ محبوبیت اور بہت زیادہ عقیدت جن لوگوں کو ملی ہے ان میں علامہ اقبالؒ سرفہرست ہے، بے شمار مضامین و مقالات، سینکڑوں کتابیں اور ہزاروں نظمیں، اقبالؒ کے ذکر اور نام سے مزین ہیں۔ مراکو سے انڈونیشیا، دہلی سے لندن اور چین سے امریکہ تک اقبالؒ کے حوالے سے کئی سیمینار منعقد ہوئے اور مجلسیں برپا ہوئیں، دنیا کی تمام معروف زبانوں اور یونیورسٹیوں میں اقبالؒ پر کام ہو رہے ہیں اقبالؒ کی ایک ایک بات کو اربابِ نظر اور اصحابِ ذوق نے سوغات سمجھ کر اپنایا اور بانٹا ہے، کتنے خوبصورت القاب ہیں جو وقف اقبالؒ ہوئے ''وہ حکیم الامت'' کہلائے، انہیں ''فیلسوفِ مشرق'' کہا گیا ''دانائے راز'' کے نام سے پکارے گئے انہیں ''مصورِ پاکستان'' ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور ''ترجمانِ حقیقت'' جیسا باوقار لقب انہیں دیا گیا، یہ ساری قبائیں ان کی قامتِ زیبا پر راست آتی ہیں کتنا اچھا ہوگا کہ آج کی محبت میں اقبالؒ کا تعارف خود ان کے اپنے افکار و احساسات اور الفاظ و خیالات کے ذریعے حاصل کیا جائے، اقبالؒ نے جو کچھ اپنے بارے میں کہا اور اپنے محسوسات کو الفاظ کا جامہ پہنایا، درحقیقت یہ سب کچھ ''در مدح خود'' بلکہ وہ اپنی قوم کو اور بالخصوص ملتِ اسلامیہ کو ایسا دیکھنا چاہتے ہیں تاہم اس سے اقبالؒ کے بلند فکری افق اور ان کے تجزیاتی عمق کا اندزہ ہوتا ہے، اقبالؒ کی

خواہش ہے کہ مسلمان فرشِ خاک پر رہ کر بھی وسعتِ افلاک سے ہمکنار رہیں۔

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہرِ ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

اقبالؒ نے یہ ساری باتیں اگر چہ ذاتی حوالے سے کی ہیں، لیکن وہ اس عکس میں اہلِ اسلام کو اتارنا چاہتے ہیں۔

زیارت گاہِ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا راز الوندی

اقبالؒ اپنے حوالے سے اپنے کلام میں یہ خواہش پالتے نظر آتے ہیں کہ اسلامیانِ عالم مکانی بن کر نہ رہ جائیں بلکہ لامکانی ہو جائیں کہ یہ معراجِ انسانیت ہے۔

مرے گلو میں ہے اک نغمہ جبرائیل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لا مکاں کے لئے

اسلامیان عالم دنیا پر راز خودی فاش کر دیں کہ یہی ''سر حیات'' ہے

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک وہی کاسہ وہی آش
حلاّج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اک مرد قلندر نے کیا رازِ خودی فاش

اسلامیان عالم اپنے اوپر خانقاہی پیوست کا لیپ نہ چڑھائیں بلکہ فکری تازگی کی روایت قائم کریں۔

ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبالؔ
کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ

اسلامیان عالم دریوزہ گری چھوڑ کر بے نیازی کو شعار بنائیں تا کہ بزمِ عالم

میں عزت پائیں۔

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی

کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

اسلامیان عالم دنیا کو اللہ کی آخری کتاب اور صحیفہ انقلاب قرآن حکیم کے حیات آفرین پیغام سے آگاہ کریں۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا

کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر

اسلامیان عالم شرق وغرب سیاہ اور سفید، نسل اور رنگ، زبان اور وطن کے چکر میں نہ پڑیں۔

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی ہے

گھر میرا ہے دلی نہ صفا ہاں نہ سمر قند

اسلامیان عالم محض ماضی کی روایت اور حال کی جدت کے غلام بن کر نہ رہیں ، بلکہ فریضہ شہادت حق ادا کریں۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق

نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اسلامیان عالم القاب وخطابات کے فریب سے باہر نکل کر غیرتِ فقر اور وسعتِ فکر کے پیکر بنیں۔

نہ شیخ شہر، نہ شاعر، نہ خرقہ پوش اقبال

فقیرِ راہ نشین است و دل غنی دارد

اسلامیان عالم ظاہری شکل وصورت کی بجائے حقیقی دانش وحکمت کے حامل بنیں، روحانیت چہرے کا نہیں رویے کا نام ہے۔

بیا بہ مجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

یہی بات ایک دوسرے اسلوب میں کہی گئی ہے یعنی گدڑی اور ٹوپی سے درویشی نہیں ملتی،فکروعمل اس کے لوازم ہیں۔

اقبال قبا پوشد در کار جہاں کوشد
دریاب کہ درویشی در ولق وکلا ہے نیست

اسلامیان عالم کو سارا انحصار عقلِ خود بین پر نہیں بلکہ عشق خدا بیں پر کرنا چاہیے،عقل چراغِ راہ اور عشق سُراغ منزل ہے۔

مقام عقل سے آساں گزر گیا اقبال
مقام شوق میں کھویا گیا ہے فرزانہ

اسلامیان عالم کچھ خود ہمت کریں اور کچھ خدا سے معاونت مانگیں تو ان کی پرواز لولا کی ہوسکتی ہے۔

اگر یک جرعہ خوں داری ، اگر مشتِ پرداری
بیامن باتو آموزم ، طریقِ شاہبازی را

اسلامیان عالم حالات حاضرہ کے مایوس نہ ہوں، پردہ غیب میں چھپی صلاحیتوں اور آنے والی نسلوں سے خوش گمانی رکھیں، جو آج کی تاریکی کو کل کی تابنا کی میں بدل سکتی ہیں۔

مرے حلقہ سخن میں ابھی زیر تربیت ہیں
وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسم کجکلا ہی

یہ ساری باتیں بجا لیکن اقبالؒ کو یہ بھی خدشہ ہے کہ کہیں یہ ساری باتیں سر سے اوپر نہ گزر جائیں اور یہ محض شاعرانہ استعارے اور فلسفیانہ اشارے سمجھ کر نظر انداز

نہ کردی جائیں۔ اس لئے وہ حضور رسالت مآب ﷺ میں عرض گزار ہیں

من اے میرِ اُممؐ داد از تو خواہم
مرا یاراں غزلخوانے شمروند

اقبالؒ بے تکلفی سے یہ بھی کہہ ڈالتے ہیں غالباً ان پر یہ کشف ہوا تھا کہ ہم آگے چل کر ان کے کلام سے کیا سلوک کرنے والے ہیں۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

خُمار اور غُبار

ہم جب کسی کو چاہتے ہیں تو خمار میں چاہتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں تو غبار میں دیکھتے ہیں اور ہمیشہ غلط نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ حالانکہ خمار اترتے اور غبار چھٹتے بہت زیادہ دیر نہیں لگتی، ہم اگر ذرا انتظار کر لیں تو سارے خدوخال بخوبی واضح ہو جاتے ہیں۔

نہ ہمیں کسی کو ہیرو بنانے میں دیر لگتی ہے اور نہ اُسے زیرو کرنے میں، یہ ہمارے سراسر داخلی اور تمام تر موضوعی مزاج اور اندازِ فکر کا شاخسانہ ہے، ہم نے یو این او میں بھٹو صاحب کی ایک تقریر سن کر انہیں ہیرو بنا لیا اور نتیجہ بھی دیکھ لیا، ضیاء الحق ہمارا سرمہ چشم صرف اس لئے بن گئے کہ انہوں نے بھٹو کا تختہ الٹ دیا، میاں نواز شریف محض پی پی دشمنی کا سمبل بن کر ہمارے ہیرو ٹھہرے۔ جنرل پرویز مشرف بھی آن کی آن میں ہیرو بن گئے کہ انہوں نے اس آدمی کو معزول کر دیا جس کا چہرہ دیکھ دیکھ کر ہم بوجوہ اکتا چکے تھے، لیکن برسوں میں نہیں دنوں میں یہ خمار اُترا اور غبار دھل جاتا ہے اور ہم ''مرثیہ نگاری'' یا ''ہجو گوئی'' پر اتر آتے ہیں اگر ہم ماضی کا جائزہ لیں تو ہم نے اپنے لیڈر اسی جذبے کے تحت چنے یا مسترد کئے، ہم نے بعض لوگوں کو آناً فاناً اہم عہدے سونپ دیئے کہ ان کی ایک ادا نے ہمیں مسحور کر دیا تھا ہم نے ایک ہی جنبشِ لب سے بعض لوگوں کو برطرف کر دیا، یا نظر انداز کر دیا کہ ان کی کوئی حرکت ہمیں خوش نہ آئی۔ یہ سراسر جذباتیت ہے جس کا ہم نصف صدی سے شکار چلے آرہے ہیں۔ بھٹو صاحب نے چشم زدن میں ضیاء الحق کو چیف آف آرمی سٹاف بنا دیا کہ انہیں موصوف کا سلام

کرنے کا انداز پسند آ گیا تھا، اپنی پارٹی کے بانی سیکرٹری جنرل اور سینٹر وفاقی وزیر جے اے رحیم کو کھڑے کھڑے فارغ کر دیا کہ ان کا ایک جملہ اور تبصرہ بھٹو صاحب کو ناگوارِ خاطر گزرا تھا، ضیاء الحق مرحوم نے جونیجو صاحب کو اس لئے وزیر اعظم بنا دیا کہ پیر پگاڑا کی ضد تھی اور جنرل صاحب ان کی دل شکنی نہیں چاہتے تھے۔ جونیجو نے صاحبزادہ یعقوب خان کو وزارت خارجہ کے منصب سے اس لئے الگ کر دیا کہ انہوں نے وزارت خارجہ کے دورے کے موقع پر صدر دروازے پر وزیر اعظم کا استقبال کرنے کے بجائے اپنے دفتر میں کیا تھا، میاں نواز شریف نے جناب خالد انور کو سینٹ کا ممبر بنوا کر وزیر قانون بنا دیا کہ انہوں نے ۹۳ء میں ان کی حکومت کی بحالی کا کیس جیتا تھا۔ بے نظیر بھٹو نے سید سجاد علی شاہ کو بہت سے لوگوں پر ترجیح دے کر چیف جسٹس بنایا تھا کہ انہوں نے ۹۳ء میں اسمبلی بحالی کے کیس میں اختلافی نوٹ دیا تھا اور بعد میں سجاد علی شاہ موصوفہ کے زیر عتاب آ گئے کہ انہوں نے سینارٹی کے مسئلے پر سٹینڈ لیا، پھر جناب شاہ صاحب، میاں نواز شریف کے ہیرو بن گئے مگر ایک مسئلے پر اس طرح سپریم کورٹ سے نکالے گئے کہ خُلا سے حضرت آدم کا نکلنا لوگ بھول گئے۔

ہم دراصل ہیرو اور زیرو بنانے میں بڑے فراخ دل واقع ہوئے ہیں، اپنی داخلی محبت کو ہم کائناتی بنا دیتے ہیں اور موضوعی و ذاتی نفرت کو اصولی سمجھ لیتے ہیں ایک تقریر، ایک فیصلہ، ایک ادا، ایک انداز اور ایک واقعہ ہمارے لئے کسی کو ہیرو اور زیرو کرنے کے لئے کافی ثبوت بن جاتا ہے۔ ہم نے ایک عرصہ تک شیخ عبداللہ کو "شیر کشمیر" بنائے رکھا برسوں تک یاسر عرفات ہمارے ہیرو رہے، مست گل پر ہم نے گل پاشیاں کیں، رفیق باجوہ کو بامِ بلند پر پہنچایا اور پاتال میں گرایا، یہ نفسیات آج بھی پوری طرح برقرار ہیں، بلکہ روز افزاں ہے، حال ہی میں پی سی او کے تحت حلف اٹھانے اور نہ اٹھانے کا مسئلہ بھی یہی صورت اختیار کر گیا ہے۔ حلف اٹھانے والے جج

نظروں سے گرا اور نہ اٹھانے والے آنکھوں میں سما رہے ہیں، یہ دریائے محبت اور طوفان عشق بھی چند دنوں میں اتر جائے گا اور لفظوں، نعروں اور بیانوں کی ساری جھاگ بیٹھ جائے گی۔ صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ یا تو بڑی عرق ریزی سے ہم لوگ ماضی کا مطالعہ کرلیا کریں یا پھر کچھ عرصہ مستقبل کا انتظار کرلیا کریں تاکہ ہر چول اپنی جگہ پر ٹھیک سے بیٹھ جائے۔

ہماری عدلیہ نے نجی وانفرادی معاملات میں تو بہت روشن مثالیں قائم کی ہوں گی مگر اجتماعی معاملات میں وہ نمونہ سامنے نہیں آیا جو عدلیہ جیسے باوقار ادارے سے متوقع تھا، ایک آدھ فیصلہ چھوڑ کر باقی کے تمام فیصلے سامنے کی حقیقت دیکھ کر کیے گئے دوراندیشی اور مستقبل بینی کا مظاہرہ بہت کم ہوا جسٹس منیر نے پہلی بار یہ راہ نکالی جو بعد میں شاہراہ بن گئی۔ یحییٰ خان کے خلاف فیصلہ اس وقت آیا جب وہ پابند سلاسل تھا، جونیجو صاحب کی حکومت کی بحالی کا فیصلہ اس طرح ہوا جس طرح محبوب چلمن سے لگ کر بیٹھا ہو کہ صاف چھپتے بھی نہیں اور سامنے آتے بھی نہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کو باقاعدہ نظریہ ضرورت کا کور بخشا گیا۔ گذشتہ دور حکومت میں کھلم کھلا سپریم کورٹ پر چڑھائی ہوئی۔ دھاوا بولا گیا اور سپریم کورٹ کو ہراساں کیا گیا۔ یہ کیس سامنے آیا تو اس وقت حلف اٹھانے اور نہ اٹھانے والے جج صاحبان نے کیس داخل دفتر کردیا کہ شہادتیں نہیں ملیں مگر جونہی حکومت ختم ہوئی اور نیا سیٹ اپ آیا تو توہین عدالت کا کیس ری اوپن ہوگیا۔ قانون کو واقعہ دیکھ کر حرکت میں آنا چاہیے چہرہ دیکھ کر نہیں ہم نہ موجودہ سیٹ اپ کے پی سی او کی حمایت کرتے ہیں اور نہ جج صاحبان کے اتفاق واختلاف میں کسی کے فریق میں کہنا یہ مقصود ہے کہ اربابِ سیاست، اصحابِ دانش اور رجال صحافت کو اب اس حصار سے نکل آنا چاہیے جو غبار اور غبار کی شکل میں اپنے اردگرد بنایا ہوا ہے۔ ذاتی پسند پر ہیرو سازی شروع ہو جاتی ہے اور شخصی عناد پر

زیرو بازی، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ ادارے مستحکم نہیں ہو رہے۔ جب کہ ادارے ایک آدھ فیصلے سے نہیں اپنے مجموعی رویے اور کردار سے نشو ونما پاتے اور احترام حاصل کرتے ہیں، تاریخ کے جریدے پر صرف وہی لوگ ثبت ہیں جن کی زندگی جہدِ مسلسل اور یقینِ محکم سے عبارت تھی، ہر سال پت جھڑ کا موسم آتا ہے اور گزر جاتا ہے اور ہر چوتھے روز سمندر میں جوار بھاٹا آتا ہے اور اتر جاتا ہے، یہ ایک معمول ہے اس سے غیر معمولی نتائج اخذ کرنا چنداں دانائی نہیں۔

کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

سی ٹی بی ٹی پر دستخط کا موضوع آج کل صحیح معنوں میں Issue of day اور Talk of town بن چکا ہے، میں جو بات کرنے چلا ہوں ممکن ہے اس پر فریقین کی پیشانیاں شکن آلود ہوں۔ وہ بھی جو دستخط کرنے کو ''امرت دھارا'' سمجھ رہے ہیں اور وہ بھی جو دستخط نہ کرنے کو ''اللہ دین کا چراغ'' قرار دے رہے ہیں، لیکن ذرا غور کیا جائے تو بھی درمیانی راہ...... راہِ نجات ہے۔ دونوں فریقوں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہ مسئلہ نہ محض ڈرائنگ روم کا ہے اور نہ موچی دروازے کا، اگر بیک ڈور ڈپلومیسی ہمیں ایک سے زائد بار کوچہ رقیب میں سر کے بل لے گئی اور عزت سادات بیچ بازار نیلام کرا چکی ہے تو تالیوں کی گونج اور نعروں کی ہڑلونگ میں کی گئی لچھے دار تقریریں بھی آدھا پاکستان چاٹ گئی ہیں۔ ہمیں اتنا تر بننے کی ضرورت بھی نہیں کہ کوئی نچوڑ لے اور اس قدر خشک بھی نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی توڑ دے۔

جو لوگ جو کہتے ہیں کہ اقتصادی پابندیوں سے بچنے، قرضوں کی معافی یا ری شیڈولنگ، اور مالی امداد ملنے کی توقع پر ہمیں دستخط کر دینے چاہیے تاکہ ہم پر پہاڑ جیسا قرضوں کا بوجھ کم ہو سکے اور جو آج رینگنے پر مجبور ہیں کم از کم چلنے کے قابل تو ہو سکیں۔ توقع اور خواہش اپنی جگہ بہت درست مگر سوال یہ ہے کہ یہ ہمیں رینگنے کی نوبت تک کس نے پہنچایا ہے؟ یہ بوجھ ہم پر کس نے لادا ہے؟ یہ کاٹھی ہم پر کس نے رکھی ہے؟ اور اس قدر مفلوج اور اپاہج کس نے بنایا ہے؟ صاف بات ہے اسی کے عطار کے لڑکے نے

جس سے پھر ہم دوا لینے چلے ہیں، یعنی امریکہ، ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف، مان لیا یہ قرضے ایک بار اتر گئے اور یہ بوجھ ہلکا ہو گیا لیکن اگر ہمارے حکمرانوں، افسروں اور سیاستدانوں نے اپنی وضع بدلی اور نہ امریکہ اور اس کے مرغانِ دست آموز نے اپنی خو بدلی تو چند سال بعد پھر یہی قرضے ہوں گے قسطیں ہوں گی دباؤ ہو گا، دھمکیاں ہوں گی اور نئی شرطیں ہوں گی کوئی مکھی آج تک مکڑی کے جالے سے ہم نے نکلتے نہیں دیکھی۔ جالا ٹوٹے بھی نہ اور مکھی بھی نکل جائے، یہ ناممکن ہے، جس طرح پہلی بار کوئی مایوس اور چڑچڑا نوجوان کسی ''گینگ'' کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور ایک جرم کے بعد پھر وہ نہ ٹک سکتا ہے اور نہ نکل سکتا ہے۔ ضمیر اور گناہ کی چکی کے دو پاٹوں میں برابر پستا رہتا ہے۔ اس وقت یہی ہمارا حال بن چکا ہے۔ نشے کا عادی پہلی بار ایک گھونٹ بھرتا ہے۔ اس کے بعد پیمانہ عمر تو بھر جاتا ہے مگر اس کا دل نہیں بھرتا ہم نشہ قرض کا زہر اپنی رگوں میں اتار چکے ہیں دستخط کرنے سے ایک بار افاقہ ہوا بھی تو دوبارہ ''فاقے'' ستانا شروع کر دیں گے۔ آخر کتنی بار اس طرح گھسیٹے اور رینگتے رہیں گے؟

ہم بہت فرزانے سہی مگر دستخط کرنے والے بھی اتنے دیوانے نہیں۔

غیر ممکن ہے کہ حالات کی گتھی سلجھے
اہل مغرب نے بہت سوچ کے الجھائی ہے

دستخط کرنے پر ابھارنے، بیتا بیاں دکھانے اور دوسروں کو قائل کرنے والے یہ بھی تو سوچیں کہ مے بھی نہ بدلے نظامِ مئے کشی بھی نہ بدلے تو صرف ساقی بدل جانے سے میخانہ آخر کیسے بدل جائے گا؟

حکومتی ذمہ داروں اور فیصلہ سازوں کو پہلے قرضوں کی معیشت سے چھٹکارے کا پلان بنانا چاہیے، کمیشن کلچر ختم کرنا چاہیے اور ہر سطح پر کرپشن روکنی چاہیے، ورنہ چند سال بعد اس سے بھی بھاری بوجھ ہمارے کندھوں پر ہو گا، پہلے قرضے کیوں لئے گئے،

اور کہاں گئے؟ ان کا میزانیہ قوم کو بتانا چاہیے، مزاج نہ بدلا تو قرضوں کا رواج کیسے بدلے گا؟ ملک سنوارنے کے لئے تو اتنے قرض کافی تھے، جواب تک لئے گئے، مگر ان کا اثر کہاں کھو گیا؟ یہ قرضے معاف ہو گئے یا نئی امداد مل گئی اور وہ بھی اسی طرح ذاتی جیبوں اور فاران بنکوں میں گم ہو گئی تو اس کا حاصل؟

معاہدہ کیا ہے؟ دستاویز کیا ہے؟ نکات کیا ہیں؟ یہ سب فنی بحث ہے مگر ہمارا مسئلہ عملی ہے ہم پر بیس کھرب روپے کے قرضے ہیں سارے قرضے تعمیر و ترقی کے نام پر آئے اور یہ سارے قرضے حکومتوں نے لئے مگر ان کا کیا ہوا؟ نہ ترقی ہوئی نہ برآمدات بڑھیں نہ ادارے بنے نہ معیشت سدھری، پہلے ان سوالوں کا واضح جواب آنا چاہیے اس کے بعد امریکہ کی مراعات کا قوم کو جھانسہ دیا جائے۔

نہ اِدھر اُدھر کی تو بات کر یہ بتا کہ قافلہ کیوں لٹا

مجھے رہزنوں سے غرض نہیں تیری راہبری کا سوال ہے

یہ تو ہے سوال و جواب کے انداز میں اس نکتے پر بحث، ورنہ سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ مانگی ہوئی جنت کبھی راس نہیں آتی، پروانے کی طرح شمع کی لو پر مر کر "شہید کہلوانے" سے بہتر ہے کہ جگنو بنا جائے خواہ آتش بے سوز ہے مگر اپنی ہو غالب کو قرض کی مے نے فاقہ مست بنا دیا تھا ہم کہاں کے سورما ہیں کہ پھر بھی غنی رہیں گے، جامِ جمشید بہت خوشنما سہی مگر ہمیں جامِ سفال کا عادی بننا چاہیے یہ اپنے ہاتھ کا بنا ہے ٹوٹا بھی تو پھر بنا لیں گے جام جمشید لینے سات سمندر پار جانا پڑتا ہے اور ہر بار جانا پڑتا ہے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

ساغر جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

وہ زر کیا جو ضمیر کے عوض ملے اور وہ خوشی کیا جو خودی بیچ کر نصیب ہو؟ سیانوں نے سچ کہا ہے۔

"بھاڑ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان"

اگر ہم ریشم کے کیڑے کی طرح مراعات کی تاروں میں لپٹتے گئے تو مر کر ہی وہ اتریں گے، جو خدا کو چھوڑ کر کسی اور کو صنم بناتا ہے، تو پھر ایک نہیں تین سو ساٹھ بت اس کے سجدوں کا خراج مانگنے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ چٹان سے ٹوٹنے والا پتھر ایک جگہ نہیں رکتا سو قدم تک لڑھکتا جاتا ہے ایک شرط بالآخر شرائط کی دستاویز بن جاتی ہے اور ایک آنے کی بھیک انسان کو مستقل بھاری بنا دیتی ہے۔

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ ترے رہ گزر کو میں

ہم جس الجھن اور مشکل میں مبتلا ہیں وہ زر و معاش کی نہیں ذہنی افلاس کی ہے، بے زر ہونا انسان کو بے قدر نہیں بناتا، بے ضمیری اسے حلقہ اسیری میں لے جاتی ہے۔

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

جینے کا عزم ہو تو سینے کے زخم بھر ہی جاتے ہیں اور عزت مطلوب ہو تو غربت کے دن گزر ہی جاتے ہیں مسلمان جس دور میں قیصر کا تاج اچھال اور کسریٰ کا تخت گرا رہے تھے وہ تونگری کا زمانہ نہیں تھا۔ گھوڑے مریل، تلواریں شکستہ، لباس پیوندہ زدہ، چہرے خستہ اور جوتے گرد آلود تھے، نیزے شاہوں کے گداز قالینوں میں چبھوتے اور گھوڑے ان کے گاؤ تکیوں سے باندھے جاتے تھے اور کسی کو ان کا ہاتھ پکڑنے کی جرات نہ تھی۔

تیری خاک میں ہے اگر شرر، تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

رہ گئے وہ لوگ جو ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دستخط نہ کرنے کی بات کرتے ہیں انہیں

عشق سے پہلے مزاج عاشقی پیدا کرنا چاہیے، اس کے لئے دل میں طوفانِ وفا اور آنکھوں میں سیل اشتیاق اٹھانا چاہیے۔ انہی لوگوں نے ہر دور میں لال قلعہ دہلی پر پرچم لہرانے کی بات کی مگر مسجد بیت المکرم ڈھا کہ گنوا بیٹھے، ہمارے لیڈر آج تک جس شوق اور لگن سے اپنی تقریریں تیار کرتے رہے۔ اگر اتنا زور قوم کو تیار کرنے پر لگاتے تو شائد صورتحال مختلف ہوتی ہمارے لیڈر ہر حکومت کا ناک میں دم کرنے، چینی آٹا مہنگا ہونے پر لوگوں کو سڑکوں پر لانے، زرعی ٹیکس کے خلاف ہر زمینداروں کو ابھارنے اور عوام کو پیٹ کے مسائل پر سیخ پا بنانے میں لگے رہے، اگر لیڈر قوم کو انہی باتوں میں لگائے رکھنے اور اس میں مطالبات اور سہولیات کی نفسیات پیدا کرنے میں مصروف رہے تو پھر قوم کس طرح عیش و عشرت چھوڑے گی؟ وہ سہولتوں سے کیسے دستبردار ہوگی اور وہ پابندیاں کیسے برداشت کرے گی؟ ہمارے لیڈروں نے ہماری نفسیات کی جس طرح پرورش کی ہے وہ جفاکشی کی نہیں عیش کوشی کی ہے اے سی، گیزر، فون کے بغیر ہمارا گزارا نہیں ہم کپڑوں پر سلوٹ اور داغ نہیں سہتے۔ ایک گھنٹہ بجلی بند ہو تو ہماری آنکھیں ابل آتی ہیں۔ مرغی، انڈے اور دودھ کی قلت ہو تو لیڈر قوم کو سڑکوں پر لے آتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ہم طوفانوں سے لڑ جائیں گے۔ چٹانوں سے بھڑ جائیں گے، پہاڑوں سے ٹکرا جائیں گے بحرِ ظلمات میں اتر جائیں گے اور آندھیوں سے اڑ جائیں گے۔ یہ کہنے کی باتاں ہیں۔

بلاشبہ ہم امریکہ کے سامنے ڈٹ سکتے ہیں، ورلڈ بنک کو ٹھینگا دکھا سکتے ہیں۔ آئی ایم ایف کو جوتے کی نوک پر رکھ سکتے ہیں اور عالمی دباؤ کو پاؤں تلے دے سکتے ہیں۔ لیکن حکمرانوں کو بدعنوانی اور لیڈروں کو تن آسانی کی عادت اور سیاست بدلنی پڑے گی۔

عشق سے ہوتا ہے آغازِ حیات
اس سے پہلے زندگی الزام ہے

ہر مسئلے کا حل دو صورتوں میں ہوتا ہے یا اس پر غلبہ پایا جائے یا اس کا مقابلہ کیا جائے غلبہ دولت سے اور مقابلہ غربت سے، ہم نہ امیر ہیں اور نہ غریب، ہم درمیان میں رہنا چاہتے ہیں دباؤ سے بھی بچ جائیں اور سہولت سے بھی محروم نہ ہوں۔ یہ دوعملی تاریخ میں کبھی کامیابی نہیں کہلائی امریکہ آج کیوں حاوی ہے؟ صرف اس لئے کہ امیر ہے، افغانستان کیوں ڈٹا ہوا ہے صرف اس لئے کہ غریب ہے۔ امیر دماغ سے لڑتا ہے اور غریب ہاتھ سے ہم دماغ سے لڑ نہیں سکتے کہ امیر نہیں اور ہاتھ سے لڑنا نہیں جانتے اور چاہتے کہ غریب نہیں تو پھر مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ ہم زندہ بھی رہنا چاہتے ہیں اور جنت بھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہتے۔ مشکل دونوں صورتوں میں ہے اگر سہولیات و مراعات نہیں چھوڑتے تو پھر عالمی ادارے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے یہ بھی مشکل ہے، اگر آسائشیں چھوڑتے ہیں تو بھی کچھ وقت مشکل میں کٹے گا۔ مگر ایک میں ذلت اور دوسری میں عزت ہے۔

یہ بندگی خدائی وہ بندگی گدائی
یا بندہ خدا بن یا بندہ زمانہ

صاف بات ہے مجنوں بننے کے لئے صحراء کی خاک چھاننی پڑے گی، فریاد کہلانے کے لئے جوئے شیر لانی پڑے گی، اور رانجھے کا لقب پانے کے لئے کان پھڑوانے اور مندرے ڈلوانے پڑیں گے، لیکن ہم چاہتے ہیں کام بھی نہ کریں اور تاریخ میں نام اور دنیا میں مقام بھی اونچا مل جائے، کنفیوژن کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے؟

اپنی آشفتہ مزاجی پہ ہنسی آئی ہے
دشمنی سنگ سے اور کانچ کا پیکر رکھنا

''جستہ جستہ''

یہ میاں نواز شریف کے پہلے دورِ اقتدار کی بات ہے وہ آئی جے آئی کے توسط سے وزیراعظم بنے تھے اور جماعت اسلامی آئی جے آئی کی اہم اتحادی جماعت تھی، امیر جماعت قاضی حسین احمد نے ان سے وزیراعظم ہاؤس میں ملاقات کی دیگر باتوں کے علاوہ انہوں نے میاں صاحب سے کہا اب آپ ملک کے سب سے بڑے انتظامی عہدے پر فائز ہو گئے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ پرائم منسٹر ہاؤس جیسا پرشکوہ اور بڑا گھر چھوڑ کر کسی نسبتاً چھوٹے بنگلے میں منتقل ہو جائیں اس سے ایک تو آپ کی ذات کے حوالے سے سادگی کا خوشگوار تاثر قائم ہو گا اور دوسرے یہ کہ وزراء اور دیگر نمایاں عمائدین حکومت چھوٹے گھر استعمال کریں گے، اس طرح ملکی خزانے سے بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ جناب وزیراعظم جھٹ سے بولے۔'' قاضی صاحب'' آپ دوسروں کیلئے مزدوری کرتے ہیں اور ہم اپنے مزدور ہیں۔ یعنی سہولیات اور لذت نہیں اٹھانی تو محنت و مشقت کس لئے؟ قارئین کو یاد ہوگا کہ نواز شریف نے اقتدار میں آتے ہیں سادگی کلچر کے فروغ کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا تھا اور اس ضمن میں کئی نمائشی اقدامات بھی کئے جو ہر حکمران کرتا چلا آیا ہے ان اقدامات میں ایک ون ڈش، کا فیصلہ تھا اگرچہ یہ باتیں ازقسم لطائف شمار ہوتی ہیں۔ نہ صوبدایدی فنڈز میں کٹوتی، نہ پرہجوم عملے کی چھانٹی نہ ایکڑوں پر محیط بنگلوں پر قدغن، نہ کروڑ کروڑ روپے کی گاڑیاں کے استعمال پر پابندی نہ پروٹوکول میں کمی، نہ سپیشل ہوائی جہاز رکھنے سے گریز، نہ ذاتی گھروں کو سرکاری گھر قرار دینے کی رسم کا خاتمہ اور نہ دیگر مالی تحفظات اور معاشی معاولت پر بندش، گویا ون

ڈیلش کا کلچر اپنانے سے ملک بہت بڑے انقلاب سے ہمکنار ہو جائے گا، مگر اس نمائشی اقدام کا بھی کیا حشر ہوا؟ ایڈمرل افتخار سروہی کہتے ہیں کہ وزیراعظم کراچی تشریف لائے، میٹنگ کے بعد کھانا تھا میں نے "ون ڈش مینو" رکھا جب کھانا سامنے آیا تو میاں صاحب کا موڈ خراب ہو گیا، دو چار لقمے زہر مار کئے بات آئی گئی ہو گی۔ کچھ عرصے بعد مرا پرائم منسٹر ہاؤس جانا ہوا کھانے میں کم از کم اٹھارہ ڈشیں تھیں۔ اور یوں سادگی کلچر اپنے عروج پر تھا۔ فیا ملعجب

حسن کے ساتھ نزاکت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لیکن اس کے بھدے مظاہر حکمرانوں کے مزاج میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جسے بھی کرسی ملی اس نے "دلیری" اختیار کر لی گویا وہ ابھی خلاء سے اتر کر مٹیالی زمین پر جلوہ فگن ہوا ہے، نہ ماضی یاد رہا اور نہ مستقبل کا انجام ذہن میں رہا۔ میاں نواز شریف ہر ایک کو معلوم ہے کہ وہ متوسط طبقے سے نہیں مزدور خاندان سے تعلق رکھنے والے ہیں ان کے بڑوں نے ہاتھ سے محنت کر کے کمایا۔ یہ عیب نہیں فخر کی بات ہے، جب بھی کسی نے ان کے "پیشے" کو ہدف تنقید بنایا، واقعہ یہ ہے کہ میرے دل کو دکھ پہنچا، لیکن اس خامی کا کوئی جواز نہیں جو دولت اور حکومت نے میاں فیملی میں پیدا کر دی اور انہوں نے "مغلئی نخرے" شروع کر دئے گئی باتیں زبان زدعام ہیں، بڑی احتیاط بھی برت لی جائے تو کم از کم آدھی باتیں تو یقیناً درست ہوں گی، مثلاً وی آئی پی فلائٹ میں چارپائی نصب کرنے کی فرمائش اور اس کا انتظام نہ ہونے پر مزاج عالی کی برہمی، ایک معروف نعت خواں کا میاں محمد صاحب کا کلام سننے کے لئے باقاعدہ مشاہرہ ہر تقرری، ایک بانسری نواز کی ہمراہی، جو سفر کے دوران سماعتوں کو آسودگی دے سکے، ایک ایسے "باباجی" کو اپنے ہاں خطیب مقرر کرنا جسے وعظ و خطاب تو کجا ناظرہ قرآن مجید صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے کی استطاعت بھی نہیں اور پھر انہیں سرکاری خرچ پر حج عمرے ادا کرانا، بڑی بڑی

کانفرسوں میں شامل ہونے کا موقع دینا اور بوقت ضرورت ان کے لطیفہ گو کا کام لینا۔
یہ حکومت اور دولت کی بدہضمی نہیں تو اور کیا ہے؟ اپنے بنگلے کا بینکوئٹ بکنگھم پیلس کے شاہی ہال کی طرز پر بنوانا درآمدی فرنیچر سے اسے آراستہ کرنا اور پھر بھی "اللہ کے فضل و کرم" جیسے جملے کو اپنا تکیہ کلام بنانا اللہ کے تحمل کو چیلنج کرنے والی بات ہے۔ یہ نزاکت نہیں جسارت ہے۔ ایک طرف خزانہ خالی تو دوسری طرف کاروبار ٹھپ اوپر بیرونی قرضوں کا انبار اور ادھر دوسرا پڑھا لکھا اور ہنر مند آدمی بے روزگار، مگر اس کے باوجود، مال مفت دل بے رحم" کے واقعات اوروں کے عہد حکومت میں بھی دیکھنے کو ملے مگر "مزدور کے بیٹے" وزیر اعظم نے اس بے رحمی کا بھرپور مظاہرہ کیا اور چیخ پکار کے باوجود نشہ اقتدار میں مخمور رہے۔ کیا اس کی تردید ممکن ہے؟ کہ وزیر اعظم کے سات درجن مشیر تھے یعنی ۸۴ ذرا حساب لگا کر دیکھا جائے کہ ایوان حکومت کے دروازے پر جھومنے والے بسیار خود اور "مفت تروڑ" ہاتھیوں کے کھانے پینے کا کتنا بوجھ یہ مقروض ملک اور مفلوک قدم اٹھاتی رہی، آخر یہ لوگ کیا مشورے دیتے تھے اور ایسے ہی مشیروں کا آخری "زرین مشورہ" کتنا سنگین نتیجہ لایا۔
یہ سب کچھ میاں نواز شریف کی "مفت نوازی" نہیں تھی تو اور کیا تھی؟ مکمل وزیران کے معاون اور نائب وزیر پھر معاونین خصوصی اور اس پر اتنے مشیروں کو پلٹن مستزاد، یہ سب کچھ کیا تھا؟ اوپر کی یہ چند جھلکیاں ہمارے حکمرانوں کے مزاج اور حکمرانی کے انداز کو سمجھنے میں مدد اور پھر ان کے زوال اور ملک کے کنگال ہونے کے اسباب ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔ کسی ماہر حیاتیات اور حکیم نفسیات سے رابطہ کر کے ضرور پوچھنا چاہیے کہ حکمرانوں میں وہ کیا "بیالوجیکل ڈیفیکیٹ" اور ان کا کیا "سائیکالوجیکل پرابلم" جس کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں عورت حکمران ہو تو کوہ قاف کی پریوں کو اپنا آئیڈیل بنا لیتی ہے۔ اور مرد اقتدار سنبھالے تو مغلوں کو دور زوال کے شہزادوں کا سٹائل اپنا لیتا ہے۔ اگر "شاہ" اور "شہزادی" بنے بغیر چارہ نہیں تو پھر "رضیہ سلطانہ" اور "ٹیپو سلطان" کی پیروی میں کیا حرج ہے؟ جس کے نام سے بندگی کی آبرو ہے۔

جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

ایک اخباری اطلاع کے مطابق میاں نواز شریف نے جنرل عبدالمجید ملک، راجہ محمد ظفر الحق اور جناب اعجاز الحق پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی ہے جو امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد سے مل کر ۲۱ فروری ۹۹ء کو رونما ہونے والے اس واقعہ پر اظہارِ معذرت کرے گی جو واجپائی کے دورہ لاہور کے حوالے سے پیش آیا تھا جس میں جماعت اسلامی کے زیر اہتمام ہونے والے ایک جلسہ پر اندھا دھند لاٹھی چارج ہوا، پورا جلسہ آنسو گیس کی لپیٹ میں آیا، لیڈروں اور کارکنوں کی تمیز کئے بغیر ہر ایک پر ڈنڈے برسائے گئے اور ستر اسی سال کے بوڑھوں پر وحشیانہ تشدد کیا گیا اور جلسے میں شریک تقریباً تمام کے تمام تیرہ سو افراد پر دہشت گردی کا مقدمہ درج کیا گیا اور ڈیڑھ ماہ تک انہیں مختلف جیلوں میں اسی طرح رکھا گیا جیسے وہ بہت بڑے تخریب کار، عالمی دہشت گرد، بدنام ڈاکو، اُجرتی قاتل، پیشہ ور غنڈے اور اخلاقی مجرم ہوں جن لوگوں نے وہ ویڈیو فلم دیکھی ہے جو بڑی چابکدستی اور مہارت سے اس موقع پر بنائی گئی وہ گواہی دیں گے کہ "بربریت" کا لفظ یا تو انہوں نے کتابوں میں پڑھا ہے یا اس کی کہانیاں سنی تھیں مگر اس فلم کے ذریعہ انہیں اس کا مشاہدہ بھی ہوا، سفاکی کیا ہوتی ہے؟ نشہ اقتدار کیا ہوتا ہے؟ پندارِ طاقت کیا ہوتا ہے؟ اور بے شرمی اور درندگی کیا ہوتی ہے؟ اس کا ویڈیو فلم سے اندازہ ہوتا ہے۔ خیر وہ وقت گزر گیا اور وقت ہوتا ہی گزرنے کے لئے ہے اور وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ سنجاب وسمور میں لپٹے انسان کی رات بھی

گزر جاتی ہے اور تنور پر لیٹے کی بھی بسر ہو جاتی ہے۔ کاخ وایوانِ کے باسی ہوں یا صحرا و بیابان کے مسافر، دونوں کا وقت بسر ہو ہی جاتا ہے، اب وہ لٹن روڈ پر پٹنے والے اپنے بال بچوں کے درمیاں ہیں اور انکی پٹائی کرنے والے اپنے بال بچوں سے دور اور سلاخوں کے پیچھے نظر بند، مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کا کیا اختلاف تھا؟ ہم اس میں بھی فریق نہیں۔ میاں نواز شریف اور قاضی حسین احمد میں کیوں کھچاؤ پیدا ہوا؟ ہم یہ معلوم کرنے کے لئے بھی بے تاب نہیں اور میاں فیملی اس حوالے سے کیا بدلے چکانا چاہتی تھی؟ اس راز سے آگاہ ہونے کے لئے بھی ہمیں کوئی اضطراب نہیں، لیکن اس روز جس خمارِ شاہی کا مظاہرہ کیا گیا، شرف انسانی کی جس قدر تذلیل کی گئی، گستاپو اندازِ حکومت کا جو نمونہ پیش کیا گیا، جلیانوالہ باغ کا جو منظر دہرایا گیا۔

داعیانہ اسلوب کے بجائے مناظرانہ روش

دین بنیادی طور پر دعوت کا دوسرا نام ہے اگر کوئی پوچھے کہ دنیا میں سب سے مشکل کام کون سا ہے تو اس کا جواب ہوگا۔ دعوت کا کام۔ اسلئے کہ دعوت دماغ پگھلانے اور ہڈیوں کا گودا گھلانے کا تقاضا کرتی ہے کوئی انبیاء کرام اور مصلحین امت سے دریافت کرے کہ دعوت انسان کو کن کن زہرہ گداز اور جگر پاش مراحل سے گزارتی ہے۔ دعوتِ دین کے اجزائے ترکیبی میں پختگی علم، ضبطِ نفس، فراخ حوصلگی، صبر وثبات، سلامتی فکر و ذہن اور قوت برداشت شامل ہیں۔

داعی کبھی تھڑدلا نہیں ہوتا، بے حوصلہ نہیں ہوتا، چڑچڑا نہیں ہوتا، بدخواہ نہیں ہوتا کم نگاہ اور طالبِ جاہ نہیں ہوتا، داعی کو زندگی کا ہر لحہ پل صراط پر سے گزر کر بسر کرنا ہوتا ہے، ذرا سا افراط اور معمولی سی تفریط داعی کو غیر متوازن بنا کر اپنے مدعو اور مقصد سے بہت دور لے جاتی ہے۔ علماء کرام وارثانِ انبیاء ہونے کے ناطے داعی کا منصب رکھتے ہیں اس لئے انہیں عام آدمی کے مقابلے میں دلسوزی، دردمندی اور خیر خواہی کے جذبات سے معمور اور درشتی و تلخ کلامی سے دور ہونا چاہیے کیوں کہ داعی اپنی منزل کہکشاں سے ہو کر نہیں پتھروں پر چل کر حاصل کرتا ہے۔ دارِ ارقم صحنِ حرم، شعبِ ابی طالب اور وادئ طائف داعی کی منزل کے سنگ ہائے میل ہیں داعی کسی چٹان سے سر نہیں پھوڑتا بلکہ جوئے رواں کی طرح اپنا راستہ بناتا اور رخ موڑتا ہے، بدقسمتی سے

ہمارے یہاں ایک دور میں دینی لوگوں کو مناظرہ بہت مرغوب رہا ہے۔ اس عہد کی یاد گار ابھی باقی اور یہ نفسیات ابھی تک قائم ہے اہل نظر کا کہنا ہے کہ حسنِ مقال بہر کیف جدال سے بہتر ہے۔ کہیں مناظرہ ناگزیر ہو بھی تو ''اقوال احسن'' اور ''عنوانِ شائستہ'' کو مدنظر رکھنا چاہیے، چیلنج، فتویٰ، تحقیر اور الزام تراشی سے راہِ ہدایت اگر بالکل مسدود نہیں تو محدود ضرور ہو جاتی ہے۔

عیسائیوں ہندوؤں اور قادیانیوں سے تو مناظرے کا پھر بھی جواز ہے لیکن اہل اسلام کا فروعی مسائل پر ایک دوسرے کے دُوبدو ہونا اور ڈنگل بجانا ناقابل فہم سی بات ہے۔ اور موضوع بھی وہی از کار رفتہ کہ نماز میں ہاتھ سینے پر ہونے چاہئیں یا ناف پر، تراویح کی رکعتیں آٹھ ہیں یا بیس، تیجہ، دسواں اور چہلم مباح ہے یا مکروہ، انہی مناظروں کے نتیجے میں ایسے لٹریچر کا طومار بندھا ہے کہ دینی حلقوں کا وقار خاک میں مل کر رہ گیا ہے علمی بحث اور تحقیقی مذاکرہ اور چیز ہے اور فن مناظرہ بالکل چیزے دِگر، اول الذکر سے ذوق مطالعہ بڑھتا اور ثانی الذکر سے صرف سماجی مقاطعہ واقع ہوتا ہے، لوگوں نے جب علماء کو ان مسائل میں ہمہ وقت الجھا ہوا اور سرگرداں پایا تو انہوں نے اپنے طور پر یہ سوچ لیا کہ جن سے آج تک یہ فروعی مسائل طے نہیں ہوئے ان سے دنیا کے عمومی مسائل کیا حل ہوں گے، جو کسی فقہی تعبیر میں تطبیق پیدا نہیں کر سکے وہ زندگی کی تفسیر کیا کر سکیں گے؟ دلیل ہیرے کی ایک ایسی کنی ہے جو پتھر کا جگر چیر دیتی ہے لیکن مناظرہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا نتیجہ آج تک نہیں نکل سکا۔

علماء کرام اگر داعی کا کردار اپنائیں گے تو انہیں ہر فرد بشر مدعو نظر آئے گا اور ہر مدعو، محبت، توجہ، ہمدردی اور شفقت کا مستحق ہوتا ہے، اسے جھڑکا، جھٹکا اور ٹوکا نہیں جاتا اسے پیار سے بلایا، محبت سے پاس بٹھایا اور دلیل سے سمجھایا جاتا ہے، تبلیغ و دعوت کوئی ذاتی مسئلہ تو نہیں کہ آدمی ذاتیات پر اتر آئے یہ تو الٰہی فریضہ ہے جسے صرف اس غرض

اور حرص سے ادا کیا جاتا ہے کہ شائد مدعو کے لئے ہدایت اور داعی کے لئے مغفرت کا موجب ثابت ہو، قیامت کے روز داعی کو اس کا اجر تو ضرور ملے گا کہ اس نے اپنے حسن کلام، ذاتی ایثار اور عمدہ کردار سے کئی لوگوں کو سیدھی راہ دکھائی لیکن اس کا کوئی نیک بدلہ نہیں ملے گا کہ اس نے اپنے بھڑ کیلے مزاج، غصیلے انداز اور کٹیلے الفاظ سے بہت سے لوگوں کو دھتکارا اور بھگایا تھا اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے فرض کیا ان میں سے کوئی بھی الزام علماء کرام کے ذمے نہیں لگتا لیکن سماجیات اور اجتماعیات میں ان کا کردار محدود کیوں ہو گیا ہے؟ یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ باقی ہے۔ اس سوال کا جواب کسی ایک گروہ کے رہنما اور عالم دین کے ذمے نہیں بلکہ علماء امت پر فرض ہے کہ وہ خود تجزیہ کر کے بتائیں کہ ڈور کا سرا کہاں الجھا رہا، پانی کہاں مر رہا اور معاشرے اور علماء کا باہمی رابطہ کہاں کٹ رہا ہے؟ گذشتہ کل بھی علماء امت کے والی اور نگران تھے اور آج بھی علماء کو ہونا چاہیے انہیں اپنے فرض منصبی کے حوالے سے ضرور غور کرنا چاہیے کہ دنیا دگرگوں اور تاروں کی گردش تیز تر کیوں ہو رہی ہے؟ متاع دین و دانش اگر بیچ بازار لٹ رہی ہے تو یہ کس کافر ادا کے غمزہ خوں ریز کا کرشمہ ہے! عجم کے لالہ زار وہی ہیں لیکن کوئی رومی ؒ کیوں نہیں اٹھ رہا؟ خاکِ بغداد شیخ جیلانی ؒ اور امام غزالی ؒ کو کیوں ترس رہی ہے اور ایران کی آب و گل تو پہلے والی ہے لیکن کوئی رازی ؒ کیوں نمودار نہیں ہو رہا؟ اگر مسئلہ کسی دیرینہ بیماری اور دل کی ناچنگی کا ہے تو پھر اس کے لئے آبِ نشاۃ انگیز بھی علماء کو ڈھونڈھنا پڑے گا۔

عراق سے تریاق

اگر چہ سیانوں نے یہ کہہ رکھا ہے کہ ''دیر آید درست آید'' لیکن کئی بار ایسا بھی ہوا کہ عراق سے تریاق آتے آتے مار گزیدہ جان سے گزر گیا خدا کے ہاں ''دیر'' تو ضرور ہوتی ہے۔ ''اندھیرا'' نہیں مگر دنیا میں بعض اوقات دیر کے ساتھ اندھیر کا معاملہ بھی چلتا ہے اس لئے روئے ارض پر مظلوموں اور ظالموں کا ڈھیر لگتا جا رہا ہے۔ ہر چوری کا آغاز انڈے سے ہوا اور انصاف نہ ملنے سے نوبت مرغی تک پہنچی اور اس طرح پھل توڑنے کا عمل پورے باغ کے اجڑنے تک جا پہنچا۔ اگر ہر فریاد کی داد اپنے وقت پر مل جاتی تو ایک مہیب عہدِ استبداد اس قدر توانا نہ ہوتا۔

جب سروں کی فصل پک جائے تو اسے کاٹنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے، جب مردہ غسل و کفن کے مراحل سے فارغ ہو جائے تو اس کے دفن کرنے میں تاخیر مناسب نہیں اور جب ظالم ہاتھ لگ جائے تو اسے ڈھیل دینا موزوں نہیں ہر کام اپنے وقت پر اچھا لگتا ہے، تعجیل اس لئے اچھی نہیں سمجھی جاتی کہ کام کی تکمیل نہیں ہو پاتی اور تاخیر اس لئے پسند نہیں کی جاتی کہ وہ بعض اوقات پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے جلد دوڑنے والے اگر ''ڈھ'' جاتے ہیں تو دیر کرنے والے پیچھے ''رہ'' جاتے ہیں۔

حالیہ تبدیلی نے واقعہ یہ ہے کہ مظلوم ملک کے محروم عوام کی توقعات اور خواہشات کا گراف آسمان تک پہنچا دیا ہے کہا جا سکتا ہے کہ لوگ بڑے بے صبرے

ہیں، بڑے جذباتی ہیں اور بڑے جوشیلے ہیں، لیکن یہ بھی تو سچ ہے کہ

عدمِ خلوص کے لوگوں میں یہ کمی دیکھی
ستم ظریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں

بندے اگر پُرخلوص ہوں تو ان کی ایسی ''جلد بازیوں'' پر ہزاروں ''مصلحت سازیوں'' کو قربان کیا جاسکتا ہے اور کیا جانا چاہیے جن کے منہ کے رزق کا آخری لقمہ تک چھن جائے کیا ان کے اپنے لقمہ اجل بننے کا انتظار کیا جائے؟ اور جن کے لباس کا تار تار اتر جائے کیا ان کے کفن تار تار ہونے کا نظارہ کیا جائے۔ تب ظالموں کے احتساب کا آغاز ہو؟

لوگ اس لئے جلدی میں ہیں کہ کہیں ''گھامڑوں'' کے پھنسنے تک ان کی ''لومڑیاں'' پہنچنے کے قابل نہ ہو جائیں اور لوگوں کو نئی قیامت دیکھنی پڑ جائے۔

جب قافلہ لٹ چکا ہو تو اِدھر اُدھر کی بات زیب نہیں دیتی، پھر سوال رہزنوں کا نہیں کسی کی رہبری کا اٹھ کھڑا ہوتا ہے، جب دل کے افسانے زبان تک آجاتے ہیں تو بات کوچہ رسوائی تک پہنچ جاتی ہے یہ جو اجڑے چمن کے خس و خاشاک کا ڈھیر لوگوں کے سامنے پڑا ہے ظاہر ہے یہ تباہی بے وجہ تو نہیں آئی، برق و باراں اپنی جگہ لیکن باغبان کا دامن کیسے پاک مانا جاسکتا ہے؟ بس اسی لئے لوگ جلدی میں ہیں کہ راہزن جلد سزا پائیں تاکہ رہبر پر حرف نہ آئے اور بات برق و شرر تک رہے باغبان کے ہنر پر انگلیاں نہ اٹھیں۔ اگر ایوب خان کا ''ایبڈو'' نتیجہ خیز ہوتا تو عوام ٹھنڈے ہو جاتے اگر یحییٰ خان کا لیگل فریم آرڈر موثر ہوتا تو ملک آتش و آہن اور خاک و خون کے مرحلے سے نہ گزرتا، اگر بھٹو صاحب کا منشور لفظوں تک نہ رہتا تو سرمایہ و جاگیر کے عفریت پل کر عوام کی گردنوں سے نہ چمٹے ہوتے، اگر جنرل ضیاء کا ''قرطاس ابیض'' محض ہاتھی کا دانت نہ رہتا تو آج کے ''سیاسی ہنومان'' کب کے زیبِ گورستان، بن چکے ہوتے

لوگ اس لئے جلدی میں ہیں کہ لمحوں کی خطاء نے انہیں صدیوں کی سزادی ہے جہاں آگ لگتی ہے وہاں سے دھواں ضرور اٹھتا ہے آج اگرچہ عوام پھنکار رہے ہیں تو اس لئے کہ ان کے سینے تنور بن کر دہک رہے ہیں۔

گیلپ پول کے ادارے کیا کہتے ہیں؟ انٹیلی جنس ایجنسیوں کی کیا رپورٹیں ہیں؟ سی آئی ڈی کی کیا آراء ہیں؟ آئی ایس آئی کی کیا معلومات ہیں؟ اور آئی بی کا نقطہ نظر کیا ہے؟ اور مجھے نہیں معلوم کہ یہ تمام ادارے عوام کے احساس وادراک کے کس قدر قریب اور کتنے ترجمان ہیں مگر یہ مجھے اچھی طرح یقین ہے کہ کسی بھی خفیہ سروے اور کسی بھی ریفرنڈم کے نتیجے میں ایک ہی رائے سامنے آئے گی اور وہ ہے۔ احتساب......اور...... بلا تاخیر احتساب لوگوں کو احتساب کی اس لئے بھی جلدی ہے کہ ہر ایک جلدی میں ہوتا ہے۔ حکمران اقتدار سنبھالنے کیلئے، امیدوار وزارت کا حلف اٹھانے کے لئے، اپوزیشن حکومت گرانے کے لئے، جاگیردار نمبر بنانے کے لئے صنعتکار قرضے لینے کے لئے، سرمایہ کار منافع کمانے کے لئے اور ہر بروکر اپنا حصہ پانے کے لئے تو کیا عوام انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کی جلدی میں نہ ہوں؟

آخر اس مطالبے میں کیا منطقی سقم اور عملی خلاء ہے کہ مارشل لاء تو راتوں رات لگ سکتا ہے پارلیمنٹ ٹوٹ سکتی ہے، آئین منسوخ ہوسکتا ہے، صدر سے استعفاء لیا جا سکتا ہے فوج کا سربراہ بدلا جا سکتا ہے گورنر راج نافذ کیا جا سکتا ہے، نیا آرڈی ننس لاگو کیا جا سکتا ہے اور یہ سب کچھ مختلف ادوار میں ہوتا رہا لوگ رات کو سوئے اور صبح اٹھے تو نیا نظام اور نیا حکمران تھا، نئی کابینہ اور نئی انتظامیہ پورے کا پورا سیٹ اپ پہلے سے مختلف نظر آیا۔

یہ سب کچھ اگر ممکن ہے اور اپنی ذات اور طبقاتی مفاد کے لئے سودمند ہے تو کیا صرف احتساب تمام تر جزئیات کا محتاج ہے؟ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی بے گناہ زد میں نہ آ

جائے لیکن ایسا بھی نہ ہو کہ مچھر چھانتے چھانتے بڑے بڑے ہاتھی صحیح سلامت نکل جائیں۔

نئے چوروں کو پہچاننا تو قدرے دقت کا کام ہے جو ''عادی'' ''پیشہ ور'' اور ''ہسٹری شیٹر'' ہوں ان کے بارے میں کیسی سکریننگ اور کاہے کی سکروٹنی؟ ان کے جرم فائلوں کی نہیں ان کی اپنی پیشانیوں پر درج ہیں اور وہ بھی جلی حروف میں، جس قدر پر امن محتاط اور ٹھوس انقلاب اب آیا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں آیا، ایک پتہ تک نہیں ٹوٹا ، اور جیسا موقع اب احتساب کا آیا ہے ویسا پھر نہیں آئے گا، ایک کام جس مستعدی سے ہوا ہے دوسرا بھی اسی چستی کے ساتھ ہونا چاہیے۔

ایک وہ لوگ تھے ایک یہ ہیں

دو طرح کے لوگوں کی نفسیات، مزاج اور کردار میں زمین آسمان کا فرق اور فاصلہ ہوتا ہے ایک وہ جو میدانِ عمل میں کوئی نظریہ اور نصب العین لے کر اترتے اور باقاعدہ سیاسی عمل کے ذریعے فطری تدریج کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور دوسرے وہ جو کسی فکر اور مقصد سے عاری ہوتے اور اقتدار کی چھاؤں میں سفر کرتے ہیں، اگر یہ دونوں طبقے کسی افتاد کا شکار اور انہونے واقع سے دوچار ہوں تو اول الذکر لوگ نہ جزع فزع کرتے ہیں نہ روتے دھوتے ہیں، نہ چیخ پکار کا سہارا لیتے ہیں نہ اودھم مچاتے ہیں اور نہ نالہ وشیون سے کام لیتے ہیں جب کہ آخرالزکر ٹسوے بہاتے، گریبان چاک کرتے، ڈرامے رچاتے، افسانے گھڑتے اور رائی سے پربت بناتے ہیں پہلی قسم کے افراد جب کوئی نظریہ لے کر اٹھتے اور جدوجہد کا آغاز کرتے ہیں تو انہیں پہلے دن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم وادی پرخار میں قدم رکھ رہے ہیں اور کوچہ رسوائی میں اتر رہے ہیں یہاں کانٹے پاؤں کے منتظر اور پتھر سر پھوڑنے کے لئے مضطرب ہیں سوا دکوئے جاناں اور قدم قدم بلاؤں کا چولی دامن کا ساتھ اور ازلی رشتہ ہے، اس دشت و بیاباں میں کوئی شجر سایہ دار نہیں ہوگا اس صحراء میں چشمے نہیں بہتے اور زخموں کو بھی کانٹوں سے سینا پڑتا ہے اس لئے وہ لوگ کسی بھی حادثے اور سانحے کے لئے پہلے سے ذہنی قلبی طور پر تیار رہوتے ہیں اور ہنسی خوشی یہ منزل جہد ووفا عبور کرتے ہیں لیکن دوسری قسم کے لوگ

عقیدہ ونظریہ سے تہی دست ہونے کے باعث صرف اقتدار کے ہنڈولے جھولنے کے لئے اس راہ میں قدم رکھتے ہیں، قیدو بند جھیلنے کے لئے نہیں چونکہ ان کی اٹھان، پرورش و پرداخت اور نشو ونما صرف اقتدار کی چھاؤں میں ہوتی ہے اس لئے جب کبھی یہ سایہ ان کے سر سے ہٹتا ہے تو یہ لوگ مکھن کی طرح چشم زدن میں پگھلنا شروع ہو جاتے ہیں ان کے مہندی میں رچے پاؤں کبھی آبلوں سے آشنا نہیں ہوتے اس لئے یہ نازک آبگینے ذرا سی ٹھیس لگنے سے پھوٹ پڑتے ہیں۔

سیاسی کارکن کو معلوم ہوتا ہے کہ سیاست امکانات کا کھیل ہے، تخت یا تختہ، مگر جن کی سیاسی تربیت نہ ہوئی ہو وہ پہلی ہی بازی میں شرمات کھا جاتے ہیں، آج کل اخبارات کے قارئین ان تبصروں سے خوب محظوظ ہو رہے ہیں جو کل کے مقتدر اور ان کے معتمد اور معتبر اپنی گل نشانیوں سے خبروں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ رنج والم کا ایک پرا مشاعرہ برپا ہے، گرہ پہ گرہ لگ رہی ہے۔ اور مصرعے پہ مصرع اٹھ رہا ہے۔ ٹی وی نہ ملنے کی شکایت، کمرے کی تنگی کا رونا، سردی لگنے کا واویلہ، کمبل چھوٹے ہونے کا مرثیہ، کھانا حسب منشاء نہ ملنے کا شکوہ، مچھر کاٹنے کا گلہ اور نیند پوری نہ ہونے کا جھگڑا، تبھی تو ایک افسر نے بگڑ کر کہا ''جناب! آپ جیل میں آئے ہیں پکنک منانے نہیں۔'' اگر جیل کے کمرے بھی قصر وایوان جیسے ہوں گرمیوں میں یخ اور سردیوں میں آتش دانوں سے آراستہ کھانا گھر سے آئے، لحاف ریشمی اور نرم ہو، بستر گداز اور بے سلوٹ ہوں، نہانے کو امپورٹڈ شیمپو اور نیم گرم پانی ہو، چشم و گوش کی ضیافت کے لئے رنگین ٹی وی ہو، آئے روز پوشاک کے بدلنے کی سہولت ہو اور منرل واٹر اور سوفٹ ڈرنکس سے فریج معمور ہو تو پھر یہ جیل کیا ہوئی خالہ جی کا گھر ٹھہرا، یہ ساری آہ و فغان دراصل بے مقصد زندگی کا شاخسانہ، سیاست برائے اقتدار کا نتیجہ اور اتھلے کردار کا نمونہ ہے جن لوگوں کی تگ وتاز کا واحد ہدف بلند و بالا مکان، طویل و عریض گاڑی، موبائل فون، بھڑکتے کڑاکتے لباس

،لذیذ اور مرغن کھانے جیب میں ٹھسے ہوئے کریڈٹ کارڈ، زندہ باد کے نعرے اور اقتدار کے ہلارے ہوں وہ کبھی مردانِ کار اور صاحبانِ کردار نہیں بن سکتے۔

ماضی قریب کی پوری تاریخ دار و رسن ہمارے سامنے ہے، مولانا محمد علی جوہر نے قید اس شان سے کاٹی کہ جیل کے در و دیواران کی عزیمت و جرات کی گواہی دے اٹھے، مولانا ابوالکلام آزاد کا خالقدینا ہال میں بغاوت کے مقدمے کے دوران دیا گیا بیان آج بھی ''قولِ فیصل'' کے نام سے چھپا بازار میں دستیاب ہے جسے پڑھ کر ڈرپوک آدمی بھی لمحے بھر کو شیر بن جاتا ہے، مولانا حسرت موہانیؒ کی چکی کی مشقت اور مشقِ سخن کی گونج زندانوں کی فضا میں آج تک رچی بسی ہے۔ مولانا ظفر علی خانؒ کی زوردار نظموں نے جیل کی فصیلوں میں دراڑیں ڈال دیں تھیں۔ مولانا مودودیؒ نے جس وقار، حوصلے تحمل اور جرات سے جیل کاٹی جیل کے ریٹائرڈ افسران آج بھی عقیدت سے لبریز لہجے اور حیرت سے گندھے ہوئے پیارا سلوب میں وہ داستان عزیمت بیان کرتے ہیں مولانا عبدالستار خاں نیازی درجنوں بار جیل گئے نہ ان کا طرہ جھکا نہ گردن میں خم آیا شورش کاشمیریؒ نے اس وقت جیل کا منہ دیکھا جب انگریز کا اقتدار نصف النہار پر تھا اور سیاست کا صلہ آہنی زنجیریں تھیں، مگر کیا مجال کہ شورش کا حوصلہ ٹوٹا ہو یا نشہ اترا ہو اس نشے کو اتارنے کے لئے ابھی کوئی ترشی وجود میں نہیں آئی، نظریہ انسان کا حوصلہ بڑھاتا اور کردار آدمی کا چہرہ نکھارتا ہے یہ تو کل کے بہت مانوس اور معروف حوالے ہیں ورنہ پوری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ نظریہ و کردار رکھنے والے لوگ جیل کے در و دیوار کو اپنا مونس و راز دار، زنجیر کو زیور، قید و تنہائی کو رمز آشنائی اور قید کی پہلی رات کو سہاگ رات سمجھتے رہے۔ گھٹنوں میں منہ دے کر رونا، دیواروں سے لگ کر باتیں کرنا، دل کا غبار آنسوؤں سے دھونا، اور عدالت کے کٹہرے میں گم سم کھڑے ہونا، وفا کو داغدار کرنا ہے۔

امام اعظمؒ کا جنازہ جیل سے اٹھا لیکن وہ خود نچلے نہیں بیٹھے، امام احمد بن حنبلؒ برسوں پسِ دیوارِ زنداں رہے لیکن نالہ وفغان سے کام نہیں لیا امام ابن تیمیہؒ نے جیل کاٹی لیکن ان کے قلم کی کاٹ عمر بھر برقرار رہی، مجدد الف ثانیؒ قلعہ گوالیار میں رہے لیکن بہت باوقار اور خود دار رہے سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ کی زندگی ریل اور جیل میں گزری مگر اسے ایک دلچسپ کھیل ہی سمجھا مولانا عبید اللہ سندھیؒ ایک غار نما کوٹھری میں برسوں مقید رہے لیکن خوف اور طمع کے ہر بند سے آزاد رہے۔ مولانا فضل حق خیر آبادیؒ نے جزائر انڈیمان (کالے پانی) کی سزا بھگتی لیکن حریت کی ادا برقرار رکھی، مولانا محمود حسنؒ نے مالٹا میں اسیری کا دور گزارا لیکن پیری کے باوجود روشن ضمیری کا مظاہرہ کیا، کتنے حوالے دیئے اور کتنے نام لئے جائیں جرات وعزیمت اور حریت و استقامت کی ایک پوری کہکشاں ہے جس سے منزل آزادی کے تمام نقوش روشن ہیں۔ چونکہ ان لوگوں کی اپنے مقصد کے ساتھ سچی کمٹمنٹ تھی اس لئے ان کی باتیں انمٹ ہو گئی ہیں یہ تمام لوگ اے کلاس میں نہیں رہے۔ ان میں سے کسی کو سزائے موت ہوئی کوئی پردیس میں نظر بند تھا کسی کی پیٹھ پر کوڑے برسے، کسی نے ایک ایک من گندم پیسی، کسی نے سیروں کے حساب سے بان باٹا، کسی کے حصے میں مکمل اور خوفناک قید تنہائی آئی، کسی کے جسم پر گرم استری پھیری گئی کسی کو پورا عرصہ قید بیڑیوں میں جکڑ کر رکھا گیا اور کسی کو پوری بیرک کی غلاظت صاف کرنے کی سزا دی گئی، لیکن یہ سختی کشانِ عشق ہر مرحلے میں سرخرو ہوئے، بلکہ اپنا جگر ہاتھ پر دھر کر ستم گر کو اپنا ہنر آزمانے کی دعوت دیتے نظر آئے ان لوگوں کو اس سے زیادہ سزا دینے کی جب بھی دھمکی دی گی اور ان کے عزم واستقلال کی آزمائش کی گئی تو یہ بڑے اعتماد سے بول اٹھے۔

جو چاہو سزا دے لو، تم اور بھی کھل کھیلو

پر ہم سے قسم لے لو، کی ہو جو شکایت بھی

دینی مدارس کا نصاب تعلیم

اجتماعی معاملات میں علماء کرام سے رہنمائی نہ لئے جانے اور ان کے کردار کے محدود ہو جانے میں ایک حد تک مدارس دینیہ میں رائج نصاب تعلیم کا بھی حصہ ہے۔ مروجہ نصاب تعلیم کے ذریعے جو لوگ تیار ہو رہے ہیں ان کا وژن بہت حد تک مکتبی اور ان کی اپروچ بہت ہی انفرادی ہے، ہمیں زیادہ قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں کہ الجزائر، مصر، عراق اور دوسرے مسلم ممالک میں کون سا نصاب تعلیم رائج ہے اور وہاں دینی مدارس کا انداز اور اسٹیٹس کیا ہے؟ لیکن برصغیر پاک و ہند میں جو ''درس نظامی'' رائج ہے اس سے ہم کسی قدر واقف اور آگاہ ہیں، یہ نصاب تعلیم جس دور میں مرتب ہوا اس عہد کے رجحانات علمی اور ترجیحات تمدنی کے عین مطابق ہو سکتا ہے اس لئے کہ اس وقت تک دنیا ابھی ''گلوبل ویلج'' نہیں بنی تھی، اس خطے کے لئے جو کچھ سیاست و ریاست اور مذہب و معاشرت کے لئے درکار تھا وہ درس نظامی مہیا کر رہا تھا لیکن اب اسے پوری طرح نچوڑ بھی لیا جائے تو ایک آدھ لب تر ہو سکتا ہے کسی کی تشنگی نہیں بجھ سکتی ابتدائی فنی کتب کو چھوڑ کر (دین میں صرف ونحو اور منطق کی کتابیں شامل ہیں) منتہی کتب میں سے جو حصہ جس ترتیب سے پڑھایا جاتا ہے اس سے واعظ، جمعہ اور عیدین کے خطیب، روائتی مفتی اور فنی مدرس تو تیار ہو جاتے ہیں لیکن عمرانی مسائل سے کما حقہ واقفیت، مجتہدانہ بصیرت، شرعی احکام وقوانین کا عصری تغیرات اور ضروریات پر اطلاق

وانطباق اور تمدنی مصالح سے آگہی جیسی خوبیاں اس نصاب تعلیم اور طرزِ تدریس سے قطعاً پیدا نہیں ہوتیں، مثلاً فقہ کی تدریس میں طہارتِ وضو، اکل وشرب کے آداب، نکاح، طلاق اور پہننے اوڑھنے کے مسائل تو پوری شرح وبسط اور تفصیل وتحقیق کے ساتھ پڑھاتے جاتے ہیں لیکن حدود ومعالات، بین الاقوامی معاہدوں اور تعلقات، اصول جنگ اور صلح کا باب جہاں سے شروع ہوتا ہے وہاں سے سرسری گزر جانے پر قناعت کی جاتی ہے، بہت کم لوگ ان امور میں مہارت اور ممارست پیدا کر پاتے ہیں، آخر یہی فقہ تھی جو کسی دور میں مختلف ملکوں اور حکومتوں میں پبلک لاء کے طور پر نافذ رہی آئمہ فقہ نے اجتہادی بصیرت اور بڑی جگر کاوی کے ساتھ اخذ واستنباط سے کام لیا اور دینی احکام کی تمام علتوں اور مصلحتوں کو خوب واضح کیا تب جا کر یہ فقہ ریاستی دستور العمل کا درجہ پانے میں کامیاب ہوئی اور ایک لحاظ سے فول پروف فقہی نظام رائج ہوا لیکن آج مشکل سے ایک آدھ آدمی ملے گا جو مجتہدانہ بصیرت اور تحقیقی شان کے ساتھ ان احکام کے قالب میں روح عصر سمونے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو ورنہ جو کچھ کتابوں میں ہے اس کا ترجمہ کر دینے کو علم کی معراج سمجھ لیا گیا ہے اور اس کی گردان کو فقہی بصیرت، یہی صورت دورہ حدیث کی ہے وہاں بھی زیادہ زور فنی مباحث پر رہتا ہے یا اپنے اپنے فقہی مسلک کی تائید پر اور اب تو حال یہ ہے کہ جو جو جس گروہ سے وابستہ ہے وہ ان متنازعہ مسائل کو حدیث کی روشنی میں صحیح ثابت کرنے کو علم الحدیث کہتا اور اپنے آپ کو "محدث" قرار دیتا ہے حالانکہ حدیث حضور ﷺ کے قول مقدس اور عمل مبارک کا تاریخی ریکارڈ ہے اور الٰہی نظام اور نبویؐ معاشرت قائم کرنے کا سر چشمہ جب کہ آج دنیا جس فکری الحاد، عملی ارتداد، معاشرتی انحطاط، معاشی استحصال اور تمدنی زوال کا شکار ہے اسے دوبارہ صحت مند اور پاکیزہ اور منصفانہ بنانے کے لئے وہ تمام ضروریات اور تقاضے احادیث رسولؐ اور اسوہ پیغمبرؐ میں موجود ہیں جنہیں بروئے

کارلانا وقت کی ڈیمانڈ ہے مگر یہ چیزیں اس طرزِ تدریس سے حاصل نہیں ہوسکتیں جو اس وقت مدارس میں رائج ہے۔ کچھ اس طرح کا سلوک مدارس کے اندر قرآن مجید کے ساتھ روا رکھا گیا ہے۔ وہ کتاب جو نصاب انقلاب ہے جو نور مبین ہے جو محکم صحیفہ ہے، جو دستور حیات ہے جو صحیفہ علم وحکمت ہے جو بندوں پر اللہ کی آخری اور روشن برہان ہے اور حق و باطل کے لئے قطعی میزان ہے۔ اسی چشمہ فیض سے عرب کا صحرا سیراب ہوا نئی تہذیب نے جنم لیا، زندگی کے اچھوتے قاعدے ترتیب پائے اور اسلامی ریاست قائم ہوئی، لیکن مروجہ درس نظامی میں قرآن مجید کے لئے کوئی خاص گوشہ اور وقت مختص نہیں صرف دو تفاسیر جلالین اور بیضاوی پڑھائی جاتی ہیں جو کسی حد تک صرف ونحو کی ضروریات تو پوری کرتیں ہیں لیکن قرآن حکیم کے الہامی وانقلابی پیغام کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں دیتیں۔ جلالین کہنے کو تفسیر تو ہے لیکن خود متن قرآن سے بھی مختصر اور اسی طرح بیضاوی فنی مباحث کا مجموعہ ہے جس سے زندگی میں کوئی حرارت پیدا نہیں ہوتی، حالانکہ قدیم اور جدید تفاسیر میں ایسی کتابیں موجود ہیں جنہیں پڑھ کر قرآن مجید کے الہامی کتاب اور انقلابی نصاب ہونے پر بندے کو از سر نو یقین آتا ہے لیکن یہ تفاسیر درس نظامی کا حصہ آج بھی اس لئے نہیں بن سکیں کہ ملا نظام الدین سہالوی کا مرتب کردہ ''درسِ نظامی'' حرفِ آخر قرار پاچکا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ان کی تفسیروں سے ہمارے علماء کے فرقہ وارانہ مزاج کو بھی تسکین نہیں ہوتی اس لئے ان میں دلچسپی نہیں لی جاتی، ظاہر ہے جو طالب علم اس نصاب تعلیم سے گزر کر اور اس طرز تدریس کے مطابق پڑھ کر عالم بنے گا وہ یک رخا کردار تو ادا کر سکے گا جامع کردار ادا کرنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوگا اس کے نتیجے میں معاشرہ اس کے لئے اجنبی اور وہ معاشرہ کے لئے اجنبی ہوگا۔

روحِ عصر سے صرفِ نظر

بہت ہی معذرت کے ساتھ مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ روح عصر سے صرف نظر کا رویہ سب سے زیادہ علماء کے ہاں رائج ہے اور یہ حضرات ایک خاص نفسیاتی فضا میں سانس لیتے اور ایک مخصوص زوایے سے زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اس رویے کے باعث عصری معاملات و مسائل میں ان کا رول روز بروز محدود سے محدود تر ہوتا جا رہا ہے، میں حتمی طور پر نہیں جانتا کہ اس چیز کا ادراک و احساس ان حلقوں میں کس قدر ہے! یا بالکل ہی نہیں! مگر ہمارے ہاں جو مذہبی لٹریچر تیار ہو رہا ہے اور جس نوع کے مسائل بر سر منبر بیان ہوتے ہیں انہیں پڑھ کر اور سن کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت اگر نور و بشر کا مسئلہ حل ہو جائے، رفع الیدین کا نزاع ختم ہو جائے آٹھ اور بیس تراویح کا معاملہ طے ہو جائے صلوۃ والسلام کا جھگڑا رفع ہو جائے اور تعزیے اور ذوالجناح کا مناقشہ تحلیل ہو جائے تو پوری دنیا میں امن قائم ہو جائے گا، انصاف پروان چڑھے گا، معاشی استحصال کا خاتمہ ہو جائے گا، سیاسی بالادستی کا امریکی خواب دم توڑ جائیگا، اخلاقی اقدار کو استحکام نصیب ہو جائے گا اور دنیا طرفۃ العین میں فردوس بریں بن جائے گی ہمارے یہاں علماء کے سال بھر کے جلسوں کا ریکارڈ دیکھ لیجئے، خطبات جمعہ کی کیسٹ سن لیجئے، آئے روز چھپنے والے پمفلٹ پڑھ لیجئے، اور مناظروں کے اشتہار ملاحظہ کر لیجئے بس یہی موضوعات ملیں گے، قبروں پر جانا جائز ہے یا نہیں؟ حضورؐ کے والدین

مومن تھے یا نہیں؟ گنبد بنانا ثواب ہے یا مکروہ؟ دسواں اور چہلم مباح ہے یا بدعت؟
لاؤڈ سپیکر میں نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟ میلاد کا جلوس نکالنا روا ہے یا ناروا؟ وغیرہ
حالانکہ روحِ عصر کی پکار اور شعورِ عصر کی ندا ان مسائل سے بالکل مختلف ہے،
شعور عصر تقاضا کر رہا ہے کہ مغرب کے بے خدا تہذیب کا شکنجہ توڑ کر باخدا تہذیب کا
قیام کیسے عمل میں لایا جائے؟ تقلیدِ مغرب میں قائم سیاسی نظام کی جگہ اسلام کا شورائی
نظام کس طرح برپا کیا جائے؟ اخلاق باختہ سوسائٹی کو مکارم اخلاقِ کا گہوارہ کیوں کر
بنایا جائے؟ شکوک وشبہات میں محصور دنیا کو پھر سے مرکزِ یقین کیسے بنایا جائے؟
معاشی نظام کو سود سیاسی نظام کو جبر اور زر، معاشرتی نظام کو مکر، سماجی نظام کو ظلم اور
خاندانی نظام کو شکست وریخت سے کیسے بچایا جائے؟ بے قید نجی ملکیت، بے رحم
جاگیرداریت، مہاجنی صنعت اور حیا سوز ثقافت سے دنیا کو کیسے نجات دلائی جائے؟
فکری ارتداد اور عملی نفاق سے عالم انسانی کی جان کیسے چھڑائی جائے؟ اور شرق وغرب
میں ایمان کی لہر اٹھانے اور عرفان کی بہار لانے کی کیا تدبیر کی جائے؟

یہ ہے روحِ عصر کا تقاضا اور شعورِ عصر کا فریضہ جیسے پورا کرنا بہر حال ان لوگوں
کے ذمے ہے جنہیں وراثت انبیاء کا منصب اور شرف حاصل ہے، علم وعرفان کے تین
سرچشمے ایسے ہیں اور جن تک خوش قسمتی سے علماء کو رسائی حاصل ہے اگر ان سے فیض
اٹھایا جائے تو روحِ عصر کو قرار اور شعورِ عصر کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے اور وہ ہیں قرآن
مجید، سنت رسول اللہ ﷺ اور سیرت طیبہ۔

لیکن شرط یہ ہے کہ قرآن حکیم کا مطالعہ مسلکی مصلحت کے مطابق نہیں آفاقی
ضرورت کے مطابق کیا جائے تو سچی بات یہ ہے کہ کوئی تفسیر سامنے رکھے بغیر قرآن خود
بول کر اپنا مفہوم اور مدعا بیان کر دیتا ہے۔ کہ میں کیا ہوں؟ میرے دامن میں کیا
ہے۔؟ اور میں کس لئے اترا ہوں؟ میری ایک ایک آیت میں کتنے جہانِ معنی پوشیدہ

ہیں؟ میرا ایک ایک حرف جریدہ عالم پر کیوں ثبت ہونے کے قابل ہے؟ میں نے ''ضلال مبین'' کے ماحول کو ''نور مبین'' میں کیسے بدل دیا؟ بس بات صرف اتنی ہے کہ کوئی قرآن کا سچا قاری، مخلص سامع اور صاحب نظر مفسر ہو، سنت ثابتہ بھی ہر طرح کے زلیغ وضلال سے بچنے کے لئے بہت بڑی ڈھال ہے رہ گئی سیرت طیبہ تو یہ وہ مینارہ نور ہے جس سے قافلے زندگی کی راہ اور منزل کا نشان پاتے ہیں، لیکن آج جس طرح سنت و بدعت کے مسئلے اٹھائے جاتے ہیں وہ سنت کے فہم سے عاری ہونے کی چغلی کھاتے ہیں آج اسلامی ریاست کیسے قائم ہو اس سنت کے احیاء کی ضرورت ہے۔

آج عدلِ اجتماعی کا قیام سیرت کی روشنی میں کیسے ہو؟

یہ مطالعہ سیرت کی بنیاد ہے عمامہ کتنے گز کا ہو؟ اور زلفین کیسے ترشوائی جائیں یہ سنت و سیرت کے جوہری مسائل نہیں۔

زمانے کے تغیر کے ساتھ ہی حالات میں تغیر اور مسائل میں تنوع آچکا ہے۔

اس تغیر کا بغور جائزہ اور اس تنوع کا بنظر عمیق مشاہدہ دراصل شعور عصر ہے دنیا قبائلی عہد سے نکل کر جاگیری دور سے ہوتی ہوئی صنعتی زمانے میں داخل ہو چکی ہے ملوکیت سے امارت اور امارت سے جمہوریت تک کا سفر طے ہو چکا ہے۔ غلامی سے آزادی کے مرحلے تمام ہو چکے ہیں انسان ہر چیز سوچنے اور ہر بات کہنے کا حق حاصل کر چکا ہے۔ توہمات کی فصلیں گرا ور روایات کی زنجیریں کٹ چکی ہیں، جدید سوسائٹی میں انسانی رشتے نئی بنیادیں تلاش کر چکے ہیں، آقا اور غلام، سردار اور نوکر، بادشاہ اور رعایا، جاگیر دار اور مزارع یہ سب حوالے بہت حد تک دم توڑ چکے ہیں۔

ان جوہری تبدیلیوں کو ذہن میں رکھ کر علماء کو اپنی ترجیحات متعین کرنی چاہئیں اور اپنے موضوعات مقرر کرنے چاہئیں ورنہ زمانہ بڑا بے رحم اور تاریخ بڑی بے مروت ہے۔ یہ اپنا فیصلہ سنانے میں کسی کا لحاظ نہیں کرتے۔

داستانِ دارورسن

جس روز انسان کو اپنی ذات، مقصد حیات اور رازِ کائنات کا درک اور شعور حاصل ہوا اسی دن سے داستانِ دارورسن شروع ہوگئی یہ سارا مسئلہ خود آگہی کا ہوتا ہے، اگر کوئی اپنے آپ اور اپنے شرف سے آگاہ نہ ہو اور بندہ شکم بن کر رہے تو اس کے لئے کوئی آزمائش نہیں کوئی چاہے تو اسے دبالے اور وہ موم کی طرح دب جائے کوئی چاہے تو اسے جھکا لئے اور وہ شاخ تر کی طرح جھک جائے، کوئی چاہے تو اسے اپنی مرضی کے مطابق موڑ لے اور وہ موم کی طرح مڑ جائے کوئی چاہے تو اسے خرید لے اور وہ دکان کا سودا بن کر بک جائے، کوئی چاہے تو اسے اپنی رائے کے مطابق ڈھال لے اور وہ پگھلے ربڑ کی طرح قالب میں ڈھل جائے اور کوئی چاہے تو اسے اپنا غلام بنالے اور وہ پالتو پرندے کی طرح پنجرے میں آرام سے بیٹھ جائے، ایسے شخص کے لئے دنیا وسیع بھی ہے لذیذ بھی ہے دل آویز بھی ہے لطف اندوز بھی ہے سرور انگیز بھی ہے اور دل نواز بھی مگر وہ لوگ جو سورج مکھی نہ ہوں جو ہر شمع کے پروانے نہ ہوں جو ہر محفل کی زینت نہ ہوں جو ہر پالکی کے کہار نہ ہوں جو ہر بارات کے شامل باجے نہ ہوں جو ربڑ کے موزے نہ ہوں اور جو ہر بت کے پجاری اور ہر قبر کے مجاور نہ ہوں ان کے لئے زندگی کٹھن اور ان کی قسمت دارورسن ہوتی ہے۔ لیکن یہ ان کا دل پسند سودا ہوتا ہے وہ زندگی کو نعمت تو جانتے ہیں لیکن اس قدر غنیمت بھی نہیں کہ عہد کم ظرف کی ہر بات گوارا

کرتے چلے جائیں۔

نہیں یہ شان خوداری، چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے، کوئی زیبِ گلو کر لے

ان کے لئے جیل ایک کھیل، پھانسی کا تختہ ایک دلچسپ مشغلہ اور قید تنہائی ایک طرح کی انجمن آرائی ہوتی ہے، انہیں نظامِ جبر سے بغاوت کرتے ہوئے کوئی ندامت محسوس نہیں ہوتی اور وہ شہادت کے شوق میں ہنسی خوشی موت کا طوق گلے میں ڈالنے کو تیار رہتے ہیں اس لئے کہ سیاست ان کے لئے پیشہ نہیں ایک مقدس فریضہ ہے جسے وہ ہر حال میں ادا کرنا چاہتے ہیں خواہ بیچ بازار ہو یا سر دار، اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا، وہ مقتل میں بڑی شان سے جاتے او اپنی آن سلامت رکھتے ہیں وہ مر کر بھی سرِ کفن کج رکھتے ہیں تا کہ عشق کے بانکپن پر حرف نہ آئے وہ حسن البناء حسن الہفیبی، سید قطبؒ، احمد اللہ شاہ مدارسیؒ، کفائت اللہ کافیؒ جیسے شہداء ہوں یا مولانا مودودی، عطاء اللہ شاہ بخاری، اور مولانا عبد الستار خان نیازیؒ جیسے مردان حر اور سرفروش ہوں کبھی خون میں نہا کر اور کبھی خاک میں مل کر یہ لوگ ہمیشہ نئی پوشاک میں نظر آئے، اور انہی کے دم سے داستان عزیمت آبرومند ہے

ماضی مرحوم کے آثار کو آواز دو

۵۳ء کا زمانہ بہت پرانا نہیں جب مارشل لاء کورٹ نے جرم بیگناہی میں مولانا مودودی اور مولانا نیازیؒ کو سزائے موت دی تھی تو یہ نہ گھبرائے اور نہ گھگھیائے سزائے موت کا فیصلہ سن کر مولانا مودودی نے وہ جملہ کہا جو تاریخ کا روشن حوالہ بن چکا ہے۔

"موت و حیات کے فیصلے زمینوں پر نہیں آسمانوں پر ہوتے ہیں اگر خدا کو میری موت منظور نہیں تو یہ لوگ الٹے بھی لٹک جائیں مجھے تختہ دار پر نہیں لٹکا سکتے۔

جب مولانا مرحوم کو گورنر جنرل کے سامنے رحم کی اپیل کرنے کو کہا گیا تو انہوں

نے فرمایا۔

”کسی انسان کے سامنے رحم کی اپیل میں تو کیا میری جوتی کی نوک بھی نہیں کرے گی۔“

اور دنیا جانتی ہے کہ مولانا کی پھانسی کا فیصلہ ہوا میں بکھر گیا اور ان کا یہ جملہ ہمیشہ کے لئے امر ہو گیا اسی کیس میں جب مولانا نیازیؒ سے پروانہ موت پر دستخط کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے تنک کر کہا

”جب میں پھانسی کا رسہ چھوم کر گلے میں ڈالوں گا تو وہی میرے دستخط ہوں گے۔“

یہ لوگ برسوں جیل میں رہے مگر مجال ہے حکومت وقت سے کوئی رعایت مانگی ہو کوئی سہولت طلب کی ہو یا حرف شکایت لب پر آیا ہو۔

مولانا محمد علی جوہر پر جب بغاوت کا مقدمہ چلا اور ہر ایک کو توقع تھی کہ سزائے موت ہو گی مگر قید کا فیصلہ سنایا گیا تو مولانا جوہرؒ بجائے خوش ہونے کے اداس ہو گئے اور برجستہ ایک شعر موزوں کیا۔

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا
دیکھئے کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

صرف انہی چند لوگوں پہ موقوف نہیں جس نے بھی شعوری طور پر اس راہ پر قدم رکھا اسے اس جھاڑ جھنکار سے ضرور واسطہ پڑا، خواہ سیاست اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے ہو، کمیونسٹ انقلاب کے لئے ہو، استخلاص وطن کے لئے ہو، شہری آزادیوں کے لئے ہو، طبقاتی حقوق کے لئے ہو یا کالے قوانین کے خلاف ہو، یہ منزل انہی راہوں سے گزر کر ملتی ہے۔ قید و بند اور دار و رسن کی راہ

جز دار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ
ناچار گنہ گار سوئے دار چلے ہیں

چین کا ماؤزے تنگ ہو ویت نام کا ہو چی منہ ہو، کیوبا کا فیڈل کاسٹرو ہو، جنوبی افریقہ کا نیلسن منڈیلا ہو، زمبابوے کا رابرٹ موگابے ہو، پولینڈ کا لیخ ولیسیا ہو، الجزائر کا احمد بن باللہ ہو، انڈونیشیا کا سوئیکارنو ہو، ہندوستان کا سبھاش چندر بوس ہو، ایران کا خمینی ہو، فلپائن کا اکینو ہو، یا لاطینی امریکہ کا چی گویرا اور لومبیا ہو سب اسی راہ کے راہی ہیں۔ اختلافِ فکر و نظر اپنی جگہ لیکن کردار کا یہ پہلو بہر حال قابل ذکر اور قابل قدر ہے۔ لیکن جو لوگ سیاست برائے تجارت اور قیادت برائے حکومت کے قائل ہوں اور حادثہ وقت انہیں ...... لیڈر ...... بنا دے تو پھر ایسے لوگ نہ وعدہ معاف گواہ بننے میں دیر لگاتے ہیں اور نہ طویل معافی نامے لکھنے میں تاخیر کرتے ہیں۔

ہندوستان کی ایک صدی کی تاریخ حریت وطن کے جانبازوں کی تاریخ ہے۔ انگریز نے کہاں کہاں ٹکٹکی نہیں لگائی کہاں کہاں سولیاں نہیں گاڑیں، کہاں کہاں جلاد مقرر نہیں کئے، اور کہاں کہاں پھانسی گھاٹ نہیں بنائے، لیکن جو سوچ کر اس وادی غربت میں اترے تھے انہیں دور تک یاد وطن سمجھانے آئی مگر انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، ان لوگوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی لیکن تھے دونوں نظریاتی محض ”اقتدار کے باراتی“ نہیں تھے اس لئے وہ اپنے پاؤں پر جمے رہے بقول شورش

زیادہ دن نہیں گزرے یہاں کچھ لوگ رہتے تھے
جو دل محسوس کرتا تھا علی الاعلان کہتے تھے
گریباں چاک دیوانوں میں ہوتا تھا شمار ان کا
قضا سے کھیلتے تھے، وقت کے الزام سہتے تھے

رہ گئے وہ لوگ جو انگریزوں کے بوٹ چاٹ کر بڑے بنے، اسلاف کی قبریں بیچ کر نمایاں ہوئے، اہل وطن کی مخبریاں کر کے مقتدر ٹھہرے، ضمیر گروی رکھ کر کبیر و شہیر کہلائے، خفیہ ایجنسیوں کی انگلی پکڑ کر آگے بڑھے اور جرنیلوں کی تھپکی سے ”توپ

خان'' بنے وہ نہ میدانوں میں سرخرو ہوئے اور نہ زندانوں میں، کوئی ابوالکلام آزاد کے دفترِ عمل سے تو معافی نامہ نکال کر دکھائے کوئی حسرت موہانی کے چہرے پر حسرت و ندامت کی سلوٹ تو دکھائے؟ کوئی محمد علی جوہرؒ کا حرف شکایت تو سامنے لائے؟ کوئی عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی پیشانی پر داغ سجدہ کی نشاندہی تو کرے؟ کوئی مولانا مودودیؒ کے پائے استقلال میں لغزش کا سراغ تو لگائے، کوئی ظفر علی خانؒ کے لہجے میں تھکاوٹ کے آثار تو بتائے؟ کوئی شورش کاشمیریؒ کی چال میں ٹیڑھ تو ڈھونڈھ کر لائے؟ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ یہ لوگ سیاسی کربلا میں سر کٹانے کے لئے آئے تھے دربار یزید کی رونق بڑھانے کے لئے نہیں لیکن جب سے نودولیتے اس کوچے میں داخل ہوئے سیاست کو کوچہ رسوائی بنا کر رکھ دیا ہے۔ صاف بات ہے جب ہر بوالہوس حسن پرستی شعار کرے گا تو آبروئے اہل نظر کیوں کر محفوظ رہ سکے گی؟

عالمی اسلامی نیوز ایجنسی کا قیام

آج کا دور بلاشبہ ابلاغ کا دور ہے اور ابلاغ کی اہمیت آئندہ چند برسوں میں آج کے مقابلے میں کئی گنا بڑھ جائے گی اور کچھ عجب نہیں کہ آئندہ بہت سے یا سارے فیصلے میدانوں اور مذاکرات کی میزوں کے بجائے ابلاغ کے مراکز میں بیٹھ کر ہوں اور دنیا خود بخود ان فیصلوں کو مانتی اور اپنے اوپر نافذ کرتی چلی جائے، ابلاغ کی اس قوت اور کثرت نے شرق و غرب اور عرب و عجم کے فاصلے سمیٹ کر کرۂ انسانی کو ایک ''عالمی گاؤں'' میں بدل دیا ہے آج کی خبر ''آج'' بلکہ ''ابھی'' کا سکہ رواں ہے خبر رسانی کی یہ تیز رفتاری افکار و خیالات کو مرتب اور منتشر کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کر رہی ہے دنیا کا منظر بنانے اور بگاڑنے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے رائے عامہ کو موافق اور مخالف کرنے میں اسے کمال حاصل ہو گیا ہے۔ سائنسی ایجادات، علمی خیالات، فکری انکشافات اور سیاسی حالات کو بیک وقت ایشیا سے یورپ اور امریکہ سے افریقہ منتقل کرنے میں سب سے زیادہ حصہ خبر رسانی کی اس جدید منظم اور مربوط ٹیکنیک کا ہے۔ جوں جوں ابلاغ اور عالمی رابطے کی ضرورت بڑھی تو اس نظام کو باقاعدہ اور موثر بنانے کے لئے کسی نیوز ایجنسی کے قیام کا خیال پختہ ہونے لگا جس کے نتیجے میں ۱۹۲۲ء میں پہلی باضابطہ نیوز ایجنسی قائم ہوئی اور پھر عالمی سطح کی خبر رسان ایجنسیاں معرض وجود میں آگئیں، کسی زمانے میں ہدہد نے پلک جھپکتی دیر میں تخت بلقیس کو دربار سلیمانؑ میں

حاضر کیا تھا آج نیوز ایجنسیاں اتنی ہی دیر میں دنیا بھر کی خبروں کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیتی ہیں۔ یہ نیوز ایجنسیاں اب انتہائی طاقتور منظم اور موثر اداروں کی شکل اختیار کر گئی ہیں۔ رائٹر، اے ایف پی اور اے پی جیسے عالمی ادارے، ''خبر کی دنیا'' پر پوری طرح حاوی ہیں، عالم اسلام جہاں دیگر میدانوں اور شعبوں میں بہت پیچھے ہے وہاں وہ خبر اور ابلاغ کے حوالے سے بھی بہت پچھلی صفوں میں نظر آیا ہے حالیہ اسلامی سربراہی کانفرنس میں ملائشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد نے ایک ''عالمی اسلامی نیوز ایجنسی'' کے قیام کی تجویز پیش کی اور اس کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا بعد ازاں ایک عالمی نشریاتی ادارے سے انٹرویو کے دوران جنرل پرویز مشرف نے بھی اس تجویز کی حمائیت اور اس کی افادیت پر اظہار خیال کیا۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ عالمی ابلاغیاتی ادارے جس طرح اسلامی افکار و تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں، عالم اسلام کی پالیسیوں اور رویوں کو جس انداز میں بیان کیا جا رہا ہے اور مسلم دنیا کے بارے میں جس مکروہ تاثر کو ایک خاص زاویے سے اور مہم کے انداز میں نشر کیا جا رہا ہے اس نا قابل رشک تصویر کشی پر مسلمانوں کا احتجا بجا تو ہے لیکن محض احتجاج مسئلے کا حل اور دکھ کا مداوا نہیں اس پروپیگنڈے کا ازالہ صرف ایک ہی صورت میں ممکن ہے کہ ایک آزاد خود مختار، ذمہ دار اور واضح وژن رکھنے والی ''نیوز ایجنسی'' قائم کی جائے اور پوری ملت اسلامیہ کے احوال و افکار اور مسائل و معاملات کی ترجمان ہو اس کا یہ ہرگز مقصد نہیں کہ وہ بھی ایک پروپیگنڈہ آرگن اور منفی مقاصد و نفسیات کی حامل ہو بلکہ یہ نیوز ایجنسی اس گرد کو ہٹانے کا کام کرے جو مسلم دنیا کی فکر اور اسلام کے رخ پر ڈالی جا رہی ہے۔ اس ایجنسی پر اٹھنے والے اخراجات تو تمام اسلامی ممالک مل جل کر برداشت کریں لیکن اس کا سارا نیٹ ورک، انتظامی ڈھانچہ اور مالیاتی تانا بانا بالکل آزاد ہو اس پر نہ کسی مسلم ملک کا

انتظامی اجارہ ہو اور نہ مالیاتی قبضہ تاکہ یہ کسی خاص ملک اور اس کے حکمران کی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام اور امت کی ترجمان ہو، اس کا حقیقی نصب العین اسلام کی حیات آفرین تعلیمات کو اجاگر کرنا، مسلم عوام اور تمام اقوام تک امت کا نقطہ نظر پہنچانا، مغربی نیوز ایجنسیوں اور ذرائع ابلاغ سے نشر ہونے والی گمراہ کن اطلاعات اور خرافات کا ازالہ کرنا اور عالم اسلام کو درپیش مسائل کا حل پیش کرنا ہو۔ ایک عرصے سے عالمی نیوز ایجنسیاں کسی حد تک اپنی غیر جانبداری کھو کر مبہم کے انداز میں اسلام کے سیاسی وثقافتی اور اخلاقی وقانونی نظام کے بارے میں انٹ شنٹ اور غلط مسلط معلومات اور اعداد و شمار پیش کرنے لگی ہیں ان کا جواب دینا اور صحیح صورتحال سے اقوام عالم کو آگاہ کرنا، عالمی اسلامی نیوز ایجنسی کا بنیادی فنکشن ہونا چاہیے، اس وقت حالت یہ ہے کہ سوڈان کی خبر پاکستان کو اور ملائیشیا کی خبر ایران کو اپنے ذرائع سے نہیں مغربی ذرائع ابلاغ سے ملتی ہے۔ عالمی ایجنسیاں الفاظ کے انتخاب اور حروف کی نوک پلک سے وہ مفاہیم ومطالب لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں اتارتی ہیں کہ پتہ بھی نہیں چلتا اور فکری حادثہ بھی برپا ہو جاتا ہے ایسی مجوزہ نیوز ایجنسی پرائیویٹ اور پبلک دونوں سیکٹرز میں قائم ہو سکتی ہے افراد یا حکومتیں دونوں سرکایہ کاری کر سکتے ہیں۔ لیکن اس باب میں تین پہاڑ ایسے مسائل ہیں جو اس راہ میں درپیش ہیں یا پیش آ سکتے ہیں ان پر قابو پانا، بڑے حوصلے اونچے ظرف اور مثالی ایثار سے ممکن ہے ورنہ نہیں۔

اولاً: عالم اسلام کا سیاسی وحکومتی ڈھانچہ تین چار ممالک کو چھوڑ کر یا تو شاہی ہے یا پھر فوجی اور آمرانہ کیا، ایسے حکمران "بے آمیز اطلاع اور بے لاگ خبر" کے متحمل ہو سکتے ہیں؟ ظاہر ہے مجوزہ نیوز ایجنسی تو بہت غیر جانبدار اور آزاد و خود مختار ہو گی تبھی اس کی Credbility بن سکے گی۔

ثانیاً: کیا مسلم دنیا میں پیشہ ور ماہرین اور اسکے ساتھ ساتھ اسلام سے

committed افراد کی اتنی تعداد موجود ہے جو اس عالمی نیٹ ورک کو اس کے حقیقی اور عملی تقاضوں کے مطابق چلا سکے؟ ممکن ہے ہنر مند پیشہ ور اور ماہرین شعبہ تو مل جائیں مگر ان کی اسلامی فکر سے والہانہ اور سچی وابستگی نہ ہو اور اس طرح مخلص اور ایثار پیشہ لوگ تو دستیاب ہوں مگر فنی مہارت اور جدید ٹیکنیک سے لیس نہ ہوں، اس صورت میں بھی یہ جواب تشنۂ تعبیر ہی رہے گا۔

ثالثاً: یہ منصوبہ یقیناً کروڑوں ڈالر کا ہے کیا کوئی حکمران یا ایک فرد یا متعدد افراد اور کوئی پرائیویٹ ادارہ اپنے دین اور ملت کے مجموعی مفاد سے اتنا مخلص اور اپنے سیاسی و معاشی مفادات سے بلند و بالا ہے کہ وہ اس قدر سرمایہ صرف اس لئے خرچ کر ڈالے کہ جس سے اس کا کوئی سیاسی و مالی مفاد نہ ہو؟ اگر درمیان میں کسی حکومت کا سیاسی، کسی فرد یا افراد کا مالی اور کسی ادارے اور جماعت کا گروہی مفاد آڑے آ گیا تو پھر یہ منصوبہ حقیقی مقاصد حاصل نہیں کر سکے گا۔ گویا ایسی ایجنسی کے قیام کے لئے وژن فنی مہارت اور ایثار تین بنیادی تقاضے ہیں اگر یہ پورے ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر اسلام اور اپنے عقیدے سے اخلاص اور امت پر احسان اور کوئی نہیں ہوگا۔

حلقے چھوٹے، ممبر زیادہ اور مراعات کم

اگرچہ ہم نصف صدی میں رنگا رنگ کی حکومت اور مختلف قسموں کی جمہوریت دیکھ چکے ہیں مگر مسئلہ ایک بھی حل نہیں ہوا، سب تجربوں کے باوجود نہ سیاسی استحکام آیا اور نہ معاشی ترقی ہوئی، تیر خود نہیں چلتا ماہر تیز انداز کی ضرورت ہوتی ہے اور تلوار خود جوہر نہیں دکھاتی کوئی تیغ زنی درکار ہوتی ہے اس طرح کوئی نظام خود بخود ثمرات و برکات بانٹنے نہیں لگ جاتا جب تک اس نظام کو چلانے والے دیانتدار، اعلیٰ ظرف، نیک نیت اور مخلص نہ ہوں۔

ہر دور میں مختلف تجاویز سامنے آئیں، لیکن بارآور ایک بھی نہیں ہوئی اس کا واحد اور بنیادی سبب تو ایک ہی ہے جس پر ہم بوجوہ غور کرنے کو تیار نہیں اور اپنا آپ بدلنے پر آمادہ نہیں اور اسی کو فیض نے شعر کی زبان عطا کی ہے۔

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

یعنی نظام بنانے اور چلانے والوں کی جب یہ نیت ہی نہ ہو کہ نظام چلے تو از خود وہ کیسے چل پڑے گا اور منزل پالے گا؟ مجھے یاد ہے ایک بار مرحوم محمد طفیل مدیر نقوش کا ایک خط مجھے ملا جس میں انہوں نے لکھا کہ "فلاں تاریخ کو میرا خط آپ کو نہیں ملا ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ میں نے بھیجا ہی نہیں تھا" ظاہر ہے جب خط روانہ ہی نہیں

کیا گیا تو وہ ملے گا کیسے؟ کچھ ایسا ہی لطیفہ پوری قوم کے ساتھ نصف صدی سے ہو رہا ہے کہ جب نظام بدلا ہی نہیں گیا تو قوم کا مقدر کیوں کر بدلتا؟ اگر چہ نظام بنے بہت مگر چلا ایک بھی نہیں اس لئے کہ چلانے والوں کا یہ ارادہ ہی نہیں تھا ورنہ کچھوا بھی چل پڑے تو تمام تر سست رفتاری کے باوجود وہ آخر جہاں پہنچنا ہے پہنچ ہی جاتا ہے یہ تسلیم ہے کہ ہمارے چارہ گروں نے گاہے بگاہے خرگوش کی طرح قلانچیں ضرور بھریں مگر حسب معمول ''خوابِ خرگوش'' میں مبتلا ہو گئے اور ملک اب تک ابتلاء میں ہے مگر ہم بھی کیا کریں چارہ گر اپنی خو نہیں بدلتے تو ہم اپنی وضع کیوں بدلیں؟ اس لئے تجاویز دینے سے باز نہیں آتے اگر چہ انجام معلوم ہے، موجودہ حکومت یقیناً کچھ تبدیلیاں لانے کے موڈ میں ہے اللہ کرے کہ موڈ قائم رہے۔

بہت سی باتیں ہو چکیں کچھ مزید مختلف حلقوں سے سامنے آئیں گی۔ ووٹروں کے بارے میں، امیدواروں کے متعلق، طریقِ انتخاب اور تشکیل حکومت کے حوالے سے یقیناً یہ مشورے اہم اور لائق توجہ ہوں گے ایک تجویز فقیرِ سرراہ کی بھی ہے اور وہ یہ کہ انتخابی حلقے چھوٹے کر دیئے جائیں ممبرز بڑھا دیئے جائیں اور ان کی مراعات کم کر دی جائیں تا کہ متوسط طبقے کو بھی انتخابی میدان میں اترنے کا موقع مل سکے اور قومی دولت پر بوجھ کم ہو سکے۔

اس باب میں اب کوئی دوسری رائے نہیں ہے کہ ہماری سیاست ایک عالی شان کاروبار بن چکی ہے اور بات ہزاروں سے چل کر لاکھوں میں گئی اور اب کروڑوں تک پہنچ چکی ہے پاکستان کی آبادی تیرہ کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے اور پارلیمنٹ کے ارکان کی تعداد 237 ہے بلکہ اب تو ہو چکی اور اس کے مقابلے میں جرمنی کی آبادی چھ کروڑ ہے لیکن وہاں کی پارلیمنٹ ساڑھے چھ سو سے زائد ارکان پر مشتمل ہے جاپان ہم سے چھوٹا ملک ہے اس کے ایوان زیریں یعنی قومی اسمبلی کے ممبروں کی تعداد پانچ

سوا او پر ہے۔ ترکی کی آبادی ہم سے نصف ہے لیکن اس کی گرینڈ نیشنل اسمبلی کے ارکان ساڑھے پانچ سو ہیں۔ برطانیہ کی پارلیمنٹ ۱۹۵۴ میں ۱۷۲ کی تھی جب کہ اب اس کے ہاؤس آف کامنز کے ممبران ساڑھے چھ سو ہیں۔

دنیا بھر میں تقریباً ایک حلقہ ایک لاکھ آبادی کا ہوتا ہے جب کہ ہمارے ہاں چھوڑے سے چھوٹا انتخابی حلقہ دو لاکھ سے کم نہیں، اور بعض حلقے پانچ لاکھ سے اوپر آبادی پر مشتمل ہیں اتنے بڑے حلقے کو اپروچ کرنا ظاہر ہے متوسط کلاس کے لئے ناممکن ہے اس کے لئے کروڑ پتی افراد درکار ہیں جو انتخابی مہم چلا سکیں اور نیٹ ورک بنا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب بڑی پارٹیاں کسی نظریے شخصی اہلیت اور جماعتی منشور کے مطابق کسی کو اپنا امیدوار نہیں بناتیں بلکہ صرف جیتنے والے کو ٹکٹ دیتی ہیں اور جیت کے لوازم میں زر و مال بہت نمایاں ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ حلقے چھوٹے کر دیئے جائیں تاکہ امیدوار اپنے ووٹروں سے رابطہ بھی رکھ سکے، لوگ اس کے بارے میں جانتے بھی ہوں اور امیدوار دولت کے بل پر نہیں اہلیت کی بنیاد پر لوگوں کے ووٹ بھی حاصل کر سکے، یہ اعتراض بے معنی ہے کہ ڈھائی سو ارکان نے یہ حشر اٹھا رکھا ہے اگر ان کی تعداد دگنی ہو جائے تو پھر زلزلے ہی آئیں گے اس کا حل یہ ہے کہ ممبران کی مراعات ختم یا کم کر دی جائیں۔ یہ رواج صرف ہمارے جیسے ممالک میں ہوتا ہے ورنہ فرانس، جرمنی، جاپان اور برطانیہ میں نہیں ہوتا کہ ممبروں میں کوٹے تقسیم ہوں، پلاٹ بانٹے جائیں اور پانچ پانچ کروڑ کی ترقیاتی فنڈ کے نام پر گرانٹ دی جائے، اور ساتھ ساتھ ہر دفتر کے ہر کام کو ان کے ساتھ منسلک کر دیا جائے، پلاٹ، ٹھیکے، پرمٹ، لائسنس اور نقد فنڈ کا قانون ساز ادارے کے ممبران سے کیا تعلق؟

ویسے اگر مراعات کم کر دی جائیں تو بڑے بڑے جاگیرداروں اور ووٹروں کی

دلچسپی بھی اس شعبے سے کم ہو جائے گی اگر انہیں یہ معلوم ہو کہ ہم نے قانون سازی
کرنی ہے۔ ''چوہدری بازی'' نہیں تو وہ اس ''کارِ فیض'' سے ویسے ہی اکتا جائیں گے
ممبری کی کلغی سر پر سجانے کا شوق ہوتا ہی اس لئے کہ آدھے کرائے پر جہازوں کی سیر
کریں۔ سرکاری خرچ پر علاج ہو، تھانے کچہری میں ان کے رقعے چلیں، ڈی سی اور
کمشنران کا کہا مانیں، بنک انہیں بغیر گارنٹی کے قرضے دیں ان کی مرضی سے تبادلے
ہوں اور ہر محکمے میں ان کے لئے ملازمت کا کوٹا ہو اگر یہ سب کچھ نہیں تو ارباب زرو
مال مفت کا ''چلہ کاٹنے'' پر کبھی تیار نہیں ہوں گے حلقے چھوٹے اور ممبر بڑھنے سے کام
کی رفتار تیز ہو گئی، رابطہ عوام بہتر ہو گا، مشاورت کا حلقہ وسیع ہو گا اور اجارہ داری کا
رجحان ختم ہو گا، یہ انتخابی نظام کی تبدیلی کا محض ایک پہلو ہے۔ ورنہ بہت سی اصلاحات
درکار ہیں تا کہ جمہوریت کی تلاش کا سفر رائیگاں نہ جائے، ارکان اسمبلی کے لئے صرف
تنخواہ اور ریسرچ الاؤنس ہو اور یہ بھی ملکی وسائل کو مدنظر رکھ کر طے کیا جائے، اس کے لئے
شرط یہ ہے کہ ملک کے مقتدر حلقے پارلیمنٹ کو ''قانون سازی'' کا ادارہ بنائیں، حکومت
سازی کا ذریعہ نہ بنائیں جس کی خاطر مراعات کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔

نو گرفتارِ محبت پہ خدا رحم کرے،

مثل مشہور ہے اونٹ کو مہمان بنانا ہو تو دروازہ اونچا رکھنا پڑتا ہے اس طرح سیاست کرنی ہو تو قید و بند اس کے لئے لازمی مراحل ہیں، سواد کوئے جاناں کے لئے قدم قدم بلاؤں کا استقبال کرنا ہی پڑتا ہے، لیکن ہمارے ہاں دو طرح کے سیاستدان پائے جاتے ہیں ایک وہ جن کے نصیب میں پچاس سال سے کوڑے لکھے ہیں اور دوسرے وہ جنہیں ہمیشہ اقتدار کے ''پکوڑے'' ملے ہیں اور سیاستدانوں کا یہ دوسرا طبقہ ہر دور میں غالب اور حاوی رہا ہے۔ یوں تو ملک میں بہت سی سیاسی جماعتیں اور بہت سے سیاستدان ہیں مگر مسلم لیگ اور اس کے لیڈروں کا خمیر اور مزاج سب سے مختلف ہے قائداعظم کے بعد کم از کم مسلم لیگ کبھی سیاسی جماعت نہیں رہی بلکہ وہ ''پاور کلب'' بنی رہی اور کم و بیش یہی حال اس کے لیڈروں کا ہے۔ کسی حکمران کو جب بھی کسی سیاسی جماعت کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے بجائے کوئی نئی جماعت کھڑی کرنے کے مسلم لیگ کو آواز دی، تو وہ یہ کہتے ہوئے حاضر ہو گئی۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے، چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

اس وقت پہلی بار مسلم لیگ اور اس کے لیڈروں پر ''پیغمبری وقت'' آیا ہے، ٹھنڈی چھاؤں کے پلے لوگ پہلی بار کڑی دھوپ میں کھڑے ہیں۔ لذت وصل کے عادی پہلی بار اذیت ہجر سے دوچار ہوئے ہیں۔ کوئے یار کے راہی پہلی بار سوئے

دار چلے ہیں جام بکف پہلی بار تلخی ایام سے آشنا ہوئے ہیں۔ اور حجلہ اقتدار کے باسی پہلی بار کوچہ وبازار میں نکلے ہیں ماہر القادری نے سچ کہا ہے۔

نو گرفتارِ محبت پہ خدا رحم کرے
آج اس شخص کی پہلی شبِ تنہائی ہے

میاں نواز شریف جب سے صفحہ سیاست پر ابھرے ہیں ان کی سیاسی زندگی کسی ریاضت اور مشقت سے نہیں حکومت سے عبارت رہی ہے۔ پہلا قدم اٹھایا اور وزارت خزانہ کی دہلیز پر دھرا، اگلا زینہ وزارت علیا کا تھا، اور قسمت کے اس دھنی کا اگلا پڑاؤ وزارت عظمیٰ تھا۔

چراغ سے یہ بدلنا پہلی دفعہ ظلمت زنداں کی نذر ہوئے ہیں اور کانچ کے یہ پیکر پہلی مرتبہ دیوارِ سنگ سے ٹکرائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے حکومت گئی ہے اسی دن سے مسلم لیگ لرز رہی ہے۔ جوار بھاٹا کے موسم میں سمندر کے اندر اتنی موجیں نہیں ابھرتیں جس قدر آج کل مسلم لیگ میں لہریں اٹھ رہی ہیں۔ بیگم صاحبہ کا اپنا رخ ہے راجہ ظفر الحق اور چوہدری شجاعت حسین کی اپنی سوچ ہے، اعجاز الحق کا اپنا ایجنڈا ہے میاں اظہر کی تان سب سے مختلف ہے۔

شیخ رشید اور تہمینہ دولتانہ کا اپنا انداز ہے خورشید قصوری، فخر امام اور عابدہ حسین کا اپنا زاویہ ہے۔ آپ با آسانی کہہ سکتے ہیں کہ جتنے لیڈر ہیں اتنے ہی فکر وعمل کے دھارے ہیں مسلم لیگ کبھی سیاسی پارٹی ہوتی تو اس میں سیاسی ہم آہنگی اور یکسوئی نظر آتی اس میں شامل ہونے والا ہر شخص ظاہر ہے پھول چننے آتا ہے، کانٹوں سے الجھنے کیلئے تو نہیں آتا ان میں سے چند ایک کو چھوڑ کر باقی وہ لوگ جو ہر دور میں مختلف جماعتوں کا چکر لگا اور متعدد حکومتوں کا ذائقہ چکھ چکے ہیں بالآخر مسلم لیگ کے دامان عافیت میں انہیں قرار ملا ہے لیڈر ہو یا جماعت اس کی پرکھ خوشیوں کے طلاطم میں نہیں بلکہ غموں کے ہجوم میں ہوتی ہے۔ اپنے پرائے کھرے کھوٹے، پکے کچے، مخلص منافق

اور مجاہد اور مجاور میں فرق دور ابتلاء میں محسوس ہوتا ہے۔ مشہور اور مجرب بات ہے کہ انسان کی ہنسی میں ہر ایک شریک ہوتا ہے مگر اسے رونا اکیلے پڑتا ہے۔ ۵۸ء سے اقتدار کا ہما مسلم لیگ کے سر پر بیٹھا اور سارے مرغانِ بادنما اس کے گرد جمع ہو گئے، یہ کیسے ممکن ہے کہ چوری کھانے والا طوطا کبھی روکھی سوکھی گوارا کر لے۔؟

ایک وقت تھا کہ پاکستان کے عوام اتنے نہیں تھے جتنے ایوب خان کی کنونشن لیگ کے ممبر تھے مگر جب اقتدار کا سایہ ڈھلا تو ۷۰ء کے انتخابات میں کنونشن لیگ کا کوئی ٹکٹ لینے والا نہ تھا اور پورے پاکستان سے صرف جمال محمد کوریجہ منتخب ہوئے اور وہ بھی اپنے زور و بازو پر میاں فیملی اگر اپنی اور مسلم لیگ کی خیر خواہی چاہتی ہے تو وہ مظلومیت کی چادر اوڑھنے اور طعنوں سے کام نکالنے کی بجائے مسلم لیگی لیڈروں کو اپنی اپنی سوچ کے مطابق فیصلہ کرنے دے، میاں اظہر اپنی جماعت بناتے ہیں تو بنالیں، اعجاز الحق شوق پرواز پورا کر لیں، فخر امام اور عابدہ حسین جلے پھپھولے پھوڑ لیں، کوئی حقیقی سیاسی جماعت کبھی فراموشی طور پر وجود میں نہیں آتی۔ نہ وہ اقتدار کے سائے میں عمرِ خضر پاتی ہے سیاسی جماعت ہمیشہ سیاسی میدان اور عوام کے درمیان پرورش پاتی ہے اور اس کیلئے صحرا کی خاک چھاننا اور آزمائش کا دریا عبور کرنا ضروری ہے موجودہ مسلم لیگ کے پہلو سے اگر کوئی اور مسلم لیگ حکومت کی سویٹ وِل سے برآمد ہو بھی گئی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وقت آنے پر وہ بھی وہی مسلم لیگ بنے گی جو اِس وقت کی مسلم لیگ ہے بیساکھیاں تھوڑی دیر اور تھوڑی دور تک کام آتی ہیں اس کے بعد آدمی تھک جاتا ہے منزل اپنے قدموں پر چل کر ملتی ہے بیساکھی تھام کر نہیں۔

ہر دوسرے چوتھے سال سیاسی عمل روکنے کا سب سے بڑا سبب سیاسی جماعتوں میں سیاسی کلچر کا فقدان ہے جس روز ہمارے ہاں سیاسی کلچر رائج ہو جائے گا سیاسی استحکام خود بخود پیدا ہو جائے گا اور سیاسی کلچر کیا ہے؟ اپنے دستور و منشور کا پاس اور سچے اور جھوٹ کا احساس۔

فیصلہ

فوجی حکومت اندرونی اور بیرونی محاذ پر جس مخمصے کا شکار اور جس قانونی جواز کی تلاش میں تھی، بالآخر ۱۲ مئی ۲۰۰۰ء کو سپریم کورٹ کے ایک متفقہ فیصلے کے نتیجے میں وہ اس مخمصے سے نکلنے اور legitimacy حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔

اس فیصلے سے اتفاق و اختلاف کے تو بہت سے پہلو ہیں مگر یہ غیر متوقع ہرگز نہیں اس لئے کہ مولوی تمیزالدین کیس میں بھی ایسا ہی فیصلہ آیا، ایوب خان کے مارشل لاء کو بھی جواز دیا گیا یحییٰ خان کے خلاف فیصلہ تو آیا مگر جب انہیں اقتدار چھوڑے بیس ماہ گزر چکے تھے ضیاء الحق کو ایک بار پھر ''نظریہ ضرورت'' کے تحت تحفظ دیا گیا، جونیجو صاحب کی اسمبلی توڑ دی گئی اور حاجی سیف اللہ نے اس کے خلاف عدالت عظمیٰ کے دروازے پر دستک دی بظاہر فیصلہ ضیاء صاحب کے خلاف تھا (وہ بھی بعداز وفات) مگر عملاً ان کے حق میں، یعنی نہ تو اسمبلی بحال ہوئی اور نہ حکومت، بے نظیر حکومت کی برخاستگی بھی چیلنج کی گئی مگر یہ استدعا مسترد کر دی گئی نواز شریف کے خلاف ۵۸ بی کے تحت غلام اسحاق خاں نے اقدام کیا اگرچہ پہلی بار عدالت عظمیٰ نے پارلیمنٹ اور حکومت کی مگر صورت حال اس قدر بگڑ چکی تھی کہ بعدازاں خود وزیراعظم کو اسمبلی تحلیل کرنے کی سفارش کرنی پڑی، ایک بار پھر بے نظیر حکومت کے خلاف صدر فاروق لغاری نے آئینی اقدام کیا وہ بھی چیلنج ہوا مگر عدالت عظمیٰ نے اس اقدام کو درست قرار دے دیا۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جس پس منظر میں فوجی اقدام ہوا اسے چیلنج کیا گیا اور عدالت نے حالیہ فیصلہ سنایا اور یہ فیصلہ اس اعتبار سے بہت مختلف اور دلچسپ

ہے کہ سپریم کورٹ نے موجودہ انتظامیہ کو تین سال تک حکومت کرنے کی مہلت اور اپنا ایجنڈا مکمل کرنے کی اجازت دی اور ساتھ ہی آئین میں ترمیم کرنے کا اختیار بھی عطا کیا، البتہ چار دائروں میں حکومت کوئی آئینی ترمیم نہیں کر سکتی۔

۱۔ اسلامی دفعات میں کسی قسم کا رد و بدل کرنے کی مجاز نہیں۔

۲۔ عدلیہ کے موجودہ آئینی ڈھانچے اور اس کے اختیارات میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتی

۳۔ پارلیمانی نظام کی جگہ کوئی دوسرا نظام تجویز نہیں کر سکتی۔

۴۔ وفاق پاکستان کے استحکام و استقلال کے خلاف کوئی ترمیم نہیں لائی جا سکتی، فیصلے کا بین السطور بتا رہا ہے کہ عدالت کے سامنے تین راستے تھے۔

اولاً: پوری عدالت حکومت کے سامنے کھڑی ہو جاتی اور اس کے وجود اور جواز کی نفی کر دیتی اس کے لئے اجتماعی استعفوں کی نوبت آ سکتی تھی، مگر عدالت کا خیال ہوگا کہ اس طرح پورا ملک افراتفری اور انارکی کا شکار ہو جاتا، اس سے بہت سے فتنے اور مسئلے سر اٹھا سکتے تھے۔

ثانیاً: عدالت کلی طور پر Subnit کرتی اور اپنی معذوری اور مجبوری کا اظہار کر کے آئینی درخواست سننے سے انکار کر دیتی کہ پی سی او کے باعث یہ اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔

ثالثاً: جو کچھ بچ گیا اسی اندوختے کو بروئے کار لا کر درمیانی راہ اختیار کرتی اور اس نے اس راستے کو اپنے لئے منتخب کیا۔

اگرچہ یہی تیسرا راستہ بادی النظر میں حقیقت پسندانہ اور Pragmatic تھا سوائے اختیار کیا گیا لیکن بہر حال ارباب فکر و نظر اور اصحاب بصیرت و دانش کے لئے ابھی کئی سوال منتظر جواب ہیں سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ ملک میں بالادستی کس ادارے اور کس دستاویز کو حاصل ہے؟ پارلیمنٹ، عدلیہ یا فوج کو؟ اور اسی طرح طاقت یا آئین کو؟

جب تک اس بارے میں ہمارے ہر ادارے اور فرد کا ذہن صاف اور یکسو نہیں ہو جاتا حکومتوں اور اداروں کے بننے اور ٹوٹنے کا عمل ہر دور میں جاری رہے گا۔

فیصلے میں دو باتیں خاص طور پر اجاگر کی گئی ہیں ایک تو یہ ہے کہ آرمی چیف کا منصب ایک آئینی منصب ہے، آرمی چیف کو اس طرح معزول کیا جانا آئینی منصب کی توہین ہے دوسرے یہ کہ غلبہ بذات خود قانونی جواز ہے اور فقہ میں بھی، امیر متغلّب (occupant) کی اصطلاح موجود ہے یعنی جو حاکم غالب آ جائے اس کا آنا جائز ہے۔

سوال یہ ہے کہ وزیر اعظم کا منصب بھی آئینی ہے کیا جب بے نظیر اور نواز شریف کو دو دو مرتبہ اس منصب سے ہٹایا گیا تو ان سے مشورہ کیا گیا تھا؟ یا پہلے ان کو inform کیا گیا تھا تا کہ وہ اپنی صفائی پیش کر سکیں؟ بعد میں انہیں چارج شیٹ کرنا الگ بات ہے۔

رہ گیا امیر متغلّب کا تصور تو اس کا بدیہی مطلب تو یہ ہوا کہ اصل مسئلہ کسی دستور انتخاب مشورے اور عوام کی مرضی کا نہیں بلکہ غلبہ وقوت کا ہے، یعنی جو غالب آ جائے وہی برحق ہے جب کہ صدیوں سے یہ کشمکش برپا ہے کہ طاقت حق ہے یا حق طاقت ہے۔

اس باب میں دو گروہ ہر دور میں رہے ہیں ایک وہ جو طاقت کو حق قرار دیتا رہا اور دوسرا وہ جو حق کو طاقت کہتا رہا تا کہ انسان پر طاقت کو نہیں حق کو غالب آنا چاہیے حق سے مراد استحقاق ہے اصول ہے میرٹ ہے، معیار ہے جب کہ طاقت کسی استحقاق میرٹ، اصول اور اصول کی نفی کا نام ہے۔

اگر منطق، دانش اور دلیل اس امر پر صرف کی جائے دنیا بھر سے حوالے ڈھونڈھے جائیں کتابیں کھنگالی جائیں اور دماغ لڑایا جائے کہ جو متغلّب ہے اس کے غلبے کو قانوناً تسلیم کر لیا جائے اور اسے اخلاقی و قانونی جواز فراہم کیا جائے تو یہ ایک لا حاصل کاوش ہے اس لئے کہ غلبہ خود اپنی دلیل ہے اسے دائیں بائیں سے دلائل

ڈھونڈنے اور فراہم کرنے کی کوئی محتاجی اور مجبوری نہیں۔

ہر ایک جانتا ہے کہ ازل سے اب تک موجود اور مطلوب کی بحث چل رہی ہے کیا ہے؟ اور کیا ہونا چاہیے؟ جو موجود ہے وہ تو ہے ہی، ارباب نظر کی دلچسپی ہمیشہ مطلوب سے رہی ہے یعنی کیا ہے۔ یہ مسئلہ نہیں بلکہ کیا ہونا چاہے اصل سوال یہ ہے اور یہی کدوکاوش کا اصل میدان رہا ہے مثلاً ہم اپنی سیاست میں دیکھتے ہیں کہ اگلی صفوں میں وہ ہوتا ہے ممبر وہ بنتا ہے اور وزارت کا حقدار وہ ٹھہرتا ہے جس کے پاس پیسہ ہو جو بڑی برادری اور جھتہ رکھتا ہو اور جسے تھانے کچہری اور اعلیٰ حکومتی حلقوں میں اثر و سورخ حاصل ہو یہ امر موجود ہے تو کیا اس کو جائز سمجھ لیا جائے اور قرار دیا جائے کہ چونکہ فلاں شخص کے پاس دولت ہے برادری ہے سرکار حمائت ہے لہٰذا سیاسی صف میں بیٹھنے کا حق صرف اسے حاصل ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ امر مطلوب یہ ہے کہ کوشش کی جائے کہ سیاست پیسے برادری اور سرکاری حمائت کی بجائے کردار، علم، جذبہ خدمت اور اصول پر استوار ہو۔

ایک چیز کا ہونا اس کے جواز اور تقدس کی دلیل ہرگز نہیں، دلیل کی بنیاد پر غالب آنا اور غالب آ کر دلیل فراہم کرنا یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔

انسانی کی اجتماعی کاوش اور بصیرت اس بات پر صرف ہوتی چلی آ رہی ہے کہ ہر نظام اور انتظام کو کسی میرٹ اور اصول پر مبنی ہونا چاہیے تا کہ آج کے دور اور زمانہ قبل از تاریخ میں فرق پیدا ہو سکے۔ ورنہ غلبے کا دستور تو بہت پرانا ہے اسے فکر و قانون کی غذا مہیا کرنا چنداں ضروری بھی نہیں اور مفید بھی نہیں۔

بہرکیف یہ بحثیں چلتی رہی ہیں تاہم اب ایسا اجتماعی فیصلہ درکار ہے جو آئندہ کے لئے مینارہ نور بن جائے کہ روح اسلام اور روح عصر کے عین مطابق تمام معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں اور طاقت پر مشاورت کو فوقیت حاصل ہو، مشاورت کیا ہے؟ دستور اصول اور استحقاق کو فیصلوں کی بنیاد اور بالادستی کا معیار سمجھنا اور ماننا۔

''دلدل''

موجودہ فوجی حکومت جس رو ہم اور رآن سے آئی تھی اور اسے عوام کے خاموش تعاون نے جو اعتماد بخشا تھا، واقعہ یہ ہے کہ اب نہ تو حکومت کا وہ آن باقی ہے اور نہ عوام کا اطمینان، مولانا مودودی مرحوم نے ایک موقع پر کہا تھا۔

''ہر حکومت یہ کہتی ہے کہ وہ سابقہ حکومتوں کی غلطیاں نہیں دہرائے گی لیکن وہ نئی غلطیاں شروع کر دیتی ہے۔''

یہ ہر اعتبار سے درست تاثر ہے اس حکومت نے ممکن ہے پرانی غلطیاں نہ دہرائی ہوں مگر نئی غلطیاں اس سے بہر حال سرزد ہوئی ہیں میں نہیں جانتا کہ جنرل پرویز مشرف کو عوام کے احساسات کا صحیح طور پر ادراک اور علم ہے یا نہیں؟ اگر تو وہ باخبر ہیں تو پھر عوامی بے چینی کا ازالہ کیوں نہیں ہو رہا؟ اور اگر خاص حصار میں بند رہنے کے باعث لاعلم ہیں تو اس سے بڑھ کر ان کی محرومی اور کوئی نہیں ہو سکتی گویا ان کی حکومت بھی اب ''فارمولا گورنمنٹ'' بن کر رہ گئی ہے فارمولا گورنمنٹ کیا ہوتی ہے؟ اس کی موٹی موٹی نشانیاں یہ ہیں۔

۱۔ ساری دانش و حکمت کا سرچشمہ حکومتی ایوانوں کو سمجھ لیا جاتا ہے۔

۲۔ سارا دارومدار نقشوں اور فائلوں پر رہ جاتا ہے۔

۳۔ طاقت کا استعمال ہر مسئلے کے لئے ''شاہ کلید'' سمجھا جاتا ہے۔

۴۔ گرمجوشانہ استقبال، سپاسنامے، متعلقہ افسروں کی عارضی پھرتیاں اور اعداد و شمار کے گورکھ دھندے حکومت کی مقبولیت کا **Barometer** بن جاتا ہے۔

۵۔ ہر شعبہ زندگی میں جعلی اور متوازی قیادت ابھارنے کی کوشش کر کے اپنے لئے آسودگی اور اطمینان کا سامان ڈھونڈھا جاتا ہے۔

بدقسمتی سے یہ ساری نشانیاں آہستہ آہستہ ابھر رہی ہیں۔ حکومتی ایوانوں کے ہر فیصلے کو دانش و بصیرت کا مرقع قرار دے کر بغیر سوچے سمجھے آگے بڑھا دیا جاتا ہے، اس کی تازہ ترین مثال توہین رسالتؐ کے کیس میں طریق کار کی تبدیلی کا فیصلہ اور ایک جلوس کے نتیجے میں اس سے پسپائی ہے ورنہ ایک طے شدہ معاملہ کو بغیر کسی وسیع تر مشاورت اور پیشگی افہام و تفہیم کے اس طرح الجھا دینا فہم و بصیرت کی کوئی عمدہ دلیل نہیں۔

ٹیکسوں کی اصولی، احمدیوں کے بارے میں تبصرے، ضلعی حکومتوں کا خاکہ اور دینی مدارس کے سلسلے میں خاص ریمارکس یہ سارے شاخسانے فائلوں اور نقشوں کے ہیں زمینی حقائق اور گردوپیش کی نزاکتوں کو بہت کم ملحوظ رکھا جا رہا ہے۔

تاجروں کی پکڑ دھکڑ، گرفتاریوں کی دھمکیاں، علماء کے جلوس پر لاٹھی چارج اور مسلم لیگی کارکنوں کے جلسوں اور اجلاسوں پر پولیس کی یلغار یہ طاقت کے استعمال کا وہ پرانا نسخہ جسے ہر حکومت، اسم اعظم اور شاہ کلید کا درجہ دیتی ہے یہ سب پامال فارمولے ہیں۔

قحط زدہ علاقوں کا چیف ایگزیکٹو کا دورہ، اور لمحوں میں سارے انتظامات کا ہو جانا اور اعداد و شمار اور چارٹوں کی مدد سے بھوکے، پیاسے لوگوں کے دکھوں کا مداوا، یہ بہت رائج الوقت قسم کا حربہ ہے اس سے کبھی مسائل حل نہیں ہوئے۔

اسی طرح توہین رسالتؐ کے معاملے میں جعلی علماء و مشائخ کے انٹرویو ریڈیو ٹی وی پر ان کو کوریج، خیر مقدمی بیانات یہ سب پاکٹ اور ڈمی لیڈرشپ ابھارنے کا

دیرینہ اور آزمودہ نسخہ ہے جن علماء اور مشائخ کو اس حوالے سے سامنے لایا گیا پشاور سے کراچی تک نہ کوئی علمی حلقہ انہیں جانتا ہے اور نہ کسی خانقاہ سے ان کا واسطہ ہے رہ گئے اوقاف کے علماء اور خطباء وہ اچھے اور سنجیدہ لوگ بھی ہوں تو بھی ان کی مجبوری ہے کہ وہ بہر حال سرکاری ملازم ہیں انہیں خواہ مخواہ سامنے لانا انہیں مشکل میں ڈالنے اور ان کی مجبوری کا استحصال کرنے والی بات ہے خیر سے جس شخصیت کو پنجاب میں مذہبی امور کا مشیر بنایا گیا ہے اس سے عالمِ بالا کی سخن فہمی کا کافی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اگر سب کچھ ایسے ہی کرنا ہے تو پھر نوشتہ دیوار سامنے رہنا چاہے کہ یہ دلدل میں اترنے والی بات ہے جس میں ہاتھ پاؤں مارنے سے انسان اور زیادہ کھب جاتا ہے۔

فوج اور فوجی حکومت ہم سمجھتے ہیں کہ انتہائی نیک نیت ہے، اسے ملک کے استحکام اور خوشحالی سے حد درجہ دلچسپی ہے وہ عوام کو پر سکون اور مطمئن دیکھنا چاہتی ہے اور وہ سیاسی اداروں کو مضبوط اور آئین کا پابند بنانا چاہتی ہے اس کے لئے ضروری یہ ہے کہ وہ اصلاح کا کوئی خفیہ، پیچیدہ، اور انوکھا طریق کار اختیار نہ کرے بلکہ سنجیدہ اور کھلا راستہ اپنائے اس نے اگر سیاسی ایجنڈا اپنانا ہے تو وہ کونے کھدروں سے از کار رفتہ یا بالکل ہی وژن سے عاری لوگوں کے بجائے ان سے رابطہ کرے جو سیاسی میدان میں ہیں اور عوام کے سامنے ہیں ایسے لوگ بدنام بھی نہیں اور گمنام بھی نہیں ان میں نوابزادہ نصر اللہ خان، قاضی حسین احمد، ائر مارشل اصغر خان، عمران خان، مولانا نورانی، فاروق لغاری، اجمل خٹک، پروفیسر طاہر القادری مولانا فضل الرحمٰن جیسے لوگ موجود ہیں۔ کوئی مذہبی معاملہ ہو تو کسی سنیاسی ٹائپ مشائخ اور فوٹو گروپ قسم کے علماء کے بجائے جامعہ اسلامیہ منصورہ، جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن، خیر المدارس ملتان، دار العلوم کراچی، جامعہ نعیمیہ، انوار العلوم، جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ جامعہ حنفیہ بصیر پور، وغیرہ مدارس کے مہتمم حضرات جماعت اہل سنت، وفاق المدارس، تنظیم المدارس کے

سرکردہ حضرات سے رابطہ کرے مشائخ سے بات کرنی ہے تو خانہ ساز سجادہ نشینوں کی بجائے گولڑہ شریف، سیال شریف، مٹھن کوٹ، چشتیاں، پاک پتن، بھیرہ، جیسی خانقاہوں سے بات کی جائے۔ تاکہ ہر معاملہ واضح بھی ہو اور نتیجہ خیز بھی۔

لیکن یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہے جب طے ہو کہ ملک کو دلدل سے نکالنا ہے اور اپنے ذہنی و ذاتی تحفظات کو خاطر میں نہیں لانا ہے۔

اگر بعض حکومتی بزرجمہر یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت حکومت کسی شاہراہ پر بڑے ہموار انداز میں چل رہی ہے تو وہ فریب نظر اور فریب نفس کا شکار ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ حکومت نے خدا ہی نخواہی بہت سے محاذ کھول کر خود کو دلدل میں دھنسا دیا ہے یہ بات ناگوار خاطر ہو تو بھی یہی بات درست ہے، لوگوں کی ناخوشی کے اسباب اپنے اپنے ہیں مگر ناخوشی ایک واقعہ ہے تاجروں کا اپنا مسئلہ ہے مذہبی حلقوں کا اپنا، سیاستدان کسی اور سبب سے ناراض ہیں اور عوام کسی اور وجہ سے، کس کی ناراضگی کتنی جائز اور کس کی کتنی ناروا ہے اس بحث سے قطع نظر، اتنی اجتماعی کسی بھی صورت میں حکومت کے لئے خوشگوار نہیں ہونی چاہیے۔

حکومت ایجنڈا پھیلانے کے بجائے ٹمٹانے اور ٹمنانے کو کوشش کرے، طاقت کی بجائے مفاہمت سے معاملات کو سلجھائے۔

تفصیلی اصلاحات کے بجائے بنیادی تبدیلیوں پر اپنی توجہ مرکوز کرے اور مرضی کی سیاست اور مرضی کے سیاستدان پیدا کرنے کے بجائے عوام کی اجتماعی بصیرت پر اعتماد کرے وہ جسے آگے لانا چاہیں حکومت انہیں آگے آنے دے ہاں دستوری لحاظ سے رہبروں اور رہزنوں کے درمیان ایک واضح لائن ضرور کھینچے۔

دیکھنا تقریر کی لذت

سپریم کورٹ نے موجودہ حکومت کے آئینی وقانونی جواز کے حق میں ۱۲ مئی کو جو متفقہ فیصلہ دیا اس نے چیف ایگزیکٹو کے اعتماد وایقان میں کئی گناہ اضافہ کر دیا او راس اعتماد کا پہلا اور بھرپور مظاہرہ ۲۵ مئی ۲۰۰۰ کی پریس کانفرنس میں ہوا اور جو تقریباً تین گھنٹے پر محیط تھی واقعہ یہ ہے کہ جنرل صاحب اس پریس کانفرنس میں بلبل ہزار داستاں کی طرح چہک رہے تھے ان کی تقریر میں چار باتیں بہت نمایاں تھیں۔

۱۔ بھرپور اعتماد
۲۔ صاف گوئی
۳۔ محکم لہجہ
۴۔ خوش امیدی

ان کی تقریر سے صاف دکھائی دے رہا تھا وہ اب کسی قانونی مخمصے اور فنی پیچیدگی کا شکار نہیں۔ اس لئے وہ صاف گوئی سے کام لے رہے تھے، ان کا محکمہ لہجہ ان کے سپاہی ہونے کا پتہ دے رہا تھا اور وہ تمام تر مشکلات کے باوجود کسی مایوسی کا شکار نہیں بلکہ مستقبل کے امیدوار تھے بعض مواقع پر تو انہوں نے وہ انداز اپنایا کہ ڈپلومیسی اور سفارتکاری کے سارے نقاب اتار کر ایک طرف رکھ دیئے یعنی غربت اپنی جگہ مگر غیرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ مثلاً جب انہوں نے یہ جملہ کہا کہ ''چودہ کروڑ انسانوں

پر مشتمل ایٹمی قوت رکھنے والی ایک قوم کو دنیا کیسے نظر انداز کر سکتی ہے؟ تو ان کا چہرہ ایک خاص احساسِ فخر سے دمک اور کناروں سے اچھلنے والی خوشی سے چمک رہا تھا اسی طرح ایک سوال کے جواب میں ان کی یہ بات بجلی کی لپک معلوم ہو رہی تھی کہ واجپائی صاحب ہم سے بات کرنا چاہتے ہیں تو خود پہل کریں ورنہ ہمیں ان سے بات کرنے کا چنداں شوق نہیں ہاں بات جب بھی ہوگی پہلے کشمیر پر اس کے بعد کوئی اور مسئلہ آئے گا پریس کانفرنس میں جنرل صاحب کی باتوں سے دردمندی کا احساس بھی واضح طور پر چھلک رہا تھا۔ وہ اپنے فکر و خیال، احساس وادراک اور قلب و روح کی تمام تر توانائیاں مجتمع کر کے کہہ رہے تھے، کہ اس ملک کا آخر کیا اقتدارِ اعلیٰ ہو سکتا ہے، اس کی کیا حرمت رہ سکتی ہے اور اسکی خود مختاری کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے جس کا اکاؤنٹ ہر ماہ آئی ایم ایف آ کر چیک کرے اور جس کے کھاتے بین الاقوامی مالیاتی اداروں کی جانچ پڑتال کی زد میں ہوں؟

سوچ کی جہت درست، فکر کا قبلہ راست اور پالیسیوں کا رخ ٹھیک کرنے کے لئے جنرل صاحب کی تقریر کسی صورت اکسیر سے کم نہیں کہنے کے لئے اس سے زیادہ کوئی موثر بات اور ابلاغ کے لئے اس سے بڑھ کر جاندار اسلوب اور مسائل کی نشاندہی کے لئے اس سے بہتر پیرایہ اور ممکن ہی نہیں لیکن یہ تو ہوئی تشخیص اور وہ بھی جالینوسی تشخص اور یہ ہوا تجزیہ اور بلاشبہ افلاطونی تجزیہ، لیکن اصل مسئلہ اور سنگین مرحلہ تعمیل و تکمیل کا ہے اور یہی وہ سنگ گراں ہے جو نصف صدی سے ہمارے دیوارِ لئے چین بنا ہوا ہے جو حکمران اسے عبور کرے گا ہمارے نزدیک وہی سیاسی مجدّد اور قومی محسن ہوگا، خواہ سویلین ہو یا فوجی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، جنرل صاحب کے بھرپور اعتماد، حسن ابلاغ اور بے آمیز اخلاص کے باوجود ہماری پختہ رائے ہے کہ انہیں اپنا ایجنڈا پھیلانا نہیں چاہیے۔ پھیلنے کے شوق میں پھسلنے کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔

انہوں نے معاشی مسئلہ کو مسئلہ نمبر ایک قرار دیا ہے اور یہ بالکل درست ہے اس کا حل یہ بتایا ہے کہ ریونیو بڑھا جائے اخراجات کم کئے جائیں اور اسی طرح برآمدات میں اضافہ ہو اور درآمدات میں کمی، لیکن ساتھ ہی انہوں نے فرمایا کہ مزید اخراجات کم کرنا ممکن نہیں ہمیں اس سے اختلاف ہے ان کی مُراد غالباً یہ تھی کہ تنخواہیں تو بہر حال دینی ہیں اور حکومتی نظم و نسق چلانے کے لئے بہر حال افراد بھی درکار ہیں ملازمین کی مزید چھانٹی شاید نہ کی جا سکے۔ ملازمین ضرور ہونے چاہئیں تنخواہیں بھی ضرور دی جائیں اور تھوک کے حساب سے چھانٹی بھی درست نہیں لیکن مسئلہ تو بے شمار مراعات اور سہولیات کا ہے جس پر محیط اندازے کے مطابق اب بھی چالیس پچاس ارب روپے سالانہ بڑھ جاتے ہیں اگر انقلابی اور ہنگامی اقدامات کرنے ہیں تو پھر صدر مملکت اور چیف ایگزیکٹو کے دفاتر سے لیکر ڈپٹی کمشنر آفس تک کا وہی سینڈرڈ رکھا جائے جو قوم کے معاشی حالات سے مطابقت رکھتا ہو، سنٹرلی ایئر کنڈیشنڈ اور فلی کارپٹڈ آفس سسٹم کچھ عرصے کے لئے مکمل طور پر **Seize** کر دیا جائے، آرائش و زیبائش کے سارے سوتے بند کر دیئے جائیں صرف وہی کچھ باقی رکھا جائے جو اعلیٰ عہدیداروں کے لئے حفاظتی نقطہ نظر سے ضروری اور ناگزیر ہو، بلوچستان کے چوبیس اضلاع اور سندھ کا تھر کا علاقہ جس طرح پانی کی بوند بوند کو ترس رہا ہے ایسے میں جب کابینہ کا اجلاس ٹی وی پر دکھایا جاتا ہے اور میز پر درجنوں کے حساب سے منرل واٹر کی بوتلیں دکھائی دیتی ہیں جو بظاہر تو معمولی بات ہے مگر یہ منظر آنکھوں کو چبھتا ہے، خدا نخواستہ کابینہ کوئی انتڑیوں اور پیٹ کے امراض میں تو مبتلا نہیں کہ اس کا ایسے پانی کے بغیر گزارا نہ ہو سکے۔

یہی حال درآمدات کا ہے بجز جان بچانے والی ادویات ضروری اشیائے صرف اور اسلحے کے ہر نوع کی برآمدات کا راستہ روک دیا جائے، جیم، جیلی، پرفیوم،

کافی، گاڑیاں، ٹائی، ساگوان، ماربل، فانوس، کٹلری، سینٹری اور دیگر ایسی بے شمار چیزیں قطعاً ضروریات کے درجے میں نہیں آتیں جن پر کروڑوں اربوں کا زرمبادلہ خرچ ہو آخری گزارش یہ بھی ہے کہ ملک اور وفاق کے استحکام کیلئے ضروری ہے کہ سیاسی عمل کو ایجنسیوں کے دخل سے پاک رکھا جائے، آئین واخلاق کے دائرے کا سیاسی جماعتوں کو پابند کیا جائے مگر انہیں خاص رخ پر ڈھالنے اور خاص سانچے میں اتارنے کے پوشیدہ اور پراسرار رویے کو یکسر ختم کر دیا جائے، سیاسی امور سے دلچسپی رکھنے والے ایک فرد کے طور پر ہمارے محسوسات یہ ہیں کہ ہمارے ہاں وفاقی سطح کی جماعتوں اور قومی سوچ اور منشور رکھنے والی پارٹیوں کے مقابلے میں گروہی اور قومیتی مفادات کی حامل شخصیات کو ابھارا جاتا ہے اور پھر یہ لوگ آگے چل کر بہت بڑا فتنہ ثابت ہوتے ہیں اور خیال اس وقت آتا ہے جب پانی خطرے کی سطح کو چھو رہا ہوتا ہے، گڈ گورننس اور وفاق کے استحکام کے لئے اس کا اہتمام ضروری ہے۔

''سرکاری پارٹی'' کے قیام کا خدشہ؟

مثل مشہور ہے کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے اور ذوقِ گل بوسی میں زبان متعدد بار کانٹوں پر پڑی اور زخمی ہوئی ہے اس پس منظر میں مجھے اپنا شک ظاہر کرنا پڑ رہا ہے کہ کچھ سرگوشیاں ایسی ہو رہی ہیں اور کچھ سرگرمیاں نظر آ رہی ہیں کہ موجودہ فوجی حکومت ایک ''سرکاری پارٹی'' کو معرض وجود میں لا رہی ہے، مسلم لیگ کی سیاسی سوچ کے ایک سے زائد دھارے بھی اس امر کی چغلی کھا رہے ہیں، جناب اعجاز الحق کے رابطے اور بیانات اس شک کو تقویت پہنچا رہے ہیں اور یہ ''ڈاکٹرین'' سامنے لایا جا رہا ہے، کہ فوج اور مسلم لیگ فطری حلیف ہیں، فوج جغرافیائی اور مسلم لیگ نظریاتی سرحدوں کی محافظ ہے، فوج نے متعدد بار مسلم لیگ کو ''بیل آؤٹ'' کرایا اور اب مسلم لیگ فوج کو ''بیل آؤٹ'' کرائے گی کیوں کہ ایک نہ ایک دن موجودہ فوجی اقدام کی Legitimacy کسی نہ کسی فورم پر ضرور زیر بحث آئے گی اور آئندہ سویلین سیٹ اپ سے اس کی Indemnity لازمی قرار پائے گی، چنانچہ اس سارے عمل اور عرصے کے جواز کے لئے ایک ایسی پارٹی کی ضرورت ہوگی جو یہ فریضہ سرانجام دے سکے، میں فنی پہلوؤں میں نہیں پڑنا چاہتا لیکن اس پُخت وپُز کے سیاسی و سماجی عوامل وعواقب پر غور کرنا اور اپنی رائے دینا بشمول میرے ہر شہری کا حق ہے چیف ایگزیکٹو تک اپنے ذاتی، حکومتی اور اداراتی ذرائع سے یقیناً عوام کے خیالات اور

محسوسات پہنچ چکے ہوں گے کہ

☆ عوام موجودہ سیاسی وحکومتی نظام میں جوہری تبدیلیوں کے خواہاں ہیں۔

☆ عوام برسوں سے رائج ایک ایسے نظام کے جبر میں جکڑے ہوئے ہیں جس میں وہ اپنی رائے آزادانہ استعمال نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ انتخابات میں ووٹروں کی دلچسپی اور ووٹوں کی شرح ہر بار کم ہوتی رہی۔

☆ سیاسی شعبدہ بازروں کا کبھی کڑا اور غیر جانبدارانہ احتساب نہیں ہوا اس لئے یہ لوگ برابر طاقتور ہوتے گئے اور رائے عامہ کو دباتے اور لتاڑتے چلے گئے۔

☆ آج سے پہلے تمام حکمرانوں نے اقتدار نظام کی تبدیلی احتساب اور ملک کے استحکام کے لئے نہیں بلکہ محض شوق حکومت پورا کرنے کے لئے سنبھالا اور اس سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

☆ حکومتیں صرف نمبروں کی گیم کے ذریعے قائم ہوتی رہیں ضروری نہیں کہ وہ عوام کے محسوسات کا مظہر اور نمائندہ ہوں۔

☆ عوام سیاست اور جمہوریت کے تو قائل ہیں لیکن وہ سیاست کو دولت اور جمہوریت کو جبر سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔

☆ عوام سسٹم کے ساتھ ساتھ رولز آف گیم بھی بدلنا چاہتے ہیں جو ہمیشہ وڈیروں، دولت مندوں، اور غنڈوں کو ریلیف دیتے اور پروموٹ کرتے ہیں۔

عوام اپنے انداز سے ابھرنے والی قیادت چاہتے ہیں اور ہر مسلط ہونے والی لیڈر شپ کو قہر درویش بر جانِ درویش سمجھ کر برداشت کرتے ہیں۔

اگر میری یہ خوش فہمی درست ہے کہ یہ احساسات یقیناً چیف ایگزیکٹو تک پہنچ چکے ہیں تو پھر انہیں تمام سیاسی عناصر سے یکساں برتاؤ کرنا چاہیے جیسا کہ ان چند دنوں میں لوگوں نے دیکھا اگر آگے چل کر سگے اور سوتیلے کی تمیز شروع ہوگئی (نیک وبد

کی تمیز ضرور ہونی چاہیے) تو معاملہ ماضی کی طرح جوں کا توں رہے گا اور پاکستان کا سیاسی وسماجی ڈھانچہ انہی کھوکھلی بنیادوں پر استوار رہے گا جن پر آج تک رہا ہے چیف ایگزیکٹو محض اپنے اور رفقاء کار کے شعور پر اعتماد نہ کریں عوام کے اجتماعی شعور کو اہمیت دیں اور فرمان نبوی ﷺ بھی ہے کہ "امت کا اجتماعی شعور کبھی گمراہ نہیں ہوتا۔"

فیلڈ مارشل ایوب خان نے بھی ایک مخمصے سے نجات پانے کے لئے "کنونشن لیگ" بنائی تھی مگر وہ پارٹی اپنی پیش رو "ری پبلکن پارٹی" سے بھی زیادہ بودی اور بے فیض ثابت ہوئی اپنے لئے بھی اور قوم کے لئے بھی ۷۰ کے انتخابات میں اس کا صرف ایک نمائندہ کامیاب ہوا تھا۔

جنرل ضیاءالحق نے بھی اپنے ریلیف کے لئے اور بزعم خویش ملکی مفاد کی خاطر ایک "مسلم لیگ" تصنیف کی تھی اگرچہ خود ہی اس سے بدمزہ ہو کر اس کی حکومت برطرف کردی تھی مگر ان کی اور ان کے جانشینوں کی نگاہِ انتخاب میاں نواز شریف پر تھی اور وہ انہیں حوصلہ دیتے اور آگے بڑھاتے رہے اور اس کا نتیجہ خود حکومت اور قوم دونوں کے سامنے ہے۔

بھٹو صاحب اور پیپلز پارٹی سے مجھے اور قوم کو بہت سی شکایات ہیں اور وہ شکایات بڑی ٹھوس اور جائز ہیں لیکن پیپلز پارٹی چونکہ Government made نہیں تھی اس لئے اس نے اپنے ابتدائی دور سیاست میں سیاسی شعور کو آگے بڑھایا تھا اور بڑی حد تک برادری ازم اور علاقائیت پرستی کا سحر توڑا تھا مگر ۸۵ کے بعد وہی باتیں دوبارہ سیاست میں داخل ہو گئیں جو بڑی جدوجہد کے بعد بے دخل ہوئیں تھی، حکومتوں کے اندر کی کچھ مجبوریاں ہوں گی اور اسٹیبلشمنٹ کی داخلی ضروریات وہ کسی نہ کسی پارٹی یا شخصیت کو بڑھاوا دیتیں اور اپنی مرضی کی قیادت تیار کرتی ہیں لیکن یہ تجربہ ہر بار ناکام اور بے نتیجہ ثابت ہوا ہے اس Process کے ذریعے آنے

والے لوگ بڑے بودے اور بوگس ہوتے ہیں اور اس طرح عوام فکری و ذہنی اور سیاسی وسماجی تربیت سے محروم ہو کر ایک ایسے کلچر سے روشناس ہوتے او. اس کا حصہ بننے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس میں خوشامد، دھڑے بندی، انتظامیہ کی خوشنودی، اور جائز و ناجائز ذرائع سے مراعات و مفادات کا حصول لازمی اجزاء سمجھے جاتے ہیں اس کلچر پر معاشی وسماجی اور آئینی وسیاسی ادارہ تباہ کیا اور بازیچہ اطفال بنایا ہے، موجودہ حکومت اپنے نیشنل ایجنڈا کے ساتھ جب تک رہے وہ رہے اور پورے اخلاص کے ساتھ اسے آگے بڑھائے اور اسی دوران ایک سنجیدہ پاکیزہ اور سیکنڈل سے مُبرا سیاسی عمل کو بھی جاری رکھے اس پر ڈھکنا نہ دے اور خود لفظی و معنوی دونوں اعتبار سے غیر جانبدار رہے اور اسی طرح حقیقی سیاسی سوچ اور قیادت کو عوام میں اپنا اثر بڑھانے کا موقع ملے گا۔ اگر زیر زمین کسی سیاسی گروہ کو آگے بڑھانے کی پالیسی اپنائی گئی یا پرائی بساط پر نئے چہرے یا نئی بساط پر پرانے چہرے سجانے کی کوشش کی گئی تو ممکن ہے عوام پہلے سے بھی کسی بڑے امتحان سے دوچار ہوں، مصر، انڈونیشیا، الجزائر، عراق اور شام وغیرہ میں یہ سارے تجربے کئے جا چکے ہیں مگر عوام آج تک انہی مصائب ومسائل کا شکار ہیں جن سے وہ پہلے دوچار تھے، چیف ایگزیکٹو کو ہر ایسے اشارے کنایئے، منصوبے، زاویے اور استعارے کی بروقت لفظی نہیں عملی تردید کر دینی چاہیئے کہ کچھ لوگوں کو منفی کر کے باقی لوگوں پر مشتمل کسی سیاسی گروہ اور جماعت کو آئندہ کے لئے تیار کیا جا رہا ہے او اگر کوئی فرد یا گروہ کسی ایسی ڈویلپمنٹ کی بات کرتا یا اس کا دعوی کرتا ہے تو حکومت اپنے قول وفعل کے ذریعے اس کی حوصلہ شکنی کرے فوج کی موجودہ بابصیرت اور پرعزم قیادت کو ان لوگوں سے بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے جو بلا معاوضہ خدمات کا اشتہار ماتھے پر سجائے پھرتے ہیں یا اپنی حب الوطنی اور اپنے جذبہ خدمت کو خفیہ ذرائع سے حکومت کو پیش کرنے کا حیلہ کرتے ہیں ایسے لوگ وافر مقدار میں سکندر

مرزا، ایوب خان، یحییٰ خان اور ضیاء الحق کو بھی میسر آئے تھے اور انہوں نے ان سے جی بھر کر اخذ فیض فرمایا مگر نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات خود تو ڈوبے ان کو بھی لے ڈوبے میں نے اپنی گفتگو کا آغاز شک سے کیا اللہ کرے یہ شک ہی رہے، ہم لوگ چونکہ بہت تھک چکے ہیں رنگ برنگ تجربوں سے نئے نئے فارمولوں سے بوسیدہ و چسپیدہ نسخوں سے اس لئے ذرا سی بات پر چونک پڑتے ہیں اور خواب وخیال میں بھی کوئی منظر آجائے تو ماضی کی پوری فلم آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے اس قوم کو متعدد بار نئے منصوبوں کے نام پر ''عجوبوں'' سے دوچار کیا گیا، نئی سکیم کے بدلے ''عقیم و سقیم'' بنایا گیا نئے خاکے دے کر ''ڈاکے'' ڈالے گئے اور نئے تجربات کی روشنی میں قوم کو ''حادثات'' سے ہمکنار کیا گیا، اس لئے ضروری ہے کہ حکومت اور سیاست دونوں کی پریکٹس شفاف ہونی چاہیے تاکہ کسی کو لاف گزاف کا موقع نہ مل سکے۔

''لمحہ عبرت''

اقتدار سے زیادہ ناپائیدار، تعریف سے زیادہ کثیف، اور حکومت سے زیادہ بے وقعت چیز شائد ہی کوئی اور ہو، اقتدار ہو تو مرنے والے لاکھوں نکل آتے ہیں وہ ہاتھ سے نکل جائے تو رونے والا ایک بھی نہیں ملتا، ابھی کل کی بات ہے میاں نواز شریف کے خوانِ حکومت کی جھوٹی ہڈیاں چوسنے والے آج ان کی تازہ بوٹیاں نوچنے والے بنے ہوئے ہیں، کل تک ان کی نگاہِ غلط انداز کے تمنائی آج خود ان کے لئے تیر انداز بنے ہوئے ہیں، کل جو میاں صاحب سے ایک پل کی جدائی سہنے کی تاب نہیں رکھتے تھے آج انہیں یوں بھول بیٹھے ہیں جیسے کوئی بڑا خواب ہو، پندرہ بیس دن میں وہ کچھ سننے پڑھنے کو ملا ہے کہ آنکھیں اندھی اور کان بہرے ہونے کی دعا کر رہے ہیں۔

ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا زمانے کو

راہ میں آنکھیں بچھانے والے آنکھیں دکھا رہے ہیں، طواف کرنے والے لاف و گزاف بک رہے ہیں صدقے واری جانے والے اظہار بیزاری کر رہے ہیں، قربان ہونے والے ہذیان لکھ رہے ہیں انعام پانے والے الزام دے رہے ہیں، سلامیاں دینے والے خامیاں نکال رہے ہیں اور میاں صاحب کے تلوے چاٹنے والے ان کے پاؤں کاٹنے والے بنے ہوئے ہیں شاید یوں بھی حق نمک ادا ہوتا ہے اتنی دیر میں تو ''طوطے'' آنکھیں نہیں بدلتے جتنی دیر میں یہ ''لوٹے'' پلٹ گئے ہیں

تفصیل کا موقع نہیں اور دفتر سیاہ کرنا مقصد نہیں ورنہ ایک کتاب کا مواد تو دو ہفتوں میں میسر آ گیا ہے، یہ ہیں جناب مجید ملک، میاں صاحب کے قریبی رفیق فرماتے ہیں۔

''حسن نواز کی اپیل پڑھ کر مسلم لیگیوں کے سر شرم سے جھک گئے ہیں۔''

جناب والا، جب واجپائی کی آمد پر پولیس نے جماعت اسلامی کے آپ جیسے کئی سفید ریشوں پر ڈنڈے برسائے تھے کیا آپ کے سر میں ذرا سی جنبش بھی آئی تھی ؟ جناب حمزہ کا ارشاد ہے ''ہم نے تو ایک حق گو گروپ تیار کر لیا تھا بس مہلت نہیں ملی'' کوئی ان سے پوچھے کبھی غیرت کے بغیر بھی مہلت ملی ہے؟

گوہر ایوب کا کہنا ہے ''فوج کے خلاف میاں صاحب نے گھناؤنی سازش کی'' جناب اس سے پہلے بھی کبھی آپ کو ''گھن'' آئی ؟ آپ وزارتیں تو بدلتے رہے لیکن قربتیں برقرار رہیں۔

سعد رفیق فرماتے ہیں ''حکومت کے خاتمے میں عدم مشاورت کا خاصہ رول ہے۔''

سوال یہ ہے کہ جب آپ کو وزیر اعظم نے اپنا مشیر بنایا تھا کسی سے مشورہ کیا تھا ؟ اس وقت کم از کم آپ مشورہ دے دیتے کہ میرا تقرر مناسب نہیں اور میں اس منصب کا اہل نہیں نذیر ناجی صاحب جو تھے تو اکادمی ادبیات کے چیئرمین لیکن پائے جاتے تھے ہر وقت پرائم منسٹر ہاؤس میں انہوں نے اپنے کالم میں سابق ڈی جی آئی ایس جنرل ضیاء الدین بٹ کے بارے میں لطیفہ آمیز طنز کے انداز میں فرمایا ہے۔

''جہاز میں ایک بلدیاتی سطح کے سیاسی رہنما کو وزیر اعظم کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ وہ تو آئی ایس آئی کے چیف ہیں۔

ناجی صاحب کا حسن بیان مسلّم اور قلم پر گرفت بھی مانی ہوئی میرا ان سے دست بستہ سوال ہے کہ میاں صاحب کے ''احسن انتخاب'' پر کبھی اس سے پہلے بھی

انہوں نے کوئی ایسا جملہ کہا یا یہ ساری گل فشانی گفتار اب یاد آئی ہے؟

جب میاں صاحب نے سمیڈا خواجہ ہارون کے سپرد کیا کراچی مشاہد اللہ کے حوالے کیا، ٹرانسپورٹ کی مشاورت نجم الثاقب کو سونپی اور خرم دستگیر کو معاون خصوصی کا عہدہ سونپا کیا اس لمحے بھی ناجی صاحب کی رگ کالم پھڑکی تھی؟ اقتدار بہت بے وفا سہی بندے کو سلام دعا کے قابل تو رہنا چاہیے، یہ دیگ کے چند دانے ہیں عبرت کے چند نمونے۔

حضرت علیؓ نے سچ کہا ہے "جب دنیا کسی پر مہربان ہوتی ہے تو دوسروں کی خوبیاں بھی عاریۃً دے دیتی ہے اور جب بگڑتی ہے تو انسان سے اس کی اپنی خوبیاں بھی چھین لیتی ہے۔ میاں نواز شریف صاحب دیکھ لیجئے یہ آگ بجھانے والے تھے جو خود ہی آگ تاپنے بیٹھ گئے ہیں مدح خواں تو قصوروار ہیں ہی خود ممدوح ان سے بڑا قصوروار ہے جو قدم بڑھاؤ نواز شریف کے نعروں کو لوری سمجھ کر آسودہ ہوتا ہے، دھمال ڈالنے والوں کے کمال کی داد دیتا تھا اور مرغانِ بادِ نما کو دوستان باوفا گردانتا تھا۔

میاں محمد اظہر نے ذرا تلخ مگر سچ بات کہہ دی تو میاں صاحب "کُٹی" کر کے بیٹھ گئے خورشید محمود قصوری نے اختلاف رائے کیا تو استعفیٰ مانگ لیا، عابدہ حسین نے موافقت نہ کی تو وزارت لے لی اور فخر امام نے باوقار انداز اپنایا تو انہیں نظر انداز کر دیا۔

حضرت علیؓ نے ایک بار...... دنیا...... کو مخاطب کر کے فرمایا "اے دنیا" میں نے تجھے تین طلاقیں دے دیں میں جانتا ہوں کہ تو نے کسی سے وفا نہیں کی تو وہ بوڑھی اور بد شکل عورت ہے جس نے اپنی بدصورتی زیب و زینت سے چھپا رکھی ہے تو وہ سانپ ہے جس کی کھال نرم مگر اندر زہر گھلا ہوا ہے۔ تو وہ مردہ ہے جس کی قبر پر چونا مل کر اجلا کیا گیا ہے تو وہ اندرائن ہے جس کا رنگ خوش اور ذائقہ ترش ہے جا میں تجھے تین طلاقیں دیتا ہوں۔ تو میرے لئے نہیں اور میں تیرے لئے نہیں۔

دل توڑ گئی تیرا دو صدیوں کی غلامی

غلامی کو انسانیت کے خلاف سب سے بڑا جرم، سوسائٹی پر بہت بڑا ظلم اور شرف انسانی پر بھیانک شبخون اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ اس سے فرد کی نفسیات اور قوم کا ضمیر بدل ہی نہیں مسخ ہو جاتے ہیں۔ زشت بتدریج خوب اور قبح بالآخر حسن بن جاتا اور انسان توقیر و تحقیر کے احساس سے محروم ہو جاتا ہے۔

تاریخ آج تک کسی ایسی قوم کا سراغ نہیں لگا سکی جو غربت سے مری ہو لیکن قدم قدم پر ایسی قوموں کے آثار دستیاب ہیں جو غیرت مر جانے پر موت کے گھاٹ اتری ہیں اور آنے والوں کے لئے نشان عبرت بنی ہیں۔ ققنس ایک پرندہ ہے جو جل کر راکھ ہو جاتا ہے مگر اسی راکھ سے دوبارہ جنم لیتا ہے۔ راکھ ہو جانے سے کچھ نہیں ہوتا ساکھ سلامت رہے تو بازیابی کا امکان باقی رہتا ہے۔ علامہ اقبال نے بانگ درا میں غلام قادر روہیلہ کے عنوان سے ایک نظم موزوں کی ہے کہ جب اس نے شاہ تیمور پر غلبہ حاصل کیا تو نوک خنجر سے اس کی آنکھیں نکال لیں، اہل حرم کو رقص کرنے کا حکم دیا اور مستورات کو سامانِ طرب قرار دے کر ہولنا کی کا مظاہرہ کیا، یہ سب کچھ کرنے کے بعد اپنا خود اتارا، کمر سے تلوار کھولی خنجر ایک طرف رکھ کر سو گیا اور پھر تیموری حرم سے مخاطب ہو کر کہا کہ میرا یہ سونا ایک تکلف اور ڈرامہ تھا اور تمہاری نفسیات کا امتحان لینا مقصود تھا۔

یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی
مجھے غافل سمجھ کر مارے ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے

کوئی قوم اگر غلام بنالی جائے تو وہ پھر سے آزاد ہو سکتی ہے مگر جو قوم خود غلام بن جائے پھر وہ غلام ہی رہتی ہے خواہ اس کے پاس سے ہزاروں کاروانِ آزادی گزرتے اور اس کے کانوں میں حریت کے ناموس بجتے رہیں جس پنچھی کو دام راس آجائے تو وہ اپنے منقار سے حلقہ دام کستا رہتا اور زمانہ غلامی بڑھاتا رہتا ہے جس طائرِ بے ہمت کو گوشہ قفس میں آرام کا لپکا ہو جائے اسے قضائے چمن کبھی راس نہیں آتی، آزاد اور غلام کے لئے الگ الگ زمین اور جدا جدا فضا نہیں ہوتی دونوں ایک ہی جہان میں سانس لیتے ہیں لیکن ایک کی نظر زمین پر پڑے ہوئے دانے پر رہتی ہے اور دوسرا ہفت آسمان کو بھی خاطر میں نہیں لاتا، شاہین اور کرگس میں یہی فرق ہے ایک شکارِ تازہ کا آرزومند اور دوسرا پس خوردہ پر قانع اور شکر گزار، یہ دبی چنگاری آج سینے میں اس لئے بھڑک اٹھی اور یہ خوابیدہ آرزو اس لئے جاگ پڑی کہ کتنے عشرے گزر گئے ہمارے ذرائع ابلاغ اور حکامِ بالا پست صدر کلنٹن کے دورہ پاکستان کیلئے وقف اضطراب نظر آئے گویا امریکی صدر ہماری سرزمین پر نزول اجلال نہیں فرما رہے بلکہ ہم سفر معراج کے پہلے پڑاؤ کے طور پر سدرۃ المنتہٰی پہنچنے کی تیاری میں ہیں۔

کیا جب ہمارے حکمران امریکہ جاتے ہیں تو امریکہ کے در و بام اسی طرح بے تاب ہوتے ہیں؟ اور وہاں کے اعلیٰ و ادنیٰ احکام اسی طرح چشم براہ ہوتے ہیں؟ ہر گز نہیں۔

ہم نے تو یہی پڑھا اور سنا ہے کہ امریکہ والے بڑی مشکل سے ورکنگ لنچ اور

فوٹوسیشن پر آمادہ ہوتے ہیں ٹھیک ہے ہم دفاعی طور پر کمزور سہی، معاشی حوالے سے تنگدست سہی، سیاسی اعتبار سے غیر مستحکم سہی، سماجی لحاظ سے پسماندہ سہی، اور علمی سطح پر پچھلی صف کے سہی مگر ایک آزاد اور مختار ملک کے باشندے تو ہیں اس شرف اور اعزاز سے تو بیگانہ نہیں ہو جانا چاہیے۔ غربت ہمارا مقدر سہی لیکن ذلت گوارا کیوں کی جائے؟ شدت تشنگی خواہ کتنی ہی ہو مگر غیرت میکشی برقرار رہنی چاہیے، یعنی ساقی اگر نگاہ پھیر لے تو جام ہاتھ سے رکھ دینا چاہیے۔

سیپ سمندر میں رہ کر منہ صرف اس قطرہ باراں کے لئے کھولتا ہے جو گہر بننے کے لئے اس کے دامن میں گرتا ہے ورنہ سیپ پیاسا ہی رہتا ہے منت طوفان کرنے سے تو ڈوب مرنا بہتر ہے۔ غالب تو در کعبہ وا نہ ہونے پر واپس لوٹ آنے کی بات کرتے رہے۔ مگر ہم در میخانہ نہ کھلنے پر بھی ساقی کی دہلیز سے چمٹے رہتے ہیں ایسی محبت جائے بھاڑ میں جو کوچہ رقیب میں سر کے بل لے چلنے پر مجبور کرتی ہو سرائیکی زبان کے مایہ ناز شاعرِ الم سرور کربلائی نے بڑی خوبصورت بات کی ہے۔

زمانے دے ستم سر بار سہہ و نج
دکھاں دتے نال سنگت جوڑ ٹھہہ ونج
صدف دے وانگ وچہ دریا دے سرور
پیاسا تھی مگر خود دار رہ ونج

آخر ہم کب تک امریکہ کے حواری بنے اور اس کی ناز برداری کرتے رہیں گے، وہ ہماری خودمختاری چاٹ گیا، ہمارا بجٹ ڈکار گیا، ہمیں ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کا قیدی اور یرغمال بنا گیا اور ہمارا آدھا ملک کھا گیا اس کی دوستی نے ہمیں زمانے بھر کی دشمنی اور دنیا جہاں کی رسوائی کے علاوہ کیا دیا ہے؟ وہ ہمیشہ ہمارا ناصح اور محتسب ہی بنا ہے کبھی ہمدرد و غمگسار نہیں بنا۔ ہماری نصف صدی اس چکور کے سفر کی

طرح رائیگاں ہی گئی ہے جو چاند پر پہنچنا چاہتا ہے کاش ہم ربع صدی انتہائی غربت اور عزلت میں گزار دیتے اور باقی ربع صدی تو غیرت وحرمت میں بسر ہو جاتی، کیا ویت نام صفحہ ہستی سے مٹ گیا ہے؟ خاک ہو گیا ہے؟ کیا صومالیہ در بدر ہو گیا ہے؟ کچھ بھی نہیں ہوا صرف یہ ممالک میکڈونلڈ کے برگر سے محروم ہیں۔ لیکن روٹی بہر حال کھا رہے ہیں اس لئے رزق اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔

ہمارے ہاں ضرورت سے کچھ زیادہ سنجیدہ دانشور اور تجزیہ نگار کچھ ایسے نکتے نکال لاتے ہیں جن پر سر دھنے کی بجائے سر پیٹنے کو دل چاہتا ہے اور انہی نکات نے ہمیں شرمات دے رکھی ہے۔

صدر کلنٹن بھارت اترے ہیں تو ایک وزیر مملکت نے ان کا استقبال کیا ہے جب کہ وہاں کا دورہ رسمی اور سرکاری ہے اور ہمارے ہاں کلنٹن محض گونگلوں سے مٹی جھاڑنے اور ہمارے اشکِ بے قرار پونچھنے آ رہے ہیں مگر پروگرام کے مطابق ہمارے صدر گرامی چک لالہ ائیر بیس پر انہیں ریسیو کریں گے اور پانچ گھنٹے تک ہمارے ملک اور حکمرانوں کی نبض ڈوبی رہے گی۔ آنکھیں گلِ نرگس کی طرح کھلی کی کھلی رہیں گی اور پورا دارالحکومت لاجونتی کی مانند چھوئی موئی بنا رہے گا، سانس کی آواز تو کجا دل کی دھڑکن کی صدا بھی دائرہ ادب میں رہے گی اس لئے کہ وہ شخص ہماری سرزمین پر ہوگا جس کی ایک نگاہِ نیم باز ہمارے لئے "قاضی الحاجات" کا درجہ رکھتی ہے جس کا اشارہ ابرو ہماری عمر بھر کی آرزو ہے جس کی کجکلاہی ہمارے لئے پروانہ بادشاہی ہے اور جس کی خندہ بے نیازی ہمارے لئے سرمایہ عز و ناز ہے۔

جو قوم خارہ شگافی چھوڑ کر فن شیشہ گری میں لگ جائے پریشان نظری اس کا مقدر بن جاتی ہے اور جس قوم نے خود شکنی سیکھ لی اس خودنگری کا جوہر نصیب ہو جاتا ہے۔

برسوں بعد کوئی امریکی صدر ہمارے ہاں آیا ہے قبل ازیں آئزن ہاور، کینڈی، جانسن اور نکسن آ چکے ہیں اور ظاہر ہے پھر بھی برسوں بعد کوئی امریکی صدر ہمارے ہاں آئے گا کسی نادیدہ فائدہ کی خاطر ہم مزید وقت ضائع نہ کریں بلکہ اسی موقع پر ہمیں کچھ صاف صاف باتیں کر کے اپنی پوزیشن واضح کر دینی چاہیے تا کہ ہم بھی کسی مخمصے میں نہ رہیں اور امریکہ بھی کسی خوش فہمی کا شکار نہ رہے، ہم قم باذن اللہ کہہ کر اسے بتائیں کہ ایک تو ہم بھارت کے طفیلی بن کر نہیں رہنا چاہتے، دوسرے ہم قومی سلامتی کو کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے تیسرے یہ کہ ہم معاشی خود کفالت کے سفر میں نکلنا چاہتے ہیں اور چوتھے یہ کہ ہم چین کو کھونا نہیں چاہتے ۔ ممکن ہے کچھ وقت تنگی کا گزرے مگر یقین ہے کہ پیٹھ ننگی نہیں رہے گی۔

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے قم باذن اللہ
وہی زمین وہی گردوں ہے قم باذن اللہ
کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خوں ہے قم باذن اللہ

ہر کہ آمد عمارتِ نَو ساخت

چلو اچھا ہوا سیاسی و صحافتی ویرانے میں بہار آ گئی اور نئے نظام کے خاکے نے کم از کم ٹی وی اور اخبارات میں نیا رنگ بھر دیا، ۱۴ اگست ۲۰۰۰ تک چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانے، رائی کا پربت بنانے، بال کی کھال اتارنے، بات کا بتنگڑ بنانے، دور کی کوڑی لانے، خطابات کا جوہر دکھانے، قلم کا نشتر چلانے اور دل کا غبار نکالنے والوں کو ایک نیا موضوع ہاتھ آ گیا ہے، کشمیر کا مسئلہ بھی جوں کا توں ہے سی ٹی بی ٹی کا شور بھی مدہم پڑ گیا ہے طیارہ سازش کیس بھی رعنائی و رنگینی کھو بیٹھا ہے اور کالا باغ کا ایشو بھی مدت ہوئی دم توڑ چکا ہے اب کم از کم ٹی وی پر مذاکروں، اخبارات میں تجزیوں اور کالموں اور سٹیج پر تقریروں کی گنجائش نکل آئی ہے۔ مرحلہ وار بلدیاتی و ضلعی انتخابات کا مضمون سو رنگ میں باندھا جائے گا اور یوں کچھ دن رونق لگے گی، کلنٹن کے دورے کا Thrill بھی دو چار روز میں ختم ہو جائے گا۔

جنرل پرویز مشرف نے اپنی پریس کانفرنس میں بحالی جمہوریت کے پہلے مرحلے کا جو اعلان کیا ہے یونین کونسل اور ڈسٹرکٹ اسمبلی کے مرحلہ وار انتخابات کا جو شیڈول پیش کیا اور جس وضاحت، نفاست اور بھرپور وکالت کے ساتھ اپنا مدعا بیان کیا ہے اس کے حسن و قبح یا فنی پہلوؤں پر سخن رانی اور خوش بیانی کی ہم اس لئے ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ اس میدان کے ماشاء اللہ بڑے بڑے شہسوار موجود ہیں جو چاہیں تو رگ گل سے بلبل کے پر باندھ دیں، کلے کے چٹکنے کی آواز کو صورِ اسرافیل بنا

دیں، پانی پر نقش ابھار دیں، یا ریت کا ایک ایک ذرہ گن کر قوم کو اس کا مجموعہ بتا دیں، یہ کام ہر دور میں ہوتے رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک کہنے والی بات صرف اس قدر ہے کہ نظام گل کا کل سبحان اللہ اور تفصیلات ساری کی ساری ماشاء اللہ لیکن ہم تو اس وقت مانیں گے اگر کوئی اس نظام کو چلا کر دکھا دے، ۱۹۵۶ء کے آئین میں کیا خرابی تھی؟ بنیادی جمہوریت کے لفظی خاکے میں کیا خامی تھی؟ ۱۹۷۳ء کے دستور میں کیا سُقم ہے؟ اور ضیاء الحق کے غیر جماعتی بلدیاتی و پارلیمانی نظام میں کیا خلاء تھا؟ بات نقشوں اور خاکوں کی نہیں اور نہ منصوبوں اور تجربوں کی ہے۔ ہمارا روگ جہت اور نیت کا ہے اور اس کے بعد تربیت اور سیاست کا۔

نقشوں سے تم نہ جانچو، لوگوں میں پھر کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

ہر حکمران نے اپنے دور میں جو نظام وضع کیا اس کے نزدیک وہ قابل عمل غلطیوں سے مبرا اور فول پروف تھا لیکن وہ خود اس کے ہوتے ہوئے بار آور نہ ہو سکا اس کے بعد کیا ثمر لاتا؟ اگر کوئی ہم سے سنجیدگی کے ساتھ پوچھے تو ہم یہی جواب دیں گے کہ جو کرنا ہو وہ سب کچھ ملکی دستور میں درج ہوا الگ سے متوازی خاکے دینے کی ضرورت نہیں اور دستور کی ہر بات کو لفظی و معنوی دونوں سطحوں پر نافذ و رائج کیا جائے خواہ غوطے آئیں، خواہ ٹھوکریں لگیں اور خواہ غلطیاں نکلیں مستقل اور مستحکم ادارے بہر حال اس طرح وجود میں آئیں گے اور پھر یہ سارا عمل قوم اور رہنماؤں کی عادت ثانیہ کا درجہ اختیار کرے گا، اگر مجوزہ خاکے کی ایک ایک شق پر کھلی بحث ہو کچھ اصطلاحات لائی جائیں کچھ باتیں گھٹائی اور کچھ بڑھائی جائیں اور سمجھا جائے کہ اب یہ نظام حتمی اور بابرکت ہے تو بھی ہماری رائے یہی ہے کہ یہ نتیجہ قبل از وقت کہلائے گا تا آں کہ کوئی بنیاد نہ بن جائے اور بنیاد کوئی عبوری دور اور انتظامی ڈھانچہ فراہم نہیں

کرتا بلکہ قومی اتفاق رائے اور ملکی دستور مہیا کرتا ہے، جو نظام اس وقت دیا گیا ہے اس کے فنکشنل ہونے میں بھی ابھی سوا سال پڑا ہے، یہ بلدیاتی اور ضلعی ادارے اگست ۲۰۰۱ء کو برسر عمل آئیں گے، اس دوران معلوم نہیں وقت کا پانی کتنے پلوں سے گزر چکا ہوگا اس کے بعد صوبائی اور قومی سطح کا سیاسی نظام سامنے آئے گا اور ظاہر ہے وہ بھی منصۂ شہود پر آتے آتے ڈیڑھ دو سال تو لے جائے گا۔

یہ ایک طرف اگر قوم کے اعصاب کی آزمائش ہے تو دوسری طرف حکمران طبقے کے اخلاص کی بھی آزمائش ہے۔

کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوبؑ اے ساقی
خم آئے ہیں صراحی آئے گی تب جام آئے گا

اپنے مشمولات کے اعتبار سے موجودہ ضلعی گورنمنٹ کا خاکہ بہت خوبصورت اور مثالی ہے لیکن یہ ہمارے سیاسی و سماجی کلچر کے لئے بالکل نیا ہے دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا کلچر ان لفظوں کی کس قدر پاسداری اور نگہبانی کرسکیگا جو پروگرام میں لائے گئے ہیں اب تک کا تو تجربہ یہ ہے کہ ڈی سی اور ایس پی منتخب نمائندوں نے قانوناً ماتحت نہیں ہوتے اس کے باوجود ہمارے نمائندے اس کا دم ناک میں کئے رکھتے ہیں اگر ضلعی افسران قانوناً بھی سیاسی نمائندوں کے ماتحت آگئے تو اللہ جانے کیا کرشمے رونما ہوں؟

سوال یہ ہے کہ ۷۳ء کے دستور میں جو باتیں درج ہیں وفاق اور صوبوں کے درمیانی اختیارات و معاملات کی جو تفصیل اور وضاحت ہے فوج بیورو کریسی اور پارلیمنٹ کے جو فرائض منصبی طے کئے گئے ہیں اور دوسرے تمام اداروں کے ذمے جو بھی امور ہیں ان سب باتوں کو پوری دیانت کے ساتھ کیوں بروئے کار نہیں لایا جاسکتا؟ جنرل صاحب نے فرمایا ہے کہ ہم کسی صورت کسی بددیانت اور بدعنوان شخص کو اس نظام میں نہیں گھسنے دیں گے کیا ۷۳ء کے دستور میں ان کے گھسنے کی گنجائش ہے

؟ ہرگز نہیں گھس صرف اس لئے آتے ہیں کہ آئینی دفعات پر عملدر آمد نہیں ہوتا ایک طرف انتخابات میں نادہندگان کے حصہ لینے پر پابندی ہوتی ہے اور دوسری جانب ان کے لئے چور دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور ایک قانون کے تحت انتخابات میں اخراجات کی ایک حد مقرر ہے اور دوسرے اختیار کے تحت سب کچھ سے چشم پوشی کر لی جاتی ہے، مسئلہ ہماری دو عملی اور نیم دلی کا ہے ورنہ دستور میں کوئی رخنہ نہیں اور نہ قوانین میں کوئی خلاء ہے۔ جھول جو بھی ہے ہمارے اندر ہے آج بھی قانون سازی کے مقابلے میں انسان سازی کی ضرورت ہے۔

رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

علمدر آمد کا ارادہ اور بروئے کار لانے کا عزم ہو تو برطانیہ میں غیر تحریری دستور پر من وعن عمل ہوتا ہے اور اگر پہلوتہی کرنی ہو تو انسائیکلوپیڈیا بھی کام نہیں دیتا، ہمارے نزدیک ہر دور میں ہمارے حکمرانوں کی مصلحت کوشی اور سیاستدانوں کی عجلت پسندی نے کام بگاڑا ہے حکمران ہمیشہ پہلو بچانے میں اور سیاستدان شور مچانے میں لگے رہے، کھل کر حکمرانوں نے بات کی اور نہ جم کر سیاستدانوں نے کام کیا اور نتیجہ سامنے ہے آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ تانا سدھرتا ہے تو بانا بکھرتا ہے بانا سنورتا ہے تو تانا ٹوٹتا ہے پہلی اینٹ سے کام شروع ہوتا ہے بمشکل دیواروں تک پہنچتا ہے اور پھر سے نئے سنگ بنیاد کی رسم ادا ہو جاتی ہے یوں بغیر چھت کے کھلے آسمان تلے قوم نے نصف صدی گزار دی ہے کاش استقلال اور تسلسل ہوتا کوئی سنگ بنیاد رکھتا، دوسرا عمارت دیواروں تک لے جاتا، اگلا چھت تک پہنچتا اور اب تک رنگ و روغن ہو کر سیاسی و آئینی عمارت آب و تاب کے ساتھ کھڑی ہو چکی ہوتی۔

تم زمانے کی راہ سے آئے
ورنہ سیدھا تھا راستہ دل کا

تو نے اچھا ہی کیا "دوست" سہارا نہ دیا

امریکی صدر کلنٹن نے پی ٹی وی پر جو براہ راست تقریر کی اس کا "راست" مفہوم تھا "پاکستان" "گڈ بائی"۔

سفارتی نزاکت، غیر ملکی ٹی وی چینل، اجنبی ناظرین اور سات سمندر پار سے آئے ہوئے مقرر کے لئے اس سے زیادہ کچھ کہنا ممکن تھا اور نہ موزوں، تقریر کے الفاظ شائد نرم ہوں مگر مفہوم سخت تھا اور لہجہ شاید ملائم ہو مگر پیغام بالکل واضح تھا، گویا انہوں نے گیند ہماری کورٹ میں پھینک دی اب ہم پر منحصر ہے کہ ہم کیسا کھیل کھیلتے اور کتنے نمبر سکور کرتے ہیں؟

اصل بات یہ ہے کہ امریکہ ہم سے چمٹنے کا کبھی خواہاں نہیں رہا ہم ہی اس سے چمٹے رہے وہ جھٹکتا رہا اور ہم لپکتے رہے یہ ماجرا بہت پہلے معلوم تھا کہ مشتاق کون ہے اور بیزار کون؟

ہمارے دل خوش فہم کو جواب تک امریکہ سے امیدیں تھیں بالآخر ۲۵ مارچ کو امریکہ نے وہ آخری شمعیں بھی بجھا دیں، ہم نے بار بار اسے اپنے پندار محبت کا بھرم رکھنے کو کہا اور توقع کی کہ وہ ہمیں ضرور منانے آئے گا وہ ہم سے لاکھ خفا سہی مگر رسم دنیا بنھانے کے لئے ہی ہم سے راہ رکھتا مگر امریکہ نے یہ تکلف بھی روا نہیں رکھا، دائیں بائیں جھانکنے، دور کی کوڑی لانے، بال کی کھال اتارنے، لفظوں کی جگالی کرنے اور لفظوں اور شورشوں سے دوراز کار معنی تراشنے کے بجائے دو ہی راستے سامنے رہ گئے ہیں۔

ایک امریکہ کی دھمکی کو اپنے لئے آخری ہچکی سمجھنا چاہیے یا اس بے اعتنائی کو

گُلبا نگِ مسیحائی قرار دیا جائے، یعنی شکم یا دل؟ دونوں راستوں پر غور کر لیا جائے اگر تو پیٹ بھرنا ہے تو پھر پیٹھ ننگی کرنی پڑے گی اور اگر دل کو سامنے رکھنا ہے تو پھر روز روز کی کل کل ختم کرنی ہو گی۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریف پنجہ فگن نئے

ہمارے نزدیک تو آبرو کا راستہ دوسرا ہے لیکن اُس کے لئے حکومت اور سیاسی جماعتوں کو ایک امتحان سے گزرنا ہو گا حکومت کو اخلاص اور سیاستدانوں کو ایثار کے امتحان سے، نہ اکیلا حکومت کا اخلاص نتائج دے گا اور نہ تنہا سیاسی جماعتوں کا ایثار کام آئے گا۔

حکومت اپنے طرز عمل سے مخلصانہ انداز میں ثابت کرے کہ وہ خود انحصاری اور خود کفالت کا اہتمام کرے گی اور خود کو سب سے پہلے اس پل صراط سے گزارے گی اور سیاسی جماعتیں بھی نعروں سے نہیں اپنے کردار سے ثابت کریں کہ وہ قومی معاملات کو سیاسی بیوپار کے طور پر نہیں بلکہ ایثار کے زاویے سے دیکھیں اور تمنائیں گی، رنگ چوکھا لانے کے لئے ہینگ اور پھٹکری ضرور خرچ ہو گی اس کے بغیر زندگی کورا کاغذ ہی رہ جاتی ہے۔

ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ پاکستان اس وقت کڑے معاشی بحران کا شکار ہے۔ ہمارے سیاسی ادارے مفلوج ہیں ہمارا ہمسایہ بہر حال ہم سے طاقتور ہے دنیا کی نگاہیں غضب آلود ہیں۔ ہم قومی یکجہتی کی نعمت سے محروم ہیں اندر اور باہر کے "خیر خواہ" اپنی اپنی تاک میں ہیں ہم کچھ دیدہ اور کچھ نادیدہ صورتحال میں گھرے ہوئے ہیں یہ باتیں مان لینا نہ بزدلی ہے نہ کوتاہ ہمتی اور نہ خلاف مردانگی البتہ ان حقائق کے ہوتے ہوئے شوقیہ حکومت اور شغلیہ سیاست کرنا ضرور سنگدلی اور بے حسی ہے ہماری پختہ رائے ہے کہ ہم سے بڑھ کر قومیں معاشی بحران سے دوچار ہیں ملائشیا کا سنگین بحران

ابھی کل کی بات ہے۔قومیں سیاسی افراتفری کا بھی شکار رہیں کل تک کا افغانستان اس کی واضح مثال ہے، ہمسائے کا دشمن اور طاقتور ہونا بھی کوئی انوکھا واقعہ نہیں کیوبا کی جدوجہد سامنے رہنی چاہیے لاہور جتنی آبادی کا ملک اور امریکہ جیسا خونخوار اور طاقتور ہمسایہ اور وہ بھی دشمن گویا کانچ کے پیکر کی سنگ سے دشمنی تھی دنیا بھی کئی بار غضب آلود ہوئی ہے بلکہ آسماں تک خشمگیں رہا یہ بھی تاریخی واقعات ہیں ایران ان مرحلوں سے گزرا ہے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چاہے گھر جانے کے بیسیوں راستے ہوں مگر نکلنے کا ایک آدھا راستہ ہمیشہ قدرت کھلا رکھتی ہے۔لیکن صرف ان کے لئے جو ایک جنبش ہیں ہزار دام سے نکلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اگر خاطرِ صیاد کا پاس ہونا تو پھنس جانے کے لئے ایک دانے کی لالچ کافی ہوتی ہے۔

فارسی کا ایک ضرب المثل مصرع ہے

عدو شر سے بر انگیزد کہ خیر سے مادراں باشد

یعنی دشمن شر پیدا کر دے تو اس میں بھی خیر کا ایک پہلو ہوتا ہے امریکہ نے ہمیں تنہا چھوڑ دیا اس کے حواری یقیناً ہمارا گھیرا تنگ کریں گے اس کی اکتاہٹ پر بعض ہم پر چڑھ دوڑیں گے سب کچھ ممکن ہے لیکن ہمارے پاس اگر مٹھی بھر پر اور چلو بھر خون ہے تو طریقِ شاہبازی آج بھی سیکھا جا سکتا ہے۔کوئی پر دم ہو تو اسے خطرہ افتاد نہیں رہتا۔

غمگیں نہ ہو جو گریزاں ہیں چند پیمانے
نگاہِ یار سلامت ہزار میخانے

تاریخ اس پیچ وخم سے عبارت ہے،کوئی تاریخ کے سفر پر نکل کھڑا ہو تو زمانہ اسے کبھی آسانی سے راستہ نہیں دیتا، راستے میں سمندر، چٹانیں، کھائیاں، موڑ، جھاڑیاں، صحرا، خارزار بھی کچھ آتے ہیں، آبلے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں زخم کانٹوں سے سینے پڑتے ہیں اور چاک دامن تار دل سے رفو کرنے پڑتے ہیں اصل

بات شوقِ سفر اور ذوقِ نظر کی ہے۔

امریکہ کی بے وفائی کو "اشارہ الٰہی" سمجھنا چاہیے، معجزہ ہمیشہ اس وقت رونما ہوا جب اسباب مخالف ہو گئے تب مسبب الاسباب نے دستگیری کی، آگے دریا کی موجیں اور پیچھے دشمن کی فوجیں نہ ہوں تو دریائے نیل میں راہ راستے کبھی نہیں نکلے، چالیس برس اگر وادی تیہ میں بسر نہ ہوں تو عصا کی ضرب سے چشمے نہیں پھوٹتے، پورے لشکر کے لئے جب پانی کا ایک پیالہ رہ جائے تب پیغمبروں کی انگلیوں سے پانی کی سبیل بہتی ہے اور جب پیاس کی شدت سے کوئی ذبیح اللہ ایڑیاں رگڑتا ہے تو اس وقت آبِ زم زم رواں ہوتا ہے۔

کلنٹن کے الوداع کو اپنے لئے "پیغام خفا" نہیں بلکہ "ذریعہ بقاء" بنا لینا چاہیے۔

اس کی تقریر ہمارے لئے Disappointing نہیں بلکہ Total blessing ہونی چاہیے تنفر کے ساتھ نہیں بلکہ تشکر کے طور پر کہا جائے۔

تو نے اچھا ہی کیا درست سہارا نہ دیا
مجھ کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے لئے

میں بار بار عرض کروں گا کہ اس کڑے امتحان میں سیاسی جماعتوں اور قائدین کی اتنی ہی ذمہ داری ہے جتنی حکمرانوں کی ایک فیصد بھی کم نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ دھکا دے کر تالیاں پیٹنے کا شغل شروع ہو جائے ہمارے ہاں یہ ہوتا رہا کہ شملہ معاہدہ کے لئے بھٹو کو روانہ بھی کیا اور واپسی پر اس کا جلوس بھی نکالا، ایٹمی دھماکہ کرنے کے لئے نواز شریف کو چوڑیاں توڑ کر للکارا بھی گیا اور دوسرے دن U Turn بھی لیا گیا، اس روش سے اب گریز کیا جانا چاہیے بہت جلسے سج چکے، بہت تالیاں پٹ چکیں بہت نعرے گونج چکے، بہت پیچ لڑ چکے، اور بہت لیڈر بن چکے، اب جلسے سجانے کا نہیں

فاقے اٹھانے کا مرحلہ ہے تالیاں نہیں دنیا بھر کی گالیاں سہنے کا موقعہ ہے اور اب ٹانگ کھینچنے کا نہیں جان و دل بیچنے کا لمحہ ہے اب نہ تو کسی کا عشق ہم سے خاک چھنوائے اور نہ کوئی حسن دل کو لبھائے بلکہ

کیا عشق نے سمجھا ہے کیا حسن نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

بڑے لوگ، بڑے روگ

کہتے ہیں کسی علاقے میں سیلاب آیا، کئی بستیاں زیرِ آب اور فصلیں زد میں آ گئیں، لوگ افراتفری میں گھروں سے نکل رہے تھے، کسی نے چارپائیاں اٹھائی ہوئی کسی کے سر پر سامان کا ڈھیر، کوئی بچوں کو کندھوں پہ اٹھائے ہوئے، کوئی بھیڑ بکریوں کا ریوڑ ہانکتے ہوئے اور کوئی کپڑ اور برتن سمیٹتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہا تھا اور ہر ایک پناہ اور خشک جگہ کی تلاش میں سرگرداں تھا ایک ملنگ حقہ اٹھا کر قریبی نالے کے پل پر بیٹھ گیا، لوگ وہاں سے ہانپتے کانپتے اور دوڑے بھاگے، گزر رہے تھے اس مجذوب نے جب یہ عالم دیکھا تو حقے کا ایک کش لگاتے ہوئے بولا۔

"فقیری کا آج اندازہ ہوا اور مزا آیا ہے"

ظاہر بات ہے جو جتنا مال اور عیال دار ہوگا اتنا ہی پریشان اور بے قرار ہوگا جو عمارت جتنی اونچی ہوگی زلزلے سے متاثر ہوگی اور جو آشیانہ جس قدر بلند ہوگا اتنا ہی بجلیوں کی زد میں آئے گا۔

میں ایک بار نہیں ہزار بار اللہ سے پناہ مانگ کر یہ بات کہہ رہا ہوں کہ کسی کے دکھ پر سکھ کا سانس لینے والا بہت کمینہ ہوتا ہے اور خدا ہر ایک کو برے وقت سے بچائے مقصد طنز ہے نہ طعن لیکن آج کل بیگم کلثوم نواز کے مرثیے دل ہلا اور نوحے حشر اٹھا رہے ہیں کبھی وہ اپنے خاتون خانہ ہونے کی بات کرتی ہیں کبھی ان کی آنکھیں ساون

بھادوں بنتی ہیں کبھی وہ پوتے کو گود میں لے کر اولاد والوں کو مضطرب کرتی ہیں کبھی اپنا مقدمہ خدا کی عدالت پیش کرتی ہیں کبھی کسی کے بڑھاپے کی دہائی دیتی ہیں اور کبھی اپنے لختِ جگر کی معصومیت کا حوالہ دیتی ہیں ہمیں ان سے پوری ہمدردی ہے عورت غریب ہو یا امیر کوئی بیوہ ہو یا بیگم اس کے جذبات بھی یکساں ہوتے ہیں اور اس کا احترام بھی یکساں ہم دیکھنے والوں کا مسئلہ ہے یہ کسی بھی حکومت کے ہوتے ہوئے اس کے جائز اقدام کے حق میں لکھیں تو ''نمک خوار'' کا طعنہ ملتا ہے اس کے خلاف قلم اٹھائیں تو ''ملک کا غدار'' ہونے کا لیبل لگتا ہے۔

حکومت اور اپوزیشن دونوں کی خبریں لیں تو ''یار نمار'' کہلاتے ہیں ہم لوگ نہ تین میں نہ تیرہ میں، آج بھی یہی مخمصہ ہے بیگم صاحبہ کے دکھ دیکھیں اور بات کریں تو یہی کہا جائے گا کہ پچھلے احسانات کا بدلہ چکایا جا رہا ہے کچھ نہ کہیں تو حکومت کا اشارہ سمجھا جائے گا، لیکن یہ کہنا تو ہر ایک کے ہاں قرین انصاب اور قریبِ صواب سمجھا جانا چاہیے کہ جنرل صاحب کو صرف اپنا آج نہیں آنے والا کل بھی ذہن میں رکھنا چاہیے اور بیگم صاحبہ کو صرف اپنا آج نہیں کل بھی اپنے ساتھ لانا چاہیے، ایسی ہی کئی خواتین ان کے میاں کے دورِ حکومت میں در بدر ہوئی تھیں، کئی پوتے باپ دادا سے جدا رہے تھے کئی بوڑھے باپ اپنے بیٹوں کے فراق میں روئے تھے کئی لوگوں نے عدالتوں اور تھانوں کی ٹھوکریں کھائی تھیں، ہر بڑے آدمی یا بڑا بننے کی خواہش رکھنے والے کو اتنا حوصلہ اور حقیقت پسند ضرور ہونا چاہیے، کہ جو گڑ کے گلگلے کھائے گا، اس کے مسوڑھے تو ضرور خراب ہوں گے جو اونچا اڑے گا ہوا کے تھپیڑے تو کھائے گا اور جو لوگ بڑے بنتے ہیں ان کو روگ بھی کڑے لگتے ہیں۔ میاں صاحب صرف اقتدار سے ہی الگ ہوئے ہیں اور کیا؟ نہ پا بجولاں ہیں نہ تھانے کے روائتی مہمان بنے ہیں، گھر سے کھانا ملتا رہا عدالت میں آنے جانے کے لئے گاڑی ہوتی ہے، تو دو مرتبہ اقتدار میں آئے کیا

ہی اچھا ہوتا کہ وہ اس عرصے میں ایک کلچر بنا جاتے کہ کسی کو محض شک کی بناء پر گرفتار نہ کیا جاتا، تھانے عقوبت خانے نہ رہے، عدالت میں پیشی کے موقع پر شرفِ انسانی کی توہین نہ ہوتی سیاسی کارکنوں پر بے محابہ تشدد کا خاتمہ کر دیتے، بجز ثابت شدہ مجرموں کے ہر شخص آزاد و محترم ہوتا اور اپنی ذات سے لیکر ہر ایک کو قانون کا ماتحت اور پابند بنا دیتے تو شائد آج فضا مختلف ہوتی اور امتناعی نظر بندی کا کلچر مر چکا ہوتا، یہی بات آج کے حکمرانوں کے لئے بھی ہے۔ اللہ کے علاوہ کس کو دائمی حکمرانی حاصل ہے؟

خلیفہ قاہر باللہ بڑا سنگدل اور تند مزاج تھا، وزیر اعظم ابن مقلہ کو بغاوت کے جرم میں وہ سزا دی کہ الامان والحفیظ، آنکھوں میں لوہے کی گرم سلائیاں پھیر کر اندھا کر دیا اور کنویں میں لٹکا دیا اس کی ماں کو یہ نظارہ کرنے کے لئے وہاں سے لے جایا گیا، اور پھر یہی قاہر باللہ قانون مکافات کی زد میں آیا اور اسے بھی اندھا کیا گیا اور وہ دمشق کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر بھیک مانگا کرتا تھا اور ہر آنے جانے والے کو مخاطب کر کے کہتا تھا۔

''لوگو'' مجھے دیکھو میں اسی سرزمین کا حاکم رہا ہوں۔ جو مجھے نہیں جانتا وہ پہچان لے اور جو جانتا ہے وہ اسے عبرت کا سامان سمجھے۔''

بولنے اور لکھنے والوں نے ہر دور میں ہر حکمران کو یہی بات یاد دلائی لیکن ہر حکمران نے کانوں میں کاگ ٹھونسے رکھے، آنکھوں پر پٹیاں باندھے رکھیں، دماغ کے کواڑ مقفل کئے رکھے اور نصیحت و عبرت کی ہر بات کو مضحکہ خیز سمجھا، وہ سکندر مرزا ہوں ایوب خان ہوں، یحیٰی خان ہوں، بھٹو صاحب ہوں، ضیاء الحق صاحب ہوں، یا بے نظیر اور میاں نواز شریف، سکندر مرزا وظیفہ لے کر دیارِ غیر میں دن پورے کرتے رہے ایوب خان باقی دن گوشہ فراموشی کے قیدی رہے، یحیٰی خان سوزوکی کار میں بیٹھ کر اسلام آباد کی سڑکوں پر بے مقصد گھومتے اور عہد رفتہ کو آواز دیتے رہے، اور اب

محترم اور میاں صاحب جیتے جی اپنے احوال کے خود شاہد و ناظر ہیں، خود بھی گرفتارِ بلا اور عوام بھی مشقِ ستم۔

کیا ہی اچھا ہو کہ لمحہ موجود کو نصیحت سمجھ کر ماضی و حال کے حکمران کچھ باتیں طے کر لیں خود بھی سکھی رہیں اور عوام کو بھی سانس لینے دیں۔ یہ بڑے لوگ طے کر لیں کہ

☆ نہ خود قانون توڑیں گے نہ کسی کو توڑنے دیں گے
☆ جتنے دن حکومت کریں گے نخوت نہیں خدمت کو شعار بنائیں گے۔
☆ دوسروں کے لئے وہی پسند کریں گے جو خود اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔
☆ ضابطہ صرف وہی بنائیں گے جو ان کے لئے اور دوسروں کے لئے یکساں ہو۔
☆ نہ انعام کا رویہ اپنائیں گے اور نہ انتقام کی عادت ڈالیں گے۔

ممکن ہے اس سے کچھ تلافی مافات ہو جائے اور حالات بدل جائیں۔

آئینہ

بہت سی پیشانیاں شکن آلود، نگاہیں غضب ناک، تیوریاں کشیدہ، اور بھنویں تنی ہوں گی بہت سے چہرے لال، پیلے، رنگ فق اور بھیجے گرم ہوئے ہوں گے، جب ''پارلیمنٹ سے بازار حسن تک'' کے مندرجات سامنے آئے ہوں گے۔ اُن کے بھی جن کی اس آئینے میں تصویر بجی ہے اور ان کے بھی جو اس شب زاد اور ظلمت نژاد مخلوق کے کارندے، کارکن، نغمہ گر، ثناء خواں اور ریزہ چین ہیں لیکن ان لوگوں کے چودہ طبق روشن اور سارے نیک گمان دور ہو جانے چاہئیں جو سیاسی سرکس کے بازیگروں کے بارے میں کسی خوش امیدی اور سادہ لوحی کا شکار ہیں۔

''پارلیمنٹ سے بازار حسن تک'' ایک کتاب ہی نہیں دستاویز ہے جس کی ہر بات مستند اور مصوّر ہے تحریر اگر ناطق ہے تو تصویر اس پر شاہد، یہ حمام ہے جس میں سبھی ننگے نظر آتے ہیں، یہ دھوبی گھاٹ ہے جہاں شہر سیاست کے سب گندے کپڑے اور پوتڑے جمع ہیں۔ یہ جھروکہ ہے جہاں سے سب مکروہ چہرے پوری طرح نظر آ رہے ہیں، یہ فوٹو سٹوڈیو ہے جہاں سارے ''نیگیٹو'' محفوظ ہیں یہ پنجہ ہے جو بڑی بے رحمی کے ساتھ چہرے پر چڑھے ہوئے دبیز نقاب نوچتا ہے، یہ خوردبین ہے جو ہوس و جنس کے تمام کیڑوں اور جرثوموں کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور یہ ایک کسوٹی ہے جو ملمع سازوں کا سارا کھوٹ ظاہر کر دیتی ہے۔

یہ کتاب کوئی الف لیلہ کی داستان نہیں بلکہ کھلی اور چھپی حقیقتوں کی ترجمان ہے اس میں واقعاتی مبالغہ اگر ہو بھی تو زبان سے زیادہ ایک چوتھائی ہوگا تین چوتھائی کی صداقت کے بارے میں قسم کھائی جا سکتی ہے اسے پڑھ کر اپنے اوپر رونا بھی آتا ہے، غصہ بھی آتا ہے، ترس بھی آتا ہے اور خدا کی ناراضگی کا خیال بھی آتا ہے کہ جس طرح کے سیاستدان ہمارے حصے میں آئے ہیں یہ یا تو ہماری شامت اعمال ہے یا ہماری سادہ لوحی پر زناٹے دار طمانچہ، ہماری غربت سے کڑا مذاق ہے یا پھر ابلیسی نظام کا منطقی نتیجہ جس کے بطن سے ایسے کوڑھ زدہ لوگ جنم لیتے ہیں۔

سیاست تو بڑے لوگوں کا موضوع اور میدان تھا معلوم نہیں یہ پیران ناہنجار اور طفلان ناہموار اس کوچے میں کیسے وارد ہو گئے ہیں؟ ارسطو، افلاطون یحییٰ برمکی، نظام الملک طوسی، ابن خلدون اور الماوردی جیسے لوگ سیاسی متکلمین تھے آج گشتگان دخترِ مینا اور چلہ کشانِ کاکل ورخسار قوم کو ایک نئی سیاست پڑھا اور سمجھا رہے ہیں ایک صدی نہیں گزری برصغیر کی سیاست میں نواب سلیم اللہ خان، قائداعظم، علامہ اقبال، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزادؒ، عبیداللہ سندھیؒ، مولانا فضل حق خیرآبادیؒ، مولانا حسین احمد مدنی، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، چوہدری افضل حق، حسرت موہانی، بہادر یار جنگ، علامہ مشرقیؒ، مولانا ظفر علی خان مولانا مودودی اور مولانا داؤد غزنوی جیسے لوگ اس مسند کی رونق اس شہر کا چراغ، اس گلستان کے پھول، اس ورثے کے امین اور اس میدان کے مرد تھے، اور آج مصرعہ آوارہ قسم کے لوگ معتبر بنے ہوئے ہیں جن کا سفر بالا خانے سے شروع ہو کر ایوانوں تک ہوتا ہے اور ایوانوں سے نکلے ہیں تو سیدھے بالا خانوں میں جا پہنچے ہیں یہ تو شیشۂ سیاست پر غبار اور دامن ریاست پر الزام ہیں۔

ری پبلکن پارٹی ہو یا مسلم لیگ کنونشن لیگ ہو پیپلز پارٹی یہ سب درگاہیں ہیں مریدانِ بادہ وجنس کی اور پناہگاہیں رہزنانِ نقد متاعِ سیاست کی ظاہر ہے جب

سیاست سے کردار کو جلا وطنی ملے گی اور سکوں کی جھنکار معتبر ٹھہرے گی تو کانوں میں پائل اور پازیب کی چھنکار ہی پڑے گی، جب بونے اور اونے پونے لوگ مسند نشین ہوں گے تو اس محفل میں ٹھمریاں ہی سننے کو ملیں گی، جن کے نام کل تک تھانوں میں آویزاں تھے جن کا ذکر کوئی باوضو شخص نہیں کرتا تھا جن کی حیثیت بازار کی گالی جیسی تھی، اور جن کے خانوادے انگریز کے گھوڑوں کے سائیس تھے، آج انہی سے بازار سیاست آباد ہے۔

مسجد میں امام آج ہوا آ کے کہاں سے
کل تک یوںہی میرؔ خرابات نشیں تھاں

پارلیمنٹ سے بازار حسن تک میں جن لوگوں کا ذکر ہے وہ کوئی سلیمانی ٹوپی پہن کر نہیں پھرتے ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں انہی کو ہم نے اپنا لیڈر، نجات دہندہ، امام سیاست اور رہبر بنایا ہوا ہے۔ ہم نے ہی ایوب خان کو ''مرد آہن بنایا'' ہم نے یحییٰ خان کو ''نجات دہندہ'' قرار دیا وہ ہم ہی ہیں جنہوں نے بھٹو کو ''قائد عوام'' کہا ہمارے نعروں سے مصطفیٰ کھر ''شیر پنجاب'' بنا ہم ہی پگارا پیر کے جھروکے سے دیدار کے منتظر رہتے ہیں ہم نے شیخ رشید کو ''فرزند پاکستان'' سمجھا اور ہم نے نواز شریف کو قائد اعظم ثانی، کا مکھن لگایا، ان لوگوں کا تو جو بھی کردار ہ سو ہے کچھ اپنے ذوق کا ماتم کرنا اور اپنے انتخاب کا مرثیہ بھی پڑھنا چاہیے، سارا قصور ان کا نہیں ہم بھی برابر کے شریک ہیں۔

کجھ شہر دے لوکی ظالم سن کجھ سانوں مرن دا شوق وی سی

ظہیر احمد بابر جوان تو ہیں ہی، حوصلہ بھی ہے، جنہوں نے بھڑوں کے چھتے میں ڈھیلا مارا ہے اگر ان راجہ اندرون کی ساری طلسماتی کہانیاں پہلے سے چشم و گوش آشنا ہیں۔ تہمینہ کھر کی ''میڈ اسائیں'' کئی بار چھپ چکی ہے اس کے باوجود نہ ان سورماؤں

کی عادت بدلی ہے اور نہ ہماری استقامت میں فرق آیا ہے جب بھی انتخاب آیا ہماری نظروں میں یہی لوگ جچے ہمارا اور ہمارے ملک کا مقدر کبھی نہیں بدلے گا جب تک ہم نیا بنا سپتی اور تلخابہ شب قسم کے سیاسی لوگوں سے نجات حاصل نہیں کرتے، جن کا حاصل حیات ایک پری زاد کا پہلو، جن کی آرزوؤں کا ہدف ایک جام، جن کی کل کائنات کسی کی نگاہِ نیم باز، جن کی دنیا و عقبی ایک مجرا اور جن کا مقصد زیست صرف ہوس کی تسکین ہے ہائے شورش کس موقع پر یاد آ گئے۔

اس قبیلے کے سبھی افراد نا مسعود ہیں
ان میں اوصاف شرافت فطرتاً مفقود ہیں
لڑکیوں کی خوبروئی پر مچل جاتے ہیں یہ
چمپئی رخسار ان کے گوہر مقصود ہیں
ان کی عیاشی پہ جنّت کا کلِ پیچاں کے خم
ان کی جنسی خواہشوں کے زخم لا محدود ہیں
بات اتنی ہے کہ ان کو شرم کرنا چاہیے
ان برہنہ گالیوں پر ڈوب مرنا چاہیے

امام خمینی کا نظریہ سیاست وریاست

فروری ۱۹۷۹ء میں برپا ہونے والا ایران میں اسلامی انقلاب اکیس برس گزرنے کے باوجود آج بھی علاقائی اور بین الاقوامی توجہات، تجزیوں، دلچسپیوں اور خبروں کا تازہ اور گرم موضوع ہے، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ یہ انقلاب کوئی عارضی نوعیت کا اور محض انتظامی کیفیت کا حامل نہیں تھا بلکہ یہ نظریاتی انقلاب تھا جس کے اثرات گرد وپیش اور بین الاقوامی رجحانات پر پڑے تبھی تو آئے روز اس کی صدائے بازگشت مختلف حلقوں اور کونوں میں سنائی دیتی ہے۔

انقلاب ایران ایک نیا نظریاتی، سیاسی اور سماجی تجربہ ہے جو نئے زاویوں اور جہتوں سے زیر بحث رہتا ہے ایران کی قدیم اور مضبوط ترین بادشاہت کا قلع قمع، امریکہ کے انتہائی محفوظ اور موثر اڈے اور مرکز کا خاتمہ کوئی معمولی بات نہیں اور ملوکیت زدہ ملک میں، اسلامیت اور جمہوریت کا فروغ یقیناً بہت بڑا کارنامہ اور واقعہ ہے، ایران کے پورے سیاسی وسماجی منظر کو بدل دینا بہت اہم پیش رفت ہے۔

یہ انقلاب بلاشبہ امام خمینیؒ کو نظریاتی وابستگی سیاسی وفکری پختگی اور عملی بصیرت کا نتیجہ اور شاہکار ہے یوں تو آئے روز دنیا کے کسی نہ کسی خطے اور ملک میں اکھاڑ پچھاڑ ہوتی رہی ہے اور حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں مگر یہ ردوبدل صرف اوپری اور انتظامی سطح کا ہوتا ہے دوررس اور دیرپا اثرات سے خالی اور عاری ردوبدل نہ موضوع بحث

بنتا ہے اور نہ نئے رجحانات پیدا کرنے کا موجب

نظریہ اور شخصیت لازم وملزوم کا درجہ رکھتے ہیں، نظریہ توانا ہو مگر اس کی حامل شخصیت غیر عملی اور کمزور ہو تو کبھی قالب عمل میں نہیں ڈھلتا اور اگر شخصیت بڑی زور دار اور پرکشش ہو مگر اس کے پاس کوئی وژن کوئی آئیڈیا ذہنی یکسوئی اور کوئی فکری مواد نہ ہو تو ایسی شخصیت وقت کے دھارے کی نذر، زمانے کی رفتار سے پامال اور کسی نئی طوفانی شخصیت میں گم ہو جاتی ہے۔ لیکن کسی جگہ تروتازہ اور توانا شخصیت جمع ہو جائیں تو نقطہ انقلاب بن جاتی ہے۔

یوں سیاست کا مزاج اور ریاست کا ڈھانچہ دونوں مثبت اور ٹھوس تبدیلی سے آشنا ہوتے ہیں ایران میں یہی کچھ ہوا، امام خمینی کے نظریہ سیاست وریاست کے تین بنیادی ستون ہیں اور انہی پر انقلاب کی عمارت استوار ہے۔

پہلا ستوان اسلام ہے دوسرا شورائیت ہے اور تیسرا استعمار سے بیزاری ہے، باقی تمام تر اصلاحات اور تغیرات اس کے لواحق ولوازم ہیں جوہری حیثیت ان تین باتوں کو حاصل ہے، انقلاب سے پہلے ایران جاہلی نظریے پر قائم تھا شخصی وفردی حکومت اور نسلی وخاندانی وجاہت اور اس دور کی حکومت نے اپنا تاریخی رشتہ سائرس اعظم سے جوڑ رکھا تھا دوسرے نمبر پر اس کا سارا انحصار طاقت پر تھا عوام کی اقتدار میں شرکت اور مشاورت پر نہیں اور تیسرے شاہ کی حکومت اپنے کسی نظریاتی اثبات، داخلی استحکام اور اخلاقی جواز پر نہیں بلکہ عالمی استعمار کی تائید وحمایت پر کھڑی تھی اور اس کا کردار ایک خودمختار ریاست کا نہیں بلکہ امریکہ کی باجگزار حاشیہ نشین اور اس کے عالمی وعلاقائی تھانیدار اور مفادات کے نگہبان ونگہدار کا کردار تھا۔

امام خمینیؒ نے ان تینوں بنیادوں پر ضرب ماری اور انہیں کھدیڑ ڈالا اس شاہی کھنڈر پر جو انقلابی عمارت کھڑی ہوئی اس میں جاہلی تعصب کی جگہ اسلامی حمیت،

طاقت اور خاندانی حکومت کے بجائے عوام سے مشاورت اور امریکہ کی حاشیہ نشینی چھوڑ کر خود مختاری اور غیرت کو بنیادی حیثیت دی۔ امام خمینی نے اسلام کو مذہب ثواب کے بجائے اسے دین انقلاب کے طور پر عوام وخواص کے ذہنوں میں راسخ کیا ایسا دین جو عبادات کیساتھ ساتھ سیاسیات کو بھی پوری اہمیت دیتا اور تشکیل ریاست کے لئے نظریاتی واصولی قوت فراہم کرتا ہے یہ فکری جہاد کوئی معمولی جہاد نہیں پورے یورپ اور امریکہ میں مذہب اپنے آپ کو زندگی اور زندہ مسائل سے الگ تھلگ رکھنے اور اپنی ضمنی اور کمتر حیثیت کو تسلیم کرنے اور محض شخصی رسوم وعبادات پر قانع ہونے پر آمادہ ہو چکا ہے اور اسلامی دنیا میں بھی انہی نظریات کو فروغ حاصل ہے یا پھر مختلف حکومتیں ریاستی جبر کے ذریعے دین اسلام کو یہی حیثیت دینے پر مصر ہیں امام خمینیؒ نے اسلام کو مسجد ومکتب اور مدرسہ وخانقاہ سے نکال کر سیاست وریاست کے ایوانوں تک لے آئے لیکن اس طرح کہ اسلام کا اخلاقی وروحانی کام بھی متاثر نہ ہو اور اس کا تمدنی و سیاسی کردار بھی بھرپور رہے یہ بھی ایک طرح سے پل صراط پر چلنے والی بات ہے۔

تاہم لیڈر اگر متوازن فکر رکھنے والا، حاضر دماغ، اپنے نصب العین میں واضح اور تمدنی ضروریات سے پوری طرح آگاہ ہو تو وہ یہ پل بڑی سلامتی اور احتیاط کے ساتھ عبور کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہوتا ہے۔ جو رہنما نگاہ بلند اور جان پرسوز رکھتا ہو وہ کبھی افراط وتفریط کا شکار نہیں ہوتا بلکہ ہر وادی پر خار سے بڑے تحمل اور وقار سے گزرتا اور طے شدہ منزل پر پہنچتا ہے۔

امام خمینیؒ نے اسلام کے حوالے سے شرق وغرب کے سامنے کسی معذرت کسی کمزوری اور کسی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ پورے یقین واعتماد کے ساتھ اسلام کے سیاسی رول کو اجاگر کیا جب بعض مذہبی حلقوں کی طرف سے کہا گیا کہ اسلامی حکومت تو امام مہدیؑ آکر قائم کریں گے تو انہوں نے کہا اگر دو رکعت نماز کے

لئے امام کا ہونا ضروری ہے، تا کہ مسلمانوں کی اجتماعیت برقرار رہے تو اسلامی ریاست کے قیام کو کیسے ملتوی رکھا جا سکتا ہے؟ دو رکعت کی امامت سے زیادہ اسلامی ریاست کے امام کی ضرورت ہے، جب شاہ کی طرف سے جنرل پاک رواں (ڈائریکٹر ساواک) نے آ کر کہا کہ رضا شاہ بھی شیعہ ہے آپ اس کے خلاف کیوں ہیں؟ آپ اس سے تعاون کریں تو امام خمینیؒ نے کہا کہ کوئی سنی ہو یا شیعہ اسے بادشاہ بننے کی اجازت نہیں دی جا سکتی بادشاہت اسلامی روح کے منافی نظام حکومت ہے رہ گیا شاہ کا شیعہ ہونا تو میں مرجع تقلید ہوں مجھے شاہ کی نہیں بلکہ شاہ کو میری تقلید کرنے کی ضرورت ہے جنرل پاک رواں نے کہا کہ سیاست تو نجس ہے اور آپ ایک مقدس شخصیت ہیں آپ کو اس گندگی میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ امام نے جواب دیا ''اگر کوئی کسی کے گھر میں گندگی ڈال دے تو گھر والوں کو گھر نہیں چھوڑنا بلکہ گند صاف کرنا چاہیے اور میں یہی کر رہا ہوں۔

جب امریکہ کی طرف سے پیغام بھجوایا گیا کہ '' آپ شیعہ ہیں جب کہ باقی عالم اسلام سنی ہے وہ آپ کی قیادت اور حکومت کو تسلیم نہیں کرے گا۔'' تو انہوں نے کہا '' یہ شیعہ سنی' کا جھگڑا استعماری اور طاغوتی قوتوں کا کھڑا کیا ہوا ہے اگر کوئی اسلامی ریاست قائم ہو گئی تو فرقہ واریت نہیں بلکہ وحدت امت پیدا ہو گی اور عالم اسلام کے مسائل اسلام کی رہنمائی میں طے ہوں گے۔''

جب انقلاب کامیابی کے ساتھ برپا ہو گیا تو امام خمینی نے فوراً عوام کی طرف رجوع کیا اس لئے کہ وہ شورائیت کی سیاست اور شورائی نظم حکومت کے قائل ہی نہیں بلکہ علمبردار تھے سب سے پہلے انہوں نے ملک میں ریفرنڈم کرانے کا اعلان کیا کہ ملک میں سیکولر جمہوری نظام ہو یا اسلامی جمہوری؟ اٹھانوے فیصد آراء اسلامی جمہوری نظام کے حق میں آئیں یوں ایران ملوکیت سے نکل کر جمہوری اسلامی ایران قرار پایا

اس کے بعد امن ہو یا حالت جنگ صدارتی اور مجلسی انتخابات شیڈول کے مطابق ہوئے حالانکہ عراق ایران طویل جنگ رہی، ملک میں بم پھٹتے رہے، پارلیمنٹ اڑا دی گئی۔ ایک وقت میں صدر اور وزیر اعظم (محمد علی رجائی اور جواد باہنر) بم دھماکے میں اڑ گئے مگر انتخابات یعنی عوام سے رائے لینے کا عمل کبھی بھی معطل نہیں ہوا ورنہ انقلابی اور ہنگامی صورتحال اس شورائی عمل کو ملتوی کرنے کے لئے بڑا مضبوط جواز اور بہانہ تھی، مگر امام خمینیؒ نے ہر لحہ عوام سے مشورے کو ترجیح دی اور رائے عامہ پر اپنے غیر متزلزل اعتماد کا اظہار کیا، وہ محض نعروں کی حد تک عوام کی طاقت کا سرچشمہ نہیں بلکہ عملاً اس امر کے قائل تھے کہ رائے عامہ اور اجتماعی ضمیر کبھی غلطی پر نہیں ہوتا، الیکشن ہر دور میں شفاف آزادانہ اور غیر جانبدارانہ ہوئے، بعض اوقات صدر جمہوریہ اور سوچ کے منتخب ہوئے اور پارلیمنٹ دوسری سوچ کی، سازش کر کے اپنی مرضی کے آدمی سامنے نہیں لائے گئے بلکہ جو عوامی رائے کے ذریعے لوگ سامنے آئے انہیں بے چون وچرا قبول کر لیا گیا، یہی روح شورائیت اور رائے عامہ کی حرمت ہے جسے ہر دور میں ملحوظ رکھا گیا سب سے بڑی بات یہ ہے کہ امام خمینیؒ نے صحیح سپرٹ کے ساتھ جمہوری نظام قائم کیا ورنہ جو انہیں عوام میں احترام، اعتماد، تقدس حاصل تھا وہ چاہتے تو اپنے عزیزوں اور اپنی اولاد کے لئے مناصب مختص کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ہر ایسی خواہش اور تجویز کی حوصلہ شکنی کی، تاکہ انقلاب سے عوام بدظن اور رائے عامہ کی عدم حیثیت مجروح نہ ہو ایک زمانے میں امام کے صاحبزادے احمد خمینی کو وزیر اعظم بنانے کی تجویز آئی پارلیمنٹ اور صدر نے بھی منظوری دے دی مگر انہوں نے اسے بطور ولی فقیہ ویٹو کر دیا اور فرمایا کہ میری زندگی میں میرا بیٹا اور کوئی عزیز سرکاری منصب پر فائز نہیں ہو گا ورنہ اقرباء پروری تو پوری دنیا میں ایک سیاسی و حکومتی کلچر بن چکا ہے۔

امام خمینی کے نظریہ سیاست و ریاست کا تیسرا اہم ستون استعمار شکنی، استعمار

دشمنی اور استعمار بیزاری ہے جس دور میں ایران انقلاب سے ہمکنار ہوا وہ دور دو قطبی دنیا کا دور تھا یعنی دو سپر پاورز ایک امریکہ اور دوسرا روس اس دوران دنیا میں جو بھی تبدیلی آئی تو اس کا رجحان یا امریکہ کی طرف رہا یا روس کی طرف اور انقلابی تحریکیں اور انقلابی لوگ وہی سمجھے جاتے تھے جو بڑھ چڑھ کر امریکہ مردہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی دوسرے استعمار یعنی روس کے حاشیہ بردار اور نمک خوار ہوتے تھے اور یہی کُل کی کُل انقلابیت تھی مگر امام خمینیؒ نے تحریک انقلاب اور قیام انقلاب دونوں مرحلوں میں جس طرح امریکہ کو ''شیطان بزرگ'' کہا اسی طرح روس کو بھی ''شیطان کبیر'' قرار دیا، ''مرگ بر امریکہ'' اور ''مرگ بر شوروی'' کے نعرے بیک وقت گونجے جب روس نے افغانستان میں کھلی مداخلت اور جارحیت کا ارتکاب کیا تو امام خمینیؒ نے کھل کر اور ڈٹ کر روس کے اس اقدام کی زبانی ہی نہیں عملی مخالفت کی مزاحمت کی، اور لاکھوں پناہ گزینوں کو ایران میں پناہ دی، حالانکہ علاقائی مصلحت اور امریکی مخالفت کا تقاضا تھا کہ وہ امریکہ سے بگڑے ہیں تو روس سے بنا کر رکھیں مگر ان کے نظریہ سیاست و ریاست کے منافی بات تھی کیوں کہ اسلامیہ نظریہ ریاست و سیاست کسی مصلحت اور منافقت سے آلودہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے اصول مقدس، اٹل شفاف اور واضح ہوتے ہیں:

امام خمینی کے اس نظریہ سیاست و ریاست کا رنگ آج بھی ایران کے اسلوب حکومت پر پوری طرح غالب ہے، عالم اسلام میں ایران وہ بہت نمایاں ملک ہے جو دعوی پوری دلیل کے ساتھ کر سکتا ہے کہ اس کی سیاسی پالیسیاں آزادانہ اور اس کے حکومتی فیصلے خود مختارانہ ہیں اس کی تقدیر کا فیصلہ واشنگٹن، لندن، ماسکو، پیرس، اور برلن میں نہیں ہوتا بلکہ تہران میں ہوتا ہے اور یہی ایک آزاد اسلامی جمہوری اور خود مختار و مقتدر ملک کی شان ہے اور ایران اسی شان کے ساتھ زندہ معروفِ عمل اور سوئے منزل محوِ سفر ہے۔

صوبوں کی تشکیل نو

ایک اخباری اطلاع کے مطابق ۲۴ فروری ۲۰۰۰ء کو جنرل پرویز مشرف کی زیر صدارت ہونے والے نیشنل سیکورٹی کونسل کے باضابطہ اجلاس میں ادارہ قومی تعمیر نو کی طرف سے مسئلہ یا مسودہ سامنے لایا گیا جس کے مطابق دیگر امور کے علاوہ اختیارات کو نچلی سطح پر منتقل کرنے اور انتظامی یونٹوں کی وسعت وطوالت کم کرنے اور صوبوں کی تشکیل نو جیسی باتیں زیر غور آئیں۔

معلوم نہیں یہ تجویز ابھی کس مرحلے میں ہے؟ زیر غور ہے یا زیر تکمیل اس لئے اس کے بنیادی خدوخال ابھی پوری طرح واضح نہیں، تاہم اصولی طور پر یہ تجویز استر داد کے نہیں داد کے قابل ہے اس لئے کہ جدید دور میں اختیارات کا ارتکاز اب پسندیدہ نہیں رہا اور ہر اچھی حکومت عوام کو اس کے مسائل کا حل اس کی دہلیز پر پہنچانے کی خواہاں ہوتی ہے، اور یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ اختیارات مرکز سے صوبوں اور صوبوں سے چھوٹے انتظامی یونٹوں کی طرف منتقل ہوں۔ قومی معاملات مرکز کے پاس رہیں مگر علاقائی، مقامی اور انتظامی اختیارات چھوٹے یونٹوں کو حاصل ہوں تاکہ لوگ لمبے سفر، مالی اخراجات اور غیر مانوس اور اجنبی مسافروں تک پہنچ پانے کی مشکل سے بچ جائیں۔

ہمارے خیال میں صوبوں کی تشکیل اور ترتیب نو عصری تقاضا اور عوامی رجحان

ہے، بادی النظر میں اس پر بھی مختلف خیالات و جذبات سامنے آئیں گے کوئی کہے گا کہ کسی عبوری فوجی حکومت کو اس طرح کے بنیادی فیصلے کرنے کا کوئی حق نہیں کوئی آئینی ترمیم کے حوالے سے پارلیمنٹ کی بحالی یا نئی پارلیمنٹ کے انتخابات کی بات کرے گا کوئی سے فیڈریشن کو کمزور کرنے سے تعبیر کرے گا، کوئی علاقائی اور لسانی تعصب پھیلنے کا اندیشہ ظاہر کرے گا، کوئی اسے اپنی سیاسی طاقت کا مرکز، توڑنے کی سازش قرار دے گا اور کوئی اسے پنڈورا باکس کھولنے کے مترادف کہے گا، بہر کیف اس ردعمل کے باوجود اب ضروری ہو گیا ہے کہ کچھ اہم اور بنیادی فیصلے کر لینے چاہیے، سیاسی حکومتوں کی سب سے بڑا کمزوری یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر وقت پاپولر سلوگن کے چکر میں رہتی ہیں اور کڑوے مگر اہم فیصلوں سے محض اس سے گریزاں ہوتی ہیں کہ کہیں ہماری مقبولیت متاثر نہ ہو، اور ہمیں سیاسی محاذ پر مشکلات پیش نہ آئیں اصل بات یہ ہے کہ پاکستان کے لئے Binding force صرف اور صرف اسلام تھا اور ہے اس لئے کہ اس کا قیام دو قومی نظریہ پر ہوا ورنہ پاکستان کسی معروف قومیت کی تعریف پر پورا نہیں اترتا، یعنی کسی قوم کا ہم زبان، ہم نسل ہم رنگ اور ہم علاقہ ہونا اسے ایک قوم بناتا ہے، اسلام نے پہلی بار مذہب کو اساس قومیت بنایا کہ ہم مذہب ہونا قوم کی تشکیل کا ایک اہم عامل ہے مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں اسلامی قومیت کا تصور شروع سے دانستہ یا نادانستہ کمزور کیا گیا جس کے نتیجے میں لسانی، صوبائی اور قومیتی فتنے کھڑے ہوئے اور فطری طور پر کھڑے ہونے چاہئیں تھے، اس لئے کہ جب قدر مشترک یعنی اسلام کو علمی و عملی اور سیاسی و انتظامی طور پر سامنے نہیں رکھا گیا تو پھر قوم کو یکجا اور متحد رکھنے والی اور کون سی قدر ہو سکتی تھی؟

پہلے بنگالی روٹھے، اور الگ ہوئے، اسی عرصے میں سندھی بھائی پہلو بدلنے لگے، پختونستان کا نعرہ بھی سامنے آیا، عظیم بلوچستان کی زبانی و کاغذی تحریک بھی اٹھی

اور اب کچھ عرصے سے سرائیکی صوبے کی بات اور ''تخت لاہور'' کے خلاف چہ میگوئی ہونے لگی ہے۔ پنجاب بہر حال ایک عرصے سے ہدف تنقید بنا ہوا ہے کتنا سچ اور کس قدر مبالغہ ہے؟ ہم اس میں نہیں پڑتے تاہم آبادی، سیٹوں کا تناسب اور ضلعوں کی تعداد بہر حال غیر متوان ہے، پنجاب تقریباً فرانس اور جرمنی کے برابر آبادی والا صوبہ ہے، اور دیگر تین صوبوں کی قومی اسمبلی کی نشستیں اکیلے پنجاب سے کم ہیں شکایت کا ایک پہلو یہ بھی ہے جو لوگ صوبائی، لسانی، اور قومیتی فلسفہ سیاست کے علمبر دار ہیں ان کی زنبیلوں میں شکوہ و شکایت کے بڑے بھاری پلندے موجود ہیں لیکن اس سے قطع نظر عملی و انتظامی مشکلات بہر کیف ایسی ہیں جو عام آدمی کو بہت تنگ اور رنجیدہ کرتی ہیں جس کا ازالہ خود وفاقی و قومی مفاد میں ہے تاکہ صوبوں کی تشکیلِ نو سے تعصب ابھارنے اور اس سے اپنی سیاست چمکانے والوں کے منہ سے بات اچک لی جائے، سندھی کہتے ہیں کہ سارا پیسہ کراچی لے جاتا ہے سرائیکی کہتے ہیں ساری سہولیات سنٹرل پنجاب کے لئے ہیں وغیرہ۔

اگر صوبوں کی تعداد بڑھادی جائے اور چھوٹے یونٹ بنادیے جائیں تو جہاں عام آدمی کے لئے اپنے دارالحکومت اور وزراء اور سیکرٹریوں تک رسائی آسان ہو جائے گی وہاں استحصال اور لوٹ کھسوٹ کے نعرے بے اثر اور افسانے تحلیل ہو جائیں گے۔ مل کر رہنے کے بھی بہانے ہزار ہوتے ہیں اور لڑنے کے حیلے بھی ہزار یا تو پہلے دن سے اسلامی اخوت کا جذبہ اور نظریہ قوم کے اذہان وقلوب میں اتارا بلکہ راسخ کر دیا جاتا تو نہ بنگلہ دیش بنتا اور نہ دوسرے صوبوں میں استحصال کا نعرہ گونجتا چونکہ ایسا نہیں ہوسکا اس لئے ان باتوں اور شکائتوں کا ہونا فطری ہے، اگر تو بات نوک زبان پر نہ آئے اور دل میں رہے تو خیر ہے لیکن بات زبان پر آ کر کوٹھے پر بھی چڑھ جائے تو پھر اسے دبایا تو جا سکتا ہے دل و دماغ سے نکالا نہیں جا سکتا، راکھ میں دبی ہوئی سلگتی

چنگاری کسی بھی وقت آگ بن سکتی ہے بہتر ہے شعلے کو بھڑ کر بجھ جانے کا موقع دیا جائے تا کہ ماحول اور موسم کا درجہ حرارت نارمل ہو جائے ، البتہ محض لسانی تقسیم کے حوالے سے صوبوں کی تشکیل نہ ہو (اور کہیں ناگزیر ہو تو حرج بھی نہیں) بلکہ عوام کا ریلیف پیش نظر رکھ کر نئے صوبے بنائے جائیں چار صوبے اگر دس بارہ بن جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ وہ عوام کے لئے سہولت کا موجب بنیں۔

کسی زمانے میں ہونے والی کوئی صوبائی حد بندی ہرگز آیت قرآنی نہیں جسے ابدیت اور تقدس حاصل ہو اور نہ ہی یہ مرکز، وفاق کو کمزور کرنے کی کوئی حقیقی وجہ ہے یہ خواہ مخواہ کے اندیشے ہیں جو بعض اقتدار پسند اور اختیارات کے رسیا لوگوں کی دلیل ہے ایسے لوگ دراصل ایک لمبے عرصے اور بڑی آبادی اور وسیع و عریض ماتحت عملے پر حکمران رہنا چاہتے ہیں تا کہ ہر جگہ ان کا سکہ چلے ڈنکا بجے دور دراز سے مسائل آئیں عرضیاں پیش کریں دھکے کھائیں اور یہ صاحبان ان پر اپنا رعب جمائیں۔

جب ہر علاقے کو موزوں مالیاتی خودمختاری مل جائے گی تو خواہ مخواہ لاہور اور کراچی ان کی تنقید کی زد میں نہیں آئیں گے بلکہ وہاں کے لوگ اپنے ہی افسروں اور لیڈروں کا گریبان پکڑیں گے یوں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا، لاہور، راولپنڈی، سرگودھا، ملتان، سکھر، کراچی، کوئٹہ، قلات، ڈیرہ اسماعیل خان اور پشاور کو صدر مقامات قرار دے کر ان کے گرد و پیش دیکھ لیا جائے اور متعلقہ علاقوں پر مشتمل صوبہ بنا دیا جائے یوں انتظامی اور لسانی دونوں پہلو کسی حد تک توازن اور تناسب میں آ جائیں گے، ہمارے خیال میں اس تجویز پر ہمہ پہلو غور کر کے فیصلہ کیا جائے نہ تو ایک بیان میں اس تجویز کو اڑانے کی ضرورت ہے اور نہ ہی بعض لوگوں کو لیڈری کا موقع فراہم کرنے کی حاجت۔

چودھری شجاعت حسین کا کہنا ہے کہ.......

مسلم لیگ کے اندرونی اختلافات جو آنچ بن کر سلگ رہے تھے اب شعلہ بن کر بھڑکنے لگے ہیں، کارگل ایشو پر میاں نواز شریف کے ''انکشاف'' نے اس آگ کو مزید ہوا دی ہے، اور رہی سہی کسر میاں صاحب کی طرف سے مسلم لیگ کے مزید چھ نائب صدور کے یکطرفہ تقرر نے پوری کر دی ہے، اب کوئی معجزہ یا ''اندرونی فائدہ'' ہی مسلم لیگ کو اکٹھا رکھ سکتا ہے ورنہ اس کے دو تین دھڑوں میں منقسم ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہ گئی۔ پہلے تو میاں نواز شریف کے طرزِ عمل کے شاکی وہ لوگ تھے جو کم و بیش دورِ اقتدار میں بھی اختلافی آراء دیتے رہے جیسے جناب اعجاز الحق، میاں محمد اظہر، سید فخر امام، خورشید قصوری، بی بی عابدہ وغیرہ مگر اب وہ لوگ بھی کوششِ ضبط کے باوجود بول پڑے ہیں۔ جن کی سرگوشی کا مطلب ہی یہ ہے کہ گویا بات اب کوٹھوں پر چڑھ گئی ہے، ان میں پنجاب کی سرد و گرم چشیدہ اور جہاندیدہ سیاسی فیملی یعنی چودھری فیملی کے سربراہ چودھری شجاعت حسین سرِ فہرست ہیں۔ گجرات کی یہ سیاسی فیملی High Profile کے بجائے Low Profile سیاست کی عادی اور داعی ہے۔ یہ ایجی ٹیشن کا نہیں صورتحال کی ابزرویشن کا مزاج رکھنے والی ہے۔ چودھری خاندان سیاست میں لڑنے جھگڑنے والا نہیں بلکہ آخری دم تک جڑنے والا خاندان ہے۔ بہت سے ایسے مرحلے آئے اور اتنے جواز سامنے آئے کہ گجرات کے یہ لوگ میاں فیملی سے راستہ الگ کر سکتے تھے مگر انہوں نے عجلت پر حکمت کو ترجیح دی اور بات بنی رہی۔

مگر اب لگتا ہے کہ پانی راوی کے پل سے اوپر گزرا ہے تو چناب میں بھی جوار بھاٹا آ گیا ہے۔ یوں لاہور اور گجرات کے دونوں دریاؤں کا پانی خطرے کے نشان تک پہنچ گیا ہے۔ ہمارا یہ تأثر کسی اخباری رپورٹ یا کسی قاصد کے نامہ و پیام پر مبنی نہیں بلکہ یہ سب کچھ فرسٹ ہینڈ معلومات ہیں۔ کونسل آف نیشنل افیئرز کے تازہ اجلاس (۳۰ رجون) میں اس بار چودھری شجاعت حسین مدعو تھے۔ ہم نے انہیں CNA کے پروٹوکول کے مطابق کہا کہ آپ جو کچھ کہنا چاہیں کھل کر ارشاد فرمائیں البتہ یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ آپ اپنی گفتگو کو آف دی ریکارڈ قرار دیں یا آن دی ریکارڈ کا درجہ دیں اور موضوع ہے ''مسلم لیگ کا باہمی اختلاف'' اس پر چودھری صاحب نے CNA کے ذمہ داران اور ارکان کا اپنے مدعو کرنے پر شکریہ ادا کیا اور فرمایا میں یہ بات یا تو کرتا نہیں جب کرتا ہوں تو وہ آن دی ریکارڈ ہوتی ہے، ان کا کہنا ہے کہ:

''۱۲ اکتوبر کے بعد صورتحال یہ ہو گئی تھی کہ کوئی وزیر، ایم این اے اور ایم پی اے مسلم لیگ کا اجلاس اپنے ہاں رکھنے کو تیار نہیں تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ میرے گھر کی مرمت ہو رہی ہے (غالباً وہ کسی ''مرمت'' سے بچنا چاہتا تھا) کسی کا عذر تھا کہ اس کے گھر پلستر اکھڑا ہوا ہے (ممکن ہے سانس بھی اکھڑی ہوئی ہو) کوئی بہانہ کر رہا تھا کہ اس کے گھر کا رنگ ہو رہا ہے۔ (شائد رنگ اڑا ہوا بھی ہو) وغیرہ بالآخر رانا نذیر نے ڈیفنس میں ایک شادی ہال بک کرایا جب مجھے اطلاع ملی تو میں نے کہا شرم کا مقام ہے کہ مسلم لیگ کا اجلاس شادی ہال میں ہو۔ اس کے لیے میں نے اپنا گھر (غالباً اسلام آباد) پیش کیا اور وہاں رابطہ کمیٹی تشکیل پائی اور دھیمے مزاج کے حامل اور سنجیدہ و متین طبع راجہ ظفر الحق اس کے کنوینئر بنے اور اس اجلاس کا حاصل اور اہم ترین فیصلہ یہ تھا کہ تمام امور رابطہ کمیٹی کرے گی اور مستقبل میں وہی فیصلے کرنے کی مجاز ہو گی۔ لیکن بد قسمتی سے چاغی مارچ سے لے کر کارگل پر بیان دینے اور نائب صدور کے تقرر تک رابطہ کمیٹی سے کوئی رسمی رابطہ بھی نہیں کیا گیا۔ بیگم کلثوم نے فرمایا

ہے کہ انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا تھا۔ یہ غلط بیانی ہے۔ کنسلٹیشن اور انفرمیشن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ انہوں نے صرف مجھے نائب صدر کے تقرر کی اطلاع کی تھی اور ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ راجہ صاحب سے بات ہوگئی ہے۔ غالباً ان سے بھی اسی طرح بات ہوئی ہوگی جس طرح وہ میرے بارے میں کہہ رہی ہیں۔ چودھری شجاعت حسین سے جب پوچھا گیا کہ میاں فیملی کے اس انداز و مزاج کا سبب کیا ہے تو انہوں نے کہا" حد سے بڑھا ہوا شکی مزاج ہونا" اب یہ بات ان کے خلاف جا رہی ہے۔ پہلے وہ مجھ سمیت ہر ایک پر شک کرتے تھے اور ہم سب شکوک و شبہات کے رفع کرنے کے جتن کرتے تھے مگر اس وقت وہ ہماری نظروں میں مشکوک ہو گئے ہیں اب انہیں ہمارے شکوک دور کرنے ہوں گے تب بات آگے بڑھے گی۔

چودھری شجاعت بغیر کسی جھجک اور ذہنی تحفظ کے کہہ رہے تھے کہ انہی دنوں مسلم لیگ کے مرکزی و صوبائی الیکشن بھی ہوئے تھے اور ہمارا خیال تھا کہ ایک رسمی سے اجلاس میں سابقہ سیٹ اپ کو کنفرم کر دیا جائے گا مگر بیگم صاحبہ نے یہ کہہ کر حد کر دی کہ مسلم لیگ میں الیکشن کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے ان سے کہ وہ الیکشن نہ کرائیں مگر یہ تو نہ کہیں کہ ضرورت نہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ کسی نے ایک شخص سے شکر مانگی اس نے کہا میرے پاس نہیں ہے ویسے ہوتی بھی تو آپ کو ہرگز نہ دیتا۔

چوہدری صاحب کا کہنا تھا کہ اس سارے قصے اور فساد میں یکطرفہ معلومات اور اطلاعات کی کارفرمائی ہے اور میاں صاحب اپنے دورِ اقتدار کی طرح اب بھی چند لوگوں کے نرغے میں گھر چکے ہیں۔ اس روش نے پہلے حکومت کا تختہ کیا اب مسلم لیگ کا جنازہ نکلے گا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ جیسے لیڈر اپنے قائد کے لیے باہر کیوں نہیں نکلے؟ تو انہوں نے کہا لیڈر ورکروں کے زور پر ہوتے ہیں مگر ڈھائی سال میں ورکر کو کیا ملا کہ وہ ہمارے کہنے پر باہر نکلے؟ ان کا کہنا تھا کہ فوج نے مسلم لیگ کو کسی بھی سطح پر توڑنے کی کوشش

نہیں کی یہ ساری ٹوٹ پھوٹ ہماری اندرونی بے تدبیریوں کا شاخسانہ ہے۔ایک طویل نشست کا خلاصہ یہی ہے ورنہ تو یہ ہیر رانجھا کی کہانی ہے،لذیز تر اور طویل تر،ہمارے نزدیک بات صرف اتنی نہیں کہ یہ مسلم لیگ کا مسئلہ ہے۔میاں نواز شریف کے مزاج کا نتیجہ ہے یا مسلم لیگی لیڈروں کی مصلحت اندیشی کا اسلوب ہے بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں سیاسی پارٹیاں ایک دو کو چھوڑ کر سیاسی پارٹی کی تعریف اور زمرے میں آتی ہی نہیں۔ان میں بعض پریشر گروپ ہیں،بعض فرقہ وارانہ جذبات کی ترجمان،بعض پاور کلب اور بعض وقت گزاری اور ڈیرے داری کا بہانہ۔یہ سارے شاخسانے نے اسی طرزِ عمل کے ہیں۔سیاسی پارٹی کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ کسی منشور کی بنیاد پر وجود میں آئے اس کا کوئی دستور العمل ہو۔عزل و نصب کا کوئی طریقِ کار ہو۔اور اپنے اہداف کی طرف بڑھنے کا کوئی واضح لائحہ فکر ہو۔مگر ہمارے یہاں دولت اور اثر ورسوخ کی بنیاد پر پارٹی کھڑی ہو جاتی اور اقتدار کی حصہ دار بن جاتی ہے اور ذرا سے اختلاف پر کئی ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے اور بالآخر پارٹی خاندان میں سمٹ کر رہ جاتی ہے۔پیپلز پارٹی ہو یا مسلم لیگ،اے این پی ہو یا بی این پی،سب کے ہاں یہی رواج ہے۔چونکہ مسلم لیگ قیام پاکستان کے بعد کبھی عوامی پارٹی نہیں رہی اس کا اتار چڑھاؤ اقتدار سے منسلک رہا لیکن ۷۳ء کے بعد اسے عوامی پذیرائی ملی،اگر تو یہ پہلے دن سے ایک باقاعدہ سیاسی پارٹی ہوتی تو یہ جھٹکا سہہ جاتی چونکہ ایسا نہیں تھا اس لئے اس میں دراڑیں ابھرنا ایک فطری عمل ہے۔آخر بیگم کلثوم نواز کیوں نہیں چاہئیں گی کہ اندرا گاندھی،حسینہ واجد،خالدہ ضیاء،بندرا نائیکے،لورکی اکینو،سونیا گاندھی اور بے نظیر بھٹو کی طرح وہ بھی خاندانی وراثت کے ساتھ ساتھ سیاسی وراثت بھی اپنے پاس رکھیں۔

''فارمولا وزٹ''

ہمارے ہر حکمران نے ہر دور میں مختلف علاقے اور محکمے وزٹ کیے ہیں۔ لیکن سب کے سب ''فارمولا وزٹ'' اور ہماری بیوروکریسی فارمولا وزٹ کرانے کی چمپئن بلکہ موجد ہے۔ حاصل ماحصل تو کچھ نہیں البتہ انتظامات کے حوالے سے سرکاری خزانہ زیربار آجاتا ہے اور کئی ماہ تک کراہتا رہتا ہے۔ مخلوقِ خدا الگ سے مبتلائے آزار اور بےزار ہوتی ہے۔

حال ہی میں جنرل پرویز مشرف نے ریلوے ہیڈ کوارٹر اور ریلوے اسٹیشن لاہور کا وزٹ کیا ہے۔ رات کو خبرنامے میں جو فلم رپورٹ دیکھنے کو ملی۔ ریلوے سٹیشن لاہور کا نہیں پیرس کا معلوم ہو رہا تھا۔ صاف شفاف، چمکتا دمکتا اور روشن و تابدار، نہ خوانچہ، نہ ریڑھا، نہ چھلکا، نہ کاغذ، نہ کیچڑ اور نہ کچرا، سنا ہے ریلوے ہیڈکوارٹر کو راتوں رات بنایا، سنوارا اور نکھارا گیا۔ سڑکوں پر پیچ ورک کیا گیا۔ چونا بکھیر کر داغدار جگہیں ڈھانپی گئیں اور یوں ایک خوشگوار ماحول پیدا کیا گیا۔ معلوم نہیں جنرل صاحب کا کیا تاثر بنا؟ لیکن عوام کو تو معلوم ہے کہ ریلوے اسٹیشن کیا ہے؟ پلیٹ فارم کیسے ہیں؟ خوانچوں کی یلغار کس درجے کی ہے؟ قلیوں کی مار دھاڑ کا کیا عالم ہے؟ صفائی کا انتظام کیسا ہے؟ اور باقی معاملات کا کیا حال ہے؟

؎ جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

جس طرح بعض لوگوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ زبان کی روزی کھاتے اور بول بچن سے رزق کماتے ہیں اسی طرح ہماری بیوروکریسی ایسی ہی "پھرتیوں" اور "چابکدستیوں" کے باعث ہر حکومت کی ضرورت بنی ہوئی ہے اور ہر حکمران کے لیے قرارِ دل و جان۔ ایک زمانے میں خواجہ ناظم الدین کا ریلوے سیلون خانپور کے اسٹیشن پر رکا تھا تو انتظامیہ نے پورا پلیٹ فارم لکس صابن سے دھویا، لشکایا اور مہکایا تھا۔ ظاہر ہے ایسے "چابکدست" اور "خوش ذوق" افسر کس کے دل میں جگہ نہیں پاتے اور کس کی آنکھ کو ٹھنڈک نہیں پہنچاتے؟

باہر کا کوئی سربراہ یا معزز مہمان جب پاکستان کے دورے کے اختتام پر اپنے تأثرات بیان کرتا ہے تو وہ لاہور، کراچی وغیرہ کی سڑکوں، آبادیوں اور پارکوں کی خاص طور پر تعریف کرتا ہے۔ اُس کا سبب بھی ہمارے افسروں کی "کاریگری" اور "استادی" ہوتی ہے۔ ظاہر ہے وہ مہمان شالامار باغ یا گلستانِ فاطمہ جناح ہی جاتا ہے۔ اسے کیا خبر کہ لاہور اس کے علاوہ بھی کہیں پایا جاتا ہے۔ مصری شاہ، وسن پورہ، کھاڑک اور بلال گنج وغیرہ بھی لاہور ہی کا حصہ ہیں۔ گورنر ہاؤس کا وسیع و عریض اور سرسبز و شاداب لان، گلستانِ فاطمہ کی مہکتی روشیں، شالامار باغ کے اُبلتے فوارے، مال روڈ کی آسودگی بخش چھاؤں، سٹیٹ گیسٹ ہاؤس کا مخملیں سبزہ، پرل کانٹی نینٹل پر تنی ہوئی رنگ و نور کی چادر، اور ڈیفنس کا کوئی شاندار اور روشن بنگلہ بھلا اچھا تأثر کیوں نہیں چھوڑے گا۔ لیکن وہ مہمان تو ظاہر ہے باہر کے ہوتے ہیں انہیں منظر کے علاوہ پسِ منظر کیسے معلوم ہو؟ مگر ہمارے حکمرانوں کو تو سارا پتہ ہے۔ تعفّن بکھیرتی کچی بستیوں کا، بیماریاں پھیلاتی نالیوں کا، کپڑے لتھیڑتی کیچڑ کا، ناک سے ٹکراتی بدبو کا، تازہ ہوا سے محروم گلیوں کا، اور بیوہ کی مانگ کی طرح اجڑی ہوئی کالونیوں کا، ان سے کون سا پردہ اور حجاب ہے؟

جنرل پرویز مشرف اگر مختلف جگہوں، علاقوں، شہروں، بستیوں اور محکموں کا معائنہ کرنا چاہتے ہیں تو محمود غزنوی کی طرح منڈھا سا مار کر یا شیر شاہ سوری کی طرح صافہ لپیٹ کر دورہ کریں ہر علاقے اور محکمے کا اصلی چہرہ سامنے آ جائے گا۔ یا پھر کھلم کھلا آئیں، افسروں کے جلو اور نقشوں کے حصار میں نہیں۔ بلکہ عوام کے ہجوم کو ساتھ لے کر آئیں۔ عوام خود ہی ان کی حفاظت کریں گے۔ پھر آ کر دیکھیں کہ ہر علاقے اور محکمہ کا انتظام کیسا جا رہا ہے؟ چارٹوں کی مدد سے بریفنگ لیں گے، سکرینوں پر اعداد و شمار اور تصویریں دیکھیں گے۔ نقشوں کی بھول بھلیوں میں گم رہیں گے اور افسروں کی زبان پر اعتبار کریں گے تو پھر ریلوے اسٹیشن انہیں فردوس بریں نظر آئے گا اور ہر محکمہ روشن و زرّیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ گورنر ہاؤس کی شادابی کئی ہزار انسانوں کی اداسی و افسردگی کا نتیجہ ہے اور سٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے سبزے کے پیچھے ہزاروں غریبوں کے نوحے چھپے ہوئے ہیں۔ پی سی ہوٹل کی روشنیاں کئی گھروں کے چراغ بجھا کر کشید کی گئی ہیں اور ڈیفنس کے بنگلے دراصل مرثیے ہیں جو لاکھوں انسانوں نے اپنی غربت پر پڑھے ہیں۔

جنرل صاحب ہمیں معلوم ہے کہ آپ کا خاندانی پس منظر کوئی سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نہیں، آپ اسی مٹی کے ہیں اور اس دیس کی گلیوں کی بود باش سے واقف ہیں۔ اس لیے آپ بیوروکریسی کے چکر میں نہ آیئے اور فارمولا وزٹ پر نہ جایئے، یعنی ایسا وزٹ جس کا روٹ بھی طے ہو۔ وہاں معائنہ کے لیے جگہیں، فائلیں اور نقشے بھی پہلے سے تیار ہوں۔ باتیں بھی رٹی رٹائی اور سیکنڈ منٹ تک کا حساب لکھا پڑھا ہو۔ یہ ان حکمرانوں کا مسئلہ تو ہو سکتا ہے جنہیں شوقیہ روزہ رکھنے کے علاوہ بھوک کی خبر نہ ہو۔ جنہیں فریش جوس اور منرل واٹر کے علاوہ پانی کی کسی اور قسم کا پتہ ہی نہ ہو اور جنہیں سلک ماربل اور دبیز ایرانی قالین کے علاوہ زمین پر قدم رکھنے کا تجربہ ہی نہ ہو

لیکن آپ تو سولجر ہیں، پہاڑیاں، گھاٹیاں، کھائیاں، جھاڑیاں، پگڈنڈیاں، سب آپ کی دیکھی بھالی ہیں، جنگی مشقوں کے دوران آپ مورچوں میں رہے ہوں گے ایسے اس ملک میں لاکھوں گھر ہیں جن پر مورچے کا گمان ہوتا ہے۔ کچے، تاریک اور تنگ گھر، آپ کہیں جائیں اور راستہ میں قالین بچھے ہوں اس کا مطلب ہے خزانے پر ناروا بوجھ ڈالا گیا ہے۔ جس راستے سے گزریں اور دونوں طرف قسم قسم کے پھولوں سے آراستہ گملے سجے ہوں تو اس کا معنی ہے کہ عوام کے ٹیکسوں کا پیسہ ان کی بھینٹ چڑھایا گیا ہے اور آپ جس جگہ جائیں وہ بنی سنوری اور سجی نکھری ہو تو اس کا واضح مفہوم یہی ہے کہ چند گھنٹوں کے لیے ہزاروں روپے ضائع کر دیئے گئے ہیں۔ جو کسی کی جیب سے نہیں حکومت یا رعیت کی جیب سے نکلے ہیں۔ آپ کے اس طرح جانے سے معلوم نہیں کوئی مسئلہ حل ہو یا نہ۔ لیکن ملکی پیسہ تو ضائع ہو گیا اور جتنا لگا ہوا نظر آتا ہے اس سے کہیں زیادہ افسرانِ کرام کی جیبوں میں چلا جاتا ہے۔ یہ کھلے راز اور جانے پہچانے حقائق ہیں۔ اور سب کو معلوم ہیں اور آپ کو سب سے زیادہ معلوم ہونے چاہئیں اس لیے کہ رعایا کے ہر فرد کے دو کان اور دو آنکھیں ہیں جبکہ حکمران کے اتنے کان اور اتنی آنکھیں ہونی چاہئیں جتنے اس ملک کے عوام ہیں۔ دورے ضرور ہوں، مگر اچانک اور فطری انداز میں، پھر معلوم ہو گا کہ یہاں آدے کا آوا ہی نہیں باوا بھی بگڑا ہوا ہے۔

ابلاغ اور اعتماد کا بحران

ہمارے ایک ملنے والے ہیں ان کا بیٹا کہیں ملازم ہے لیکن اپنے والد کے بر عکس ذرا ماڈرن مزاج اور بابو سٹائل ہے ہمارے دوست اپنے بیٹے کا احوال بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب اسے نئی تنخواہ ملتی ہے تو گھر والوں سے انگریزی میں بات کرتا ہے جب ذرا پیسے کم ہونے لگتے ہیں تو اردو بولنے پر آجاتا ہے اور جب بالکل پھانگ ہو جاتا ہے تو سیدھے سبھاؤں اپنی مادری زبان پنجابی بولنا شروع کر دیتا ہے یہ نفسیاتی مسئلہ صرف ایک نوجوان کا نہیں ہمارے ہر حکمران کا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اس نوجوان کے پاس چار پیسے ہوں تو وہ انگریزی بولنا اپنا استحقاق سمجھتا ہے ظاہر ہے جیب بھاری ہو تو لہجہ بھاری ہو ہی جاتا ہے مگر ہمارے حکمران پائی پائی کے لئے بیرونی اداروں کے محتاج ہوں پھر بھی انگریزی بولنے سے باز نہیں آتے غالباً ان کا خیال ہے کہ حکومت چلانے اور رعب جمانے کے لئے کوئی اور خوبی ہو نہ ہو پر انگریزی بہت ضروری ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس بدلتی زبان نے حکمرانوں اور عوام کے درمیان ابلاغ کا ایک بہت بڑا بحران پیدا کر رکھا ہے پھر بھی حکمران ہمیشہ گلہ گزار رہتے ہیں کہ عوام ہم سے کھنچے کھنچے اور گریزاں رہتے ہیں عوام کے گریز اور بعد کے اور بھی اسباب ہیں مگر باہمی محبت اور رشتہ وفا کے لئے رابطہ اور ابلاغ بنیادی اور کم از کم شرط ہے جو اسے پورا نہیں کرے گا اس سے تعلق خاطر کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے؟ زبانِ یار ترکی ہو اور

عاشق زار ترکی سے نہ صرف نابلد بلکہ بیزار ہو تو محبت کیسے پروان چڑھ سکتی ہے؟ ایک اچھی حکومت بلاشبہ ہر دور کے حکمرانوں کا مرعوب نعرہ، عوام کا دیرینہ مطالبہ اور قوم کا حاصل تمنا ہے اور اس اچھی حکومت کے قیامت میں بہت سے اسباب رکاوٹ ہیں، انگریز کا دیا ہوا سیاسی فریم ورک، بار بار فوجی مداخلت، سیاستدان کا ناپختہ رویہ اور شاہانہ اسلوب حکومت، جاگیردارانہ نفسیات، تعلیم کی شرمناک حد تک کمی، بیوروکریسی کا فرسودہ ڈھانچہ اور برادری ازم وغیرہ، مگر ایک اہم وجہ حکمرانوں اور عوام کے درمیان ابلاغ اور رابطے کا فقدان ہے اور یہی باہمی اتحاد کے لئے بحران بن چکا ہے کیا یہ پیش پا افتادہ اور قریب کی حقیقت نہیں کہ ہماری قومی اور رابطے کی زبان اردو ہے مگر ہماری بیوروکریسی اور حکمرانوں کی زبان انگریزی ہے۔ رابطہ و ابلاغ ہو تو کیسے؟ پاکستان کی چار مسلمہ علاقائی زبانیں ہیں۔

پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی اور قومی زبان اردو لیکن المیہ یہ ہے کہ ہمارے حکمران سوچتے بھی انگریزی میں ہیں اور بولتے بھی انگریزی میں، اور ان کی دیکھا دیکھی ہماری دانش پر بھی انگریزی کا لیپ چڑھ چکا ہے، یہ حکمرانی کرنے کا کوئی معروف اور مسلمہ طریقہ تو نہیں البتہ بدیسی اور استعماری حربہ ضرور ہے، یعنی دوسری اور اجنبی زبان بول کر حکمران اپنے اور عوام کے درمیان فاصلہ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں ورنہ ان کے خیال میں سارا طلسم اور حکمرانی کا بھرم ٹوٹ جاتا ہے، ہمیں یا کسی بھی شخص کو انگریزی سے کوئی چڑ اور بغض نہیں یہ بھی دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح ایک زبان ہے جیسے چینی، جاپانی، عربی اور ہندی وغیرہ اور اردو زبان ہمیشہ یا تو ابلاغ کے لئے ہوتی ہے یا پھر حصول علم کے لئے رعب جھاڑنے اور رعایا کو لتاڑنے کے حربے کے طور پر صرف ہمارے ہاں اس کا استعمال ہوتا ہے یعنی انگریزی بولنے کا مطلب ہے بڑا ہونا، افسر ہونا، عالم ہونا اور بزعم خویش مہذب اور ماڈرن ہونا اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ

جو انگریزی نہیں بولتا جس قوم کی زبان انگریزی نہیں وہ غیر مہذب اور غیر ترقی یافتہ ہے یہ سوچ بذات خود کس قدر چھوٹی، غیر علمی اور تہذیب و ترقی کے برعکس ہے کیا فرانس ماڈرن، مہذب اور ترقی یافتہ ملک نہیں، وہاں کون سی انگریزی بولی جاتی ہے دنیا کا بہت اعلیٰ علمی لٹریچر فرانسیسی زبان میں ہے اور فرانس آداب و تکلفات اور تہذیبی روایات کا حامل ہی نہیں بلکہ خالق ملک سمجھا جاتا ہے کیا چین کی روز افزوں ترقی انگریزی کی مرہون منت ہے؟ جب کہ وہاں کا کسی دور کا حکمران انگریزی جاننے کے باوجود کبھی انگریزی میں بات کرتے ہوئے نہیں پایا گیا، کیا جاپان کی صنعتی ترقی میں اب کسی کو شک رہ گیا ہے اور وہاں کون سی انگریزی بولی جاتی ہے؟ روس سپر پاور رہا ہے کیا لینن سے لیکر بورس یلسن تک کبھی کسی روسی سربراہ نے انگریزی کو وسیلہ اظہار بنایا ہے؟ ہرگز نہیں تو پھر یہ نفسیاتی بیماری صرف ہمیں کیوں لاحق ہے؟ اور ہم اسے اچھی حکومت، اعلیٰ تہذیب اور ہمہ نوعی ترقی کا سرچشمہ کیوں قرار دیئے ہوئے ہیں متذکرہ بالا چاروں ممالک مسلمہ طور پر سیاسی دفاعی، اقتصادی اور تہذیبی طاقتیں ہیں، ہماری پختہ اور تعصب سے پاک رائے ہے کہ ہمارے حکام و عوام کے درمیان بہترین ابلاغ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حسن اعتماد کی ایک ہی صورت ہے کہ حکومت اور قوم کی زبان کا فاصلہ مٹا دیا جائے ورنہ رجحان کا فاصلہ بڑھتے بڑھتے بحران جنم دے سکتا ہے، زبان کے اس خلاء نے رفتہ رفتہ بہت سے خلا پیداء کر دیئے ہیں اور روز بروز حکمرانوں اور لوگوں کے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ عوام کو دھوتی شلوار میسر نہیں اور حکمران بھڑکتے کوٹوں اور کڑکتی پتلونوں میں نظر آتے ہیں عوام مشکل سے اردو سمجھ پاتے ہیں اور حکمران انگریزی سے کم کسی زبان میں بات کرنے پر آمادہ نہیں، عوام ناشتے میں رات کی باسی روٹی اور چاٹی کی لسی اور اچار کی ڈلی کے ساتھ کھاتے ہیں اور حکمران مارملیڈ مرجرین پیزا اور میکڈونلڈ کے برگر کے ساتھ ناشتہ فرماتے ہیں، اور

عوام گھٹنوں پانی اور مٹی میں چل کر ہل چلاتے اور پنیری لگاتے ہیں اور حکمران ائیر پورٹوں دفتر کی راہداریوں اور ہوٹل کی لابیوں میں دبیز قالین کے بغیر قدم دھرنے کو تیار نہیں، ابلاغ اور رابطہ ہوتو کیسے؟ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگوا تیلی۔

ہم نے تو اپنی کتاب میں لکھ رکھا ہے ہماری اہلیت اور رولنگ کلاس بھی اپنی نوٹ بک میں درج کرے کہ عوام اور حکام کے درمیان ابلاغ اور حسن اعتماد پیدا نہیں ہوسکتا جب تک کہ ایچی سن کالج اور ٹاٹ سکول کا فاصلہ ختم نہیں ہو جاتا جب تک بدیسی کلچر اور دیسی ثقافت کی پیوند کاری ختم نہیں ہو جاتی، جب تک قومی زبان پر بیرونی زبان کا غلبہ ختم نہیں ہو جاتا اور جب تک مرسڈیز اور ٹم ٹم کا مسئلے حل نہیں ہو جاتا۔ آج ہمارے حکمرانوں اور افسر شاہوں کی زبان بدل جائے کل سے رجحان بدلنا شروع ہو جائے گا اور کچھ ہی عرصے میں ابلاغ واعتماد کا بحران تحلیل ہو جائے گا۔

جاگیرداری اور سیاسی اجارہ داری

یہ بات کسی مخفی راز یا اہم انکشاف کے زمرے میں نہیں آتی کہ پوری قوم کی منتخب اسمبلی پچانوے فیصد عوام کی نمائندگی سے محروم اور پانچ فیصد جاگیرداروں سے معمور ہوتی ہے یہ بات ایک اعلیٰ پائے کے دانشور اور تھڑے پر بیٹھنے والے لقعلی گر کے علم میں ہے ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب خون کھولانے والا تو ہے مگر ہے بالکل واضح اور وہ یہ کہ ہماری ڈیڑھ صدی کی سیاست زر اور جاگیر سے وابستہ ہے یہ زر کس چشمے سے ابلتا اور جاگیر کس حربے سے ملتی ہے؟ اس پر ماضی کی تاریخ کا ایک ایک ورق گواہ ہے زر و جاگیر کی یہ فراوانی نہ محنت کے سبب ہے اور نہ ذہانت کے باعث اس کی ساری اساس انگریز بہادر کی چاپلوسی پر ہے۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ برصغیر میں ایک دور ایسا گزرا ہے کہ جب تحریک آزادی چلی تو کوچہ و بازار خون شہیداں سے لالہ زار بن گئے تھے، پھانسیوں، پھندوں، ٹکٹکیوں اور کوڑوں کی ایک فصل اُگ آئی تھی ہر سر کشیدہ سر کش، ہر خوددار مستحق دار اور ہر بندہ آزاد لائق تعزیز و استبداد قرار پایا گیا تھا کوئی تختہ دار پر کھینچا جا رہا تھا اور کوئی جزائر انڈیمان بھیجا جا رہا تھا کوئی کوڑوں کی زد میں تھا اور کوئی گولیوں کی بوچھاڑ میں شرفاء بازاروں میں برہنہ پا اور برہنہ سر گھمائے جا رہے تھے اور علماء دہکتے کوئلوں پر لٹائے جا رہے تھے، کسی کے مقدر میں قید با مشقت تھی اور کسی کے نصیب میں جلاوطنی، اور ہجرت ایسے میں ایک نئی

نسل سامنے آئی، سرخمیدہ، دم بریدہ اور سرتاپا قصیدہ۔

یہ لوگ نہ علماء تھے نہ سیاسی زعماء، نہ ارباب فضل تھے اور نہ اصحاب شرف یہ شب زادگان اچانک طلوع ہوئے اور انگریز کے جاسوس، مخبر، قصیدہ خوان اور بازوئے شمشیرزن بن گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کاسۂ گدائی تھامنے والے خلعت شاہی میں ملبوس نظر آنے لگے یہی وہ لوگ ہیں جنہیں آج جاگیردار کہا جاتا ہے اور ساتھ ہی یہی سیاسی اجارہ دار ہیں، ہندوستان آزاد ہوگیا، پاکستان بن گیا لیکن یہ پیران تسمہ پا ہشت پا کیکڑے کی طرح آج تک پنجہ زن ہیں آج جن کی اولاد اپنے جوتوں پر گرد نہیں پڑنے دیتی ان کے بزرگوار اسپان فرنگ کی گرد جھاڑا کرتے تھے، آج یہ اپنا جھوٹا اپنے مزارع کو کھلانا اپنے دستر خوان کی توہین سمجھتے ہیں انکے بڑے ایک عرصے تک انگریز کا پس خوردہ تبرک سمجھ کر کھاتے تھے اور آج جو جاگیردار عام آدمی سے ہاتھ ملانا اپنی سبکی سمجھتے ہیں ان کے آباء واجداد انگریز کے پاؤں میں بیٹھنا دارین کی سعادت قرار دیتے تھے یہ جاگیردار کیسے بنے؟ ان پر باران الطاف کیوں کر برسا؟ ان پر در کشاد کیسے کھلا؟ ان کا وہ کون سا فن کون سا ہنر اور کون سا جوہر تھا جو انہیں کنگال سے مالا مال بنا گیا؟ ایک حرفی جواب ہے "انگریز سرکار کی چاپلوسی" اور بس!

یہ موضوع اگرچہ خوشگوار نہیں بلکہ سینے کے داغ تازہ رکھنے کے لئے یادوں کے چراغ جلانے پڑتے ہیں خواہ دل جل کر کباب ہو جائے اور یہ باتیں کوئی خانہ ساز اور طبع زاد نہیں سرکاری ریکارڈ ہیں جو لائبریوں اور سول سیکرٹریٹ کے کاغذوں میں محفوظ ہے۔ برطانیہ کے بادشاہ ایڈورڈ ہفتم کے جشن تاج پوشی کے موقع پر ڈیرہ غازی خان کے رئیسوں اور سرداروں کی طرف سے ایک عرضداشت پیش کی گئی اور ان روسا اور زعماء میں یادش بخیر مزاری، لغاری، کھوسہ، دریشک، قیصرانی، ملغانی، گورچانی، بردار بھی، بزرگوار، شامل ہیں۔ قارئین کو پڑھتے ہوئے نسبتاً دقت تو ہوگی لیکن ایک ایک

لقب اور لفظ درج کرنا ضروری ہے اس دور کا انداز مدح اور اسلوب خوشامد کیسا تھا؟ کیسے کیسے القاب دل و دماغ کی ٹکسال سے ڈھل کر نکلتے تھے؟ اور شاہی عظمت اور اپنی ذلت کا کیا کیا سامان کیا جاتا تھا؟ بڑا کلاسیکل سپاسنامہ ہے صرف چند سطریں پیش ہیں پورا مضمون آپ کے ذہن میں خود بخود آ جائے گا۔

"بعد عرض فیض غرض باریافتگان پایہ سریر سلطانی، ظلِ یزدانی، آیت دولت جاودانی، عدل و انصاف اور جہاں بانی کے مصدر و منبع، اعلیٰ حضرت شہنشاہ عالی جاہ، عالم پناہ، والا بارگاہ، خدیو گیہان منصف دوران سلیمان زمان، جمشید جہاں، جناب معلیٰ القاب، فیض مآب، معدلت انتساب شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم، اللہ آپ کے اقبال شان و شوکت کو تا ابد قائم و دائم رکھے۔"

یہ قصیدہ چونکہ بہت طویل ہے لیکن ابتداء بتا رہی ہے کہ انتہا کیا قیامت ہوگی؟ آگے چل کر یہ روسائے کرام فرماتے ہیں۔

"یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ ہم سلطنت عظمیٰ کے دوسرے ممالک میں بسنے والوں کا مقابلہ علوم و فنون کی تحصیل اور زراعت اور ترقی کی تجارت میں کسی طور پر نہیں کر سکتے مگر ہم اس بات پر بجا طور پر نازاں ہیں کہ ہم برطانیہ عظمیٰ کے تخت کی تابعداری اور فرمانبرداری میں ان سے کسی طرح پیچھے نہیں۔

"آخر میں ہماری دعا ہے کہ خدائے ذوالجلال شہنشاہ با استقلال اور عالم پناہ با کمال کے اقبال اور اجلال کو ہمیشہ عروج بخشے اور سایہ ہما پایہ فیض گنجور کے فیوضات کا ظہور اہل جان کی پیشانی پر تا ابد قائم و دائم رہے آمین یا الہ العالمین ان دعاؤں کا نتیجہ یہ نکلا کہ "فیض گنجور" تو یہاں نہ رہے مگر اپنا "فتور" پیچھے چھوڑ گئے جن سے لگائے زخموں سے پورا جسد سیاست چور چور ہے۔

تفصیل جاننے کے لئے تو کتابوں کو کھنگالنا پڑے گا تاہم اس روش کے نتیجے

میں کیا کیا عنایات ونوازشات ہوئیں اوپر جن آٹھ قبائل کا ذکر ہوا ہے ان کے پاس مجموعی طور پر آٹھ لاکھ ایکڑ اراضی رہی جو حیلوں بہانوں سے آگے، پیچھے ہوتی رہی مگر ان کی جاگیرداری اور سیاسی اجارہ داری میں کوئی بڑا فرق نہیں پڑا، اسی سے ملتا جلتا احوال گرمانیوں، خانگڑھ کے نوابوں جھنگ کے سادات اور سیالوں اور گوجرانوالہ کے چٹھوں کا ہے۔

یہ تو پنجاب کے جاگیردار ہیں، سندھ کے وڈیرے ان سے بھی دو قدم آگے نکلیں گے۔ سیاسی اجارہ داری اس وقت نہیں ٹوٹ سکتی جب تک کہ جاگیرداری کی زنجیر نہ ٹوٹے، لیکن آفرین ہے عوام پر اور حوصلہ ہے ووٹروں کا اب تک کم وبیش دس بار انتخابات ہو چکے ہیں کیا مجال انہوں نے مہرے تو کیا چہرے ہی بدلنے کی کوشش کی ہو۔ وہ جس طرح کہتے ہیں کہ ''میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی'' جب عوام ہی ان کے طلسم ہوشربا سے باہر آنے کو تیار نہیں تو کسی حکومت کو کیا پڑی ہے کہ وہ جاگیرداری کا کالبوت اتارنے اور توڑنے کی کوشش کرے، حکومت کے لئے تو یہ لوگ الٹا کھاد کا کام دیتے ہیں۔

عہد استعمار کا شاخسانہ

علماء کرام کو اجتماعی سیاسی اور سماجی زندگی سے کاٹ پھینکنے کے اگر بہت سے اسباب وعوامل خود علماء کے پیدا کردہ ہیں تو ان میں ایک بڑا سبب انگریزی عہد حکومت ہے جب انگریز نے یہاں قدم جما لیا تو اس نے اپنا نظامِ تہذیب و تعلیم نہ صرف متعارف کرایا بلکہ پوری قوت اور جملہ وسائل کے ساتھ اسے یہاں رائج اور نافذ کیا اور ساتھ اسے غالب کرنے کی ہر ممکن تدبیر کی، انگریز کے نظام تمدن میں دین اور سیاست دو الگ چیزیں ہیں اور وہ بہت عرصہ پہلے انگلستان میں چرچ اور اسٹیٹ کو الگ کر چکا تھا۔

اس طرح یہاں بھی فقہی رہنمائی اور سیاسی رہبری کے ساتھ دو الگ دائرے بن گئے چنانچہ لوگوں نے انگریز سے وفاداری کا پیمان باندھا جنہیں جاگیریں الاٹ ہوئیں جنہیں تمغے ملے جو لوگ لندن یاترا کر کے آئے جو مزاج شناس فرنگ تھے اور دینی زوال پر قانع ہوئے اور دنیوی عروج کے حریص بنے انہیں سیاسی ناخدا بننے کے تمام مواقع مہیا ہوئے بلکہ انہیں مواقع عطا کیے گئے رہ گئے علماء تو وہ درس حریت دینے میں لگے رہے بھلا وہ دو گروہ کس طرح سیاسی معاشرتی عروج بیک وقت حاصل کرتے جن میں سے ایک انگریز کے خلاف جہاد کا فتوی جاری کر رہا تھا اور دوسرا فرنگیوں کے آگے کاسہ لیئے ہوئے تھا ایک فرنگی تہذیب سے الجھنے والا اور دوسرا اس کی طرف لپکنے والا تھا، ایک مزاحمت کر رہا تھا اور دوسرا معاونت پر تلا ہوا تھا ایک جزا ئر انڈیمان کی سزا

کاٹ رہا تھا اور دوسرا انگریز کے تلوے چاٹ رہا تھا، ایک فرنگی راج کا باغی تھا اور دوسرا اس کی چاکری پر راضی تھا ایک پیٹھ پر کوڑے کھا رہا تھا اور دوسرا میم صاحب کے کتے نہلا رہا تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ استعمار کے فریم میں فٹ ہوتے گئے ان کی راہیں آسان ہوتی گئیں اور جو لوگ اللہ و رسول کی چوکھٹ پر پڑے رہے ان کے لئے زندگی تاوان بنتی گئی، یہ بات پبلک کو سو بار ناگوار گزرے مگر یہ واقعہ ہے کہ علماء کے "راندہ درگاہ" ہونے کا ایک سبب انگریز کے سیاسی اور تہذیبی نظام کا غلبہ ہے، آپ اسے علماء کی ضد کہیے یا فرنگی نظام سے کہ کہیے وہ بہر حال اس دائرے میں آگے نہ بڑھ سکے اور آج تک وہ برابر سمٹتے اور سکڑتے چلے جا رہے ہیں یا وہ اس کے لئے مجبور کر دیئے گئے ہیں چنانچہ وہ دن اور آج کا دن ہم ذہنی و فکری طور پر دین اور سیاست کی تفریق کے قائل ہو چکے ہیں اور معاشرتی و سیاسی سطح پر علماء سے رہنمائی کو غیر ضروری قرار دے چکے ہیں اسی طرح لارڈ میکالے کی تعلیمی سفارشات کے نتیجے میں مرتب ہونے والے تعلیمی نظام، نیا بندوست اراضی، حکومتی اداروں پر انگریزی اثرات کی یلغار، نیا طبقاتی سیٹ اپ اور اس طرح کے دیگر بے شمار عوامل ہیں جو علماء کی شخصیت ان کے وقار ان کی کارکردگی اور ان کے سیاسی و سماجی کردار پر اثر انداز ہوئے جو آج ذرہ زیادہ شدت کے ساتھ محسوس ہو رہے ہیں، اپنے کردار کی محدودیت کے حوالے سے صرف علماء ہی مورد الزام نہیں کچھ اور باتیں بھی ہیں جنہیں پبلک اور دانشور سننا نہیں چاہتے یا سن کر ماننے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

لیکن علماء کو چاہیے کہ وہ اس پر اکتفاء نہ کریں کہ ان کے خلاف سازش ہوتی ہے انگریز اور اس کے پروردگان نے انہیں پیچھے دھکیلا ہے اور ایک گہرے منصوبے

کے تحت ان کی پچھلی صفوں میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔

بلکہ جو باتیں ان کے ذمہ لگتی ہیں وہ ان کا مقدور بھر ازالہ کریں۔

علماء اگر لاالہ کے وارث ہیں تو پھر اپنا کردار قاہرانہ اور گفتار دلبرانہ بنائیں پھر سے اپنی نگاہوں میں وہ بجلیاں بھریں جن سے دل سینوں میں کانپ اٹھیں اپنے سجدوں میں وہ کیف پیدا کریں جس سے روح زمین لرز اٹھے اور ایسی اذان کو رواج دیں جو شبستان وجود میں سحر طلوع کر دے۔

اگر کوئی دانشور غیر جانبدارانہ مگر ہمدردانہ تجزے کے ذریعے ان پہلوؤں کو اجاگر کرے جن سے علماء متفق نہ بھی ہوں پھر بھی انہیں ناراض ہونے کے بجائے غور و فکر سے کام لینا چاہیے۔ کیوں کہ چڑیاں سارا کھیت چگ گئی ہیں جو دو چار دانے رہ گئے ہیں کہیں علماء اپنے طرز عمل سے وہ بھی نہ گنوا بیٹھیں، عوام کی سادہ لوحی اپنی جگہ مگر علماء کو حقیقت گریزی کی روش اختیار نہیں کرنی چاہیے۔

فتووں کا فراخدلانہ اجراء

رجال دین اور عوام کے درمیان جو اس وقت خلیج نظر آتی ہے اس کو زیادہ وسیع اور گہرا کرنے میں علماء کرام کے ذوق فتوی طرازی کو خاصا دخل حاصل ہے، حالانکہ علماء سے بڑھ کر اس سے زیادہ کون واقف ہو سکتا ہے کہ اسلام کا مزاج فتوی نہیں بلکہ تقوی ہے، فروغ اسلام اور اشاعت دین میں کسی دور میں بھی کسی مفتی کے فتوی نے بنیادی کردار ادا نہیں کیا بلکہ علماء صلحاء اور صوفیاء کے تقویٰ نے یہ خدمت سرانجام دی ہے، مگر حیرت ہے کہ اس حقیقت کو جاننے اور اسے اپنے خطبات کا موضوع بنانے کے باوجود علماء اپنے "ذوق فتوی" پر قابو نہیں پا سکے۔

ہمارے نزدیک ...... فتوی ...... ایک ماہرانہ قانونی اور فقہی رائے کا نام ہے

* جس طرح کوئی عدالت زیر سماعت مقدمے اور تصفیہ طلب امور میں اٹارنی جنرل، ایڈووکیٹ جنرل یا کسی ماہر قانون یعنی وکیل سے رائے طلب کرتی ہے اسی طرح اسلامی ریاست میں علماء سے کسی مسئلہ کے بارے میں رائے طلب کی جاتی ہے اور اسی رائے کا نام ...... فتوی ...... ہے اور آج بھی فقہی و شرعی امور میں عدالتیں ماہرین فقہ اور علماء سے آراء (یعنی فتوی) لیتی ہیں اور عدالتیں ان آراء اور فتووں کا بے حد احترام کرتی اور انہیں وزن دیتی ہیں جب کہ فتوی فیصلہ نہیں ہوتا جو فی الفور نافذ العمل ہو جائے اور نہ مجاز اور آئینی و قانونی طور پر برسر عمل عدالت سے ہٹ کر اسے کوئی نافذ

کرسکتا ہے، لیکن ہمارے ہاں فتووٰں کا زیادہ تر زور فقہی و اجتماعی امور پر نہیں بلکہ مسلکی مخالفین اور بہت ہی چھوٹے مسائل پر رہا ہے بات بات پر دائرہ اسلام سے خارج کر دینے کا فتویٰ مذہبی دنیا میں ایک عمومی فیشن بن چکا ہے اور ذرا سے اختلاف پر فتویٰ تیار رہتا ہے کہ فلاں کا نکاح باطل ہو گیا، فلاں کی نماز جنازہ جائز نہیں فلاں کے پیچھے نماز نہیں ہوتی فلاں واجب القتل ہے اور فلاں کافر اور مرتد ہے وغیرہ۔

فتووٰں کی اس بھرمار نے فتوے کا وقار اور بھرم مجروح کیا ہے اس طرز عمل سے لوگوں کے اندر ایک خاص تاثر بلکہ کسی حد تک رد عمل ابھرا ہے جو بہر حال علماء کے حق میں مثبت نہیں ہم یہ نہیں کہتے کہ باطل کی گرفت نہ کی جائے لغویات کا نوٹس نہ لیا جائے منکرات پر نکیر نہ کی جائے اور فکری و اعتقادی اور عملی و اخلاقی انحراف پر نہ ٹوکا جائے یہ سب کچھ ہو لیکن تھوک کے حساب سے نہیں بلکہ ٹھونک بجا کر! تا کہ الفاظ و حروف کی اہمیت اور افادیت کم اور مشکوک نہ ہو اگر رائے ٹھوس ہو، متنازعہ فیہ مسئلہ فی الواقع اجتماعی وسماجی اہمیت اور دلچسپی رکھتا ہو بات صحیح فورم پر کہی گئی ہو، دلائل کا معیار اونچا ہو اس کا ابلاغ بہتر اور اسلوب عالمانہ ہو تو اسے معاشرے کا اجتماعی ضمیر ذہنی اور عملی طور پر فوراً قبول کر لیتا ہے، قادیانی ذریت کے خلاف دینی زعماء کا فتویٰ ہر ایک نے قبول کیا صرف اباحیت زدہ اور مذہب بیزار لوگوں نے اس میں ذہنی تحفظ کا اظہار کیا۔

اس فتویٰ کو قبولیت اس لئے ملی، کہ اس پر بحث ملک کے سب سے بڑے فورم قومی اسمبلی ...... میں ہوئی، با قاعدہ دلائل دیئے گئے، فریق مخالف کو صفائی کا پورا پورا موقع دیا گیا تب جا کر فیصلہ صادر ہوا اور آئین پاکستان کا حصہ بنا، مگر آئے روز کے فتوے اور ہر بات پر فتوے کا اجراء بہر حال خوشگوار تاثر نہیں چھوڑتے ہم یہ جسارت تو نہیں کریں گے کہ علماء کے ایک دوسرے کے بارے میں فتووٰں کا ریکارڈ پیش کر دیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ شاید ہی کسی مکتب فکر کا کوئی عالم بچا ہو جو کسی نہ کسی فتویٰ کی زد میں نہ

آیا ہو، بریلوی حضرات کے خلاف دیو بندیوں کے فتوے دیو بندیوں کے خلاف بریلوں کے فتوے، مقلدین کے غیر مقلدین کے خلاف فتوے اور اہل حدیثوں کے اہل تقلید کے خلاف فتوے یہ سب کچھ کتابوں میں موجود ہے اس رویے سے ایک خاص فضا بنی ہے جس نے ماحول کو زہر آلود اور نفرت انگیز بنایا ہے فتوں کا یہ فراخدلانہ اجراء دراصل مزاج کی تندی طبیعت کی انتہا پسندی اور شخصیت کی شدت کو ظاہر کرتا ہے جب کہ عوامی واجتماعی امور میں تندی نہیں نرمی، انتہا پسندی نہیں معتدل مزاجی اور شدت نہیں مفاہمت کی ضرورت ہوتی ہے، علماء کے اس طرز عمل نے ان کے اور عوام کے درمیان پہلے سے موجود اجنبیت کی دیوار کو اونچا کر دیا ہے اس لئے کہ قائدانہ منصب پر فائز لوگوں کے صرف حسن کردار پر ہی نہیں طرز گفتار پر بھی عوام کی نظر رہتی ہے۔ ویسے بھی یہ عمومی عادت ہے کہ خوبیوں کو اجالنے کا رواج کم اور خامیوں کو اچھالنے کا زیادہ ہے۔ فتوی بازی بہر حال ایک خامی ہے اور لوگوں نے اس خامی کو علماء کے خلاف حربے کے طور پر استعمال کیا ہے اور یہ موقع گستاخی معاف خود علماء نے فراہم کیا ہے۔

فروعات میں غیر معمولی انہماک

علماء کرام کے عمومی اور اجتماعی کردار سکڑ جانے کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا ایک سبب یہ بھی سامنے آتا ہے کہ علماء نے فروعات میں غیر معمولی انہماک کا مظاہرہ کیا ہے۔ فروعات کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے لیکن جتنی فروعات کی ہونی چاہیے انہیں سیاسیات کا درجہ دینا اور توجہات کا مرکز بنانا دینی واجتماعی مصالح کے خلاف ہے۔

ایک صحت منداور بیمار آدمی کی خوراک جس طرح مختلف ہوتی ہے اوران کا غذائی چارٹ صحت اور مرض کے حوالے سے تیار ہوتا ہے اس طرح دینی معاملے میں معاشرتی ضرورت اور عصری شعور کو سامنے رکھ کر یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ اس وقت کرنے والا کون سا کام ہے؟ صلاحیتوں کا خراج کون سا میدان مانگ رہا ہے اور لوگ کس موڑ پر کھڑے رہنمائی کے طالب ہیں؟ ذہن پر زیادہ زور دیئے بغیر بھی یہ حقائق سامنے آجاتے ہیں کہ اس وقت پوری دنیا مغربی تہذیب کی چکا چوند سے چندھیائی ہوئی ہے مادیت کا طلسم طاری ہے بے یقینی اپنی آخری حدوں کو چھو رہی ہے آخرت کا تصور دھندلا رہا ہے مذہب کا وجود لوگوں کے لئے بارگراں بن رہا ہے دنیا بھر میں مجموعی طور پر نظام حکومت نفس پرست لوگوں کے ہاتھوں یرغمال بن چکا ہے۔ سیاست جلب منفعت اور حصول قوت کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔ معیشت کا ایک ایک ریشہ سود اور استحصال

کے نظام میں الجھا ہوا ہے۔ بنیادی انسانی اخلاق قصہ پارینہ کے درجے میں پہنچ رہے ہیں بر و بحر کے ہر کنارے تک فساد پھیل چکا ہے اور نئی نسل ایک نیا اور منفی جنم لے رہی ہے۔ حالات اگر یہ ہیں اور حقائق اس قدر تلخ ہیں تو ہر عالم دین کو اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ سوچنا چاہیے۔ کہ اس وقت نور و بشر کا مسئلہ اٹھانے کی کتنی ضرورت ہے؟ اور اس موضوع پر داد سخن دینے، زور تحریر دکھانے اور مناظروں کا میدان سجانے کی کس قدر افادیت ہے؟ جب کہ صورت احوال یہ ہے کہ لوگ خود ذات رسول ؐ سے رہنمائی لینے کے بجائے مختلف نظاموں، فکر کے خود ساختہ سرچشموں اور نفس کے وسوسوں سے رہنمائی حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

اس وقت رفع الیدین اور آمین بالجہر ثابت کرنے کے لئے لٹریچر کی بھرمار آخر کون سی بنیادی ضرورت پوری کر رہی ہے جب کہ مسجدیں نمازیوں سے خالی اور صفیں الٹتی جا رہی ہیں ایک بار مسجدیں نمازیوں سے بھر لینے دیں بعد میں دل کی بھڑاس نکال لیجئے۔

اس طرح علم اور تعزیہ کو ضروریات دین میں شامل کرنے اور اس کی دن رات تبلیغ کرنے اور اس کے لئے ہمہ وقت سر بکف رہنے سے امت کا کیا بھلا ہو رہا ہے؟ جب کہ آج دنیا میں خود مذہب کا علم سرنگوں اور اہل مذہب کا بھرم زبوں ہو رہا ہے یہی حال دیگر فقہی جزئیات میں بے پناہ دلچسپی اور شغف کا ہے جین اور جوگر کلچر عروج پر ہے اور علماء کرام ابھی تک شلوار کے پائنچے اور تہبند کے کنارے ناپنے پر تلے ہوئے ہیں ہالی وڈ کی تہذیب اپنی انتہاء پر ہے اور علماء کرام چہرے اور ہاتھ کے پردے کے جواز اور عدم جواز پر سینکڑوں صفحات خرچ کر رہے ہیں تہذیب مغرب میں خدا اور رسول ﷺ کا نام لینا جرم ہو رہا ہے اور علماء کرام عمامے اور دستار کے پیچ و خم درست کرنے میں لگے ہوئے ہیں یورپ اپنے ثقافتی طائفے لے کر اسلامی تہذیب پر ٹوٹ پڑ رہا ہے اور یہاں

علماء متعہ اور حلالہ کی بحث سے فارغ نہیں ہو رہے کوے کی حلت وحرمت اور گھوڑے کی قربانی پر ''بیش قیمت اور تحقیقی لٹریچر'' مرتب فرمارہے ہیں یہ ٹھیک وہی بحثیں ہیں اور فروعات میں انہماک کا وہی عالم ہے جو کبھی سپین میں عیسائی حلقوں میں مباحث اور گرمی گفتار کا تھا۔

وہاں بھی یہی ہو رہا تھا کہ بتایئے سوئی کی نوک پر کتنے ہزار فرشتے بیٹھ سکتے ہیں ؟اور حضرت عیسیٰؑ پر آسمان سے جو روٹی اترتی تھی وہ خمیری تھی یا فطیری سقوط بغداد کے وقت بھی اسی نوع کے موضوعات زیر بحث تھے ظاہر ہے موضوعات یہ ہوں گے تو حادثات بھی اسی طرح کے رونما ہوں گے جس طرح تاریخ میں ہو چکے ہیں، درخت کی جڑ پر تیشہ رکھا ہوا نظر آرہا ہے تو پتوں کی تراش خراش ثانوی چیز ہو جاتی ہے، باغبان برق وشرر سے ملے ہوئے دکھائی دے رہے ہوں تو آشیانے کی فکر کرنا دانائی نہیں پورے گلستان کے بچاؤ کی تدبیر ڈھونڈھنا عین حکمت اور تقاضائے اخلاص ہے جہاں زندہ لوگ بات سننے پر آمادہ نہ ہوں وہاں سماع موتیٰ کی بحث کا کیا حاصل؟ اور جہاں دل ٹوٹے ہوئے ہوں وہاں ٹخنے جوڑنے پر زور دینے کا کیا مطلب؟

جنزل انصاری کی پیش کش

ان دونوں احتساب کا سیلاب عروج اور موسم جوبن پر ہے بعض با اثر جرنیلوں اور اعلی حکومتی عہدیداروں کی خواہش کے برعکس مگر عوام کی آرزو کے عین مطابق حکومتی ایجنڈے میں احتساب سرفہرست آچکا ہے، جب کہ ماضی کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ایوب خان سے لیکر ضیاء الحق تک احتساب کی بات محض ڈراوے تک رہی تاکہ ہر سیاسی لیڈر سمٹا اور سہارے مگر اس بار صورتحال ذرا مختلف ہے اگرچہ یہ گلہ اپنی جگہ موجود ہے کہ حکمران ان کیسوں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں جو ان کے لئے مفید مطلب ہوتے ہیں جیسے موجودہ طیارہ اور ہیلی کاپٹر کیس ہے حالانکہ وہ معاملات زیادہ اہم ہونے چاہئیں جن کا تعلق عوامی مفاد سے ہے سابقہ حکومتوں کے دور میں تفتیش چھان پھٹک اور تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا لیکن تمام راز فائلوں کے سینوں میں بند رہے اور مقصد واضح ہے کہ انہیں بوقت ضرورت استعمال کیا جائے گا اور ضرورت نہ پڑی تو اس ساری کدو کاوش کی کوئی اہمیت نہیں اب بھی شاید ایسا ہو رہا ہو لیکن جنزل ایم ایچ انصاری نے ایل ڈی اے پلاٹوں کے حوالے سے جو ۳۴ ریفرنس نیب کو بھیج رکھے ہیں ان پر فوری ایکشن ہونا چاہیے اس لئے کہ ان کیسوں کی تحقیقات کے بارے میں جنزل انصاری اس قدر مطمئن ہیں کہ انہوں نے پریس کے ذریعے حکومت کو کھلے عام پیش کش کی ہے کہ ان میں ایک بھی کیس جعلی، بوگس، ادھورا یا انتقامی و الزامی نوعیت کا ہو تو وہ ملزم کی جگہ سزا

بھگتنے کو تیار ہیں جنرل صاحب کی شخصیت کے حوالے سے شائد ہی کسی کو کوئی شبہ ہو کہ وہ کوئی روائتی سیاسی مخالفت یا ذاتی مہم جوئی کا مزاج رکھتے ہیں انہوں نے ایک عرصے سے اس معاملہ میں محنت اور عرق ریزی کی ہے وہ کسی معاوضے صلہ و ستائش کی تمنا، سیاسی عزائم، نام کمانے کی خواہش اور کسی کو انتقام کی بھینٹ چڑھانے کے جذبے کے بغیر کی ہے سب لوگ جانتے ہیں کہ انصاری صاحب جرنل ضرور رہے ہیں لیکن ان تمام آلائشوں سے پاک جو ''جرنیلی'' کا لازمہ تصور ہوتی ہیں وہ ایک معزز خاندانی پس منظر رکھنے والے جرنیل ہیں ان کے والد نواب صاحب بہاولپور کے اتالیق تھے مگر جنرل صاحب آج بھی لاہور کی ایک دور دراز آبادی کے ایک کونے پر دس مرلے کے مکان میں رہتے ہیں جب کہ ان کے ایک بیٹے بریگیڈیئر تھے (جو وفات پا چکے ہیں) اور ان کے داماد بھی غالباً حاضر سروس بریگیڈیئر ہیں جنرل صاحب آٹھ سال تک ایل ڈی اے ڈائریکٹر جنرل رہے ہیں اور ایک بار قومی اسمبلی کے ممبر رہ چکے ہیں بایں ہمہ بڑی مشکل سے سفید پوشی کا بھرم رکھے ہوئے ہیں ورنہ ہمارے ہاں تو فوج کا ایک کیپٹن اور ایل ڈی اے کا ایک کلرک سنبھلتا نہیں سنبھالتا، کئی جرنیل زادگان ہمارے درمیان موجود ہیں جن کی دادیاں کپڑے سی کر اپنی اولاد پالتی رہیں اور ان کی وہ اولاد فوج میں افسر بنیں اور آن کے نور چشم ماشاء اللہ کروڑوں اور اربوں میں کھیلتے ہیں یہ ساری باتیں ان ریکارڈ اور کتابوں میں درج ہیں، جنرل انصاری مرغابی کی طرح پانی میں ڈوب کر رہے مگر ان کے پر ابھی تک خشک ہیں اس لئے ان کی شخصیت اور محنت کو دیکھتے ہوئے ان کے ریفرنسوں پر تیز رفتار عملدرآمد ہونا چاہیے۔ جنرل انصاری کا کہنا ہے کہ ایل ڈی اے میں لوٹ مار کا دور ۵۸ء سے ۹۰ء پر محیط ہے۔ وہ اکثر و بیشتر بتاتے نظر آتے ہیں کہ جب وہ ایل ڈی اے کی ڈی جی شپ سے فارغ ہوئے تو اس ادارے کے پاس کروڑوں روپے تھے آج یہ ملازمین کو تنخواہ دینے کے قابل نہیں رہا۔

دراصل ہمارے ہاں ہر دور میں سیاسی مصلحتیں آڑے آتی رہیں ورنہ پورا باغ اجڑنے کی ابتداء ہمیشہ ایک آم توڑنے سے ہوتی ہے اگر اس وقت ہاتھ روک لیا جائے تو ہمیشہ کچھ بچ سکتا ہے مگر کیا کیا جائے کہ حکمرانوں کے اہداف عوام کے مفادات سے مختلف ہوتے ہیں۔

سب سے بڑی خرابی تو یہ ہے کہ صوابدیدی کوٹے اور اختیارات قانون کی کتابوں میں درج ہیں آخر کس لئے؟ صوابدید اور قانون میں آگ اور پانی کی ضد ہے جہاں قانون ہوگا وہاں کوئی صوبدید نہیں ہوتی اور جہاں صوابدید ہوگی وہاں قانون مفلوج رہے گا یہ صوابدیدی اختیارات کے کرشمے ہی تو ہیں کہ گارڈن ٹاؤن گلبرگ اور لب نہر کے انتہائی قیمتی پلاٹ بعض ''بیواؤں'' کو الاٹ کیے گئے کہاں بیوہ اور کہاں گارڈن ٹاؤن کا چار کنال کا پلاٹ؟ مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ بیوہ کسی وزیر کسی بیورو کریٹ اور صنعتکار اور جاگیردار سیاستدان کی والدہ محترمہ ہوتی ہیں، راز کھلا نہ کہ یہ صوابدیدی کوٹہ اور یہ بیوہ کا چلمن اور بہانہ کس لئے ہوتا ہے؟

ہماری پھر بھی اصولی گزارش یہی ہے کہ احتساب کو بعض ''احباب'' تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ ہر معلیٰ القاب اور عالی جناب تک اس کا دائرہ بڑھایا جائے خواہ کوئی سویلین افسر ہو یا فوجی افسر سیاستدان ہو یا صنعتکار تا کہ ہر بار کس طرح یہ عشق بے نتیجہ اور یہ تیر بے ہدف نہ رہے۔ جنرل انصاری جیسے واقف درونِ خانہ اور ثقہ آدمی کی پیش کش کو ترجیحی بنیادوں پر نمٹایا جائے اور اس کی پیش رفت سے عوام کو آگاہ کیا جائے نہ جنرل صاحب کا دعوی معمولی ہے اور نہ ایل ڈی اے کی اندھیر نگری کا معاملہ معمولی۔

استحقاق آزادی

آزادی، فرد اور قوم کا بنیادی حق ہے اور یہ حق محض انسان کا عطا کردہ اور کسی سیاسی وسفارتی معاہدے کا نتیجہ نہیں بلکہ خالقِ کائنات کا دیا ہوا عطیہ ہے، جسے کسی بھی نام پر اور کسی بھی حالت میں نہ معطل کیا جا سکتا ہے اور نہ منسوخ اور سلب، دنیا میں غلامی کی صرف ایک قسم ہے اور وہ یہ کہ انسان اللہ کا بندہ اور غلام ہے اور آقائی و کبریائی کی سزاوار بھی صرف ایک ذات ہے اور وہ ہے...... مالک الملک اللہ کی ذات...... اور بس

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آزری

جب رسول اور نبی تک کو خدا نے یہ استحقاق نہیں بخشا کہ وہ انسانوں کو اپنا...... بندہ...... بنائیں تو کسی دنیوی حاکم، آمر، سلطان، جرنیل اور فرمانروا کو یہ حق کیسے دیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کو اپنا محکوم، غلام اور بندہ بنا لے۔

"کسی بشر کو یہ زیبا نہیں کہ اللہ اسے کتاب، حکومت اور نبوت دے اور پھر وہ لوگوں سے کہے کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جائیں بلکہ تم سب کو ربانی (اللہ والا) بننا چاہیے (آل عمران ۷۹)

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ماں کے پیٹ سے آزاد جنم لینے والے انسان کو اپنی آزادی کے لئے نہ صرف مطالبے کرنے پڑے ہیں بلکہ خاک وخون کے کئی سمندر عبور

کرنے پڑے ہیں مختلف ناموں، عنوانوں، حوالوں اور بہانوں سے انسان کو غلام رکھا اور بنایا گیا یہ ایک طویل مگر تاریک تاریخ ہے۔

آج کل بھی دنیا کے مختلف خطوں میں آزادی کی تحریکیں برپا ہیں، مشرق و مغرب آزادی کے نعروں سے گونج رہے ہیں اور اکیسویں صدی کے طلوع پر بھی کئی قومیں آزادی سے محروم ہیں، یہ بہت بڑا داغ ہے مہذب دنیا کے ماتھے پر، بہت بھاری بوجھ ہے اقدام عالم کے ضمیر پر اور بہت دیرینہ قرض ہے حقوق انسانی کے علمبرداروں کے کھاتے میں اس داغ کو دھونا، اس بوجھ کو اتارنا اور اس قرض کو چکانا پوری انسانی برادری پر اجتماعی فرض ہے قبائلی و جاگیری دور میں تو اس روش کی شائد گنجائش نکلتی ہو مگر صنعتی و جمہوری عہد میں اس رویے کا کیا جواز ہے؟ ایک کشمیر ہی کو لے لیجئے آزادی کے حصول کا وہ کون سا معیار اور استحقاق ہے جس پر کشمیری پورے نہیں اترتے اور وہ اس کے اہل نہیں؟ اگر دنیا چار باتوں کو آزادی کا معیار اور استحقاق تسلیم کرلے تو بھی اہل کشمیر یہ حق پانے کے پوری طرح اہل ہیں۔

ایک یہ کہ جغرافیائی تقاضا کسی قوم کو الگ اور خودمختار قوم بناتا ہے۔

دوسرے یہ کہ مذہبی حوالے سے کوئی قوم اپنا علیحدہ تشخص رکھتی ہو۔

تیسرے یہ کہ سفارتی و سیاسی اعتبار سے اس کا موقف جائز اور قانونی ہو۔

چوتھے یہ کہ وہ اپنی آزادی کے لئے اتنی قربانی دے چکی ہو جتنی آزادی کے لئے ممکن ہوتی ہے۔

یہ چاروں معیار ایسے ہیں جن پر کشمیری پورے اترتے ہیں بھارت کشمیر کے جس حصے پر قابض ہے۔ اس کشمیر کا صرف ایک راستہ بھارت کو ملاتا ہے اور وہ بھی تقسیم ہند کے وقت ایک سازش کے تحت گورداسپور کو بھارت کے علاقے میں شامل کرنے سے نکالا گیا ورنہ اور کوئی فطری و جغرافیائی راستہ نہیں جب کہ پاکستان اور کشمیر کو ملانے

کے لئے گیارہ راستے ہیں۔ اگر دین و مذہب کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو بھی تقسیم ہند کے فارمولے کے مطابق کشمیر پاکستان کا حصہ ہونا چاہیے نہ کہ بھارت کے زیر قبضہ کیوں کہ کشمیر کی اصل اور اکثر آبادی مسلمان ہے، ہندو بعد میں ایک منصوبے کے تحت وہاں لائے اور بسائے گئے تا کہ آبادی کا یکطرفہ توازن متاثر کیا جا سکے اہل کشمیر کی اکثریت مسلمان ہے اور وہ مسلمان کے طور پر رہنا چاہتی ہے۔

کشمیریوں کے حق خود ارادیت کے لئے سفارتی و سیاسی جواز اس قدر کھلا، مسلمہ اور نا قابل تردید ہے کہ اس پر اظہار خیال اور بحث تحصیلِ حاصل بلکہ قدرے لا یعنی ہے اور وہ یوں کہ بھارتی وزیر اعظم پنڈت نہرو کی درخواست پر کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ میں لایا گیا اور کشمیریوں کو استصواب رائے شماری کا حق دیا گیا اور گذشتہ پچاس سالوں میں یو این او کے تمام سالانہ اجلاسوں میں یہ ایشو ایجنڈے پر رہا اور بجز بھارت کے کوئی دوسرا ملک خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم اس قرارداد سے انکاری اور منحرف نہیں۔

اسی طرح جانی و مالی قربانیوں کو دنیا اگر کوئی اہمیت دیتی اور اس کا تقدس سمجھتی ہے تو جریدہ تاریخ پر اہل کشمیر کی قربانیوں کے انمٹ نقوش ثبت ہیں کوئی خنجر کی نوک سے انہیں کھرچنا بھی چاہیے تو نہیں مٹا سکتی اور اگر زبان خنجر کسی دباؤ اور مصلحت کے تحت خاموش بھی رہے تو آستین کا لہو پکار پکار کر اس داستانِ ایثار و وفا اور اس سانحہ کرب و بلا کو پوری مجاہدانہ آن اور خطیبانہ شان کے ساتھ بیان کر رہا ہے اگر دنیا اس کے علاوہ بھی کوئی میرٹ اور معیار طے کر سکتی ہے تو کر لے، اس امتحان سے بھی کشمیری سرخرو ہو کر نکلیں گے۔ تین نسلوں کی تحریک اور نصف صدی کی جدوجہد کو "میں نہ مانوں " کے ایک لغو جملے کی سان پر نہیں چڑھایا جا سکتا۔

سب سے آسان اور عملی مشاہدہ یہ ہے کہ اقوام متحدہ خود اپنے زیر اہتمام بھارت اور پاکستان کے سربراہوں کا سرینگر اور مقبوضہ کشمیر کے ہر کونے میں دورہ

ترتیب دے اور پاکستان میں تمام تر سیاسی اختلاف کے باوجود پاکستان کے سربراہ میاں نواز شریف ہوں ، بے نظیر بھٹو ہوں یا جنرل پرویز مشرف ہوں یہ لوگ وہاں جائیں اور دوسرے موقع پر اندرا گاندھی زندہ ہوتیں تو وہ گجرال ہوں، نرسیماراؤ ہوں، راجیو گاندھی یا مسٹر واجپائی وہ کشمیر میں داخل ہوں ۔ اہل کشمیر کا استقبال اور رد عمل کا انداز بتادے گا کہ کشمیری کیا کیا چاہتے ہیں؟ آج بھارتی وزیر اعظیم سرینگر آتے ہیں تو پہلے ہر شہر کی گلیاں سنجیاں (ویران) کی جاتی ہیں تب جا کر ''مرزا یار'' دورہ کرتا ہے کیا یہی ایک بات دنیا کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی نہیں؟ بھارت کہتا ہے کہ پاکستان نے بھی تو کشمیر کے ایک علاقے پر قبضہ کر رکھا ہے چلو ہم یہ بات بھی مان لیتے ہیں کہ اقوام متحدہ دونوں ممالک کے سربراہوں کا مظفر آباد کا دورہ طے کرے وہاں کا تجربہ بھی سری نگر کے تجربے سے مختلف نہیں لگا مسئلہ کشمیر کے بارے مین پاکستانی حکمرانوں کے رویے میں اتار چڑھاؤ آتا رہا لیکن جہاں تک مقبوضہ کشمیر کے عوام کا تعلق ہے وہ پاکستان کے حوالے سے اٹوٹ ہے۔

تمام تر ظالمانہ رویوں، سوتیلے سلوک، جانبدارانہ فیصلوں، مجرمانہ چشم پوشی اور بہیمانہ طرز عمل کے باوجود جس طرح اگلی صبح سورج کے طلوع ہونے اور مشرق کے ابھرنے کا عمل یقینی ہے اسی طرح کشمیر کی آزادی لوح وقت پر جلی حروف میں تحریر ہے اس لئے کہ جو قوم مرنے کے لئے تیار ہو جائے وہ آزادی اور زندگی کی پوری طرح حقدار بن جاتی ہے۔ جس قوم کا دادا، بیٹا اور پوتا بیک وقت مورچہ زن ہو وہ کبھی جنگ نہیں ہارتی اور جو قوم خون میں نہانا سیکھ لے اس کی آزادی پر زیادہ دیر تک شبخون نہیں مارا جا سکتا۔

یہ چشم عالم کا مشاہدہ، مورخ وقت کا تجزیہ، تاریخ انسانی کا تجربہ اور کاتب تقدیر کا فیصلہ ہے۔

کشمیر میں چلنے والی تحریک آزادی اب ایسے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے کہ آہن و فولاد میں لپٹے فوجیوں کا حوصلہ تو پست ہو چکا ہے مگر باریک اور بوسیدہ آنچل میں ڈھکی کشمیری عورتوں کا جذبہ بڑھ رہا ہے

اپنے خون کے غسل سے کتنی نکھر جاتی ہے موت
موت کا ڈر ختم ہو جائے تو مر جاتی ہے موت

زندگی ناموس آزادی کا صدقہ ہوتی ہے جو قوم یہ صدقہ اتارنا سیکھ لے وہ امر ہو جایا کرتی ہے اس وقت جبینِ کشمیر شکن آلود ہے اس کی آنکھیں غضب افروز ہیں اور اس کا دل موج زن ہے یہ شکن بھارتی ظلم کے بل نکال دے گی یہ غضب قلعہ غرور ڈھا دے گا اور موج آزادی بھارت کا سارا پندار بہا لے جائے گی شائد آج یا زیادہ سے زیادہ کل

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیئے میں جان ہو گی وہ دیا رہ جائے گا

ایک خوش آئند فیصلہ اور چند تجاویز

۵ جون کو وزارت مذہبی امور کی دعوت پر ایک مشاورتی اجلاس میں شرکت کے لئے اسلام آباد گیا، اس اجلاس میں بیس کے قریب علماء اور دانشور شریک ہوئے ڈاکٹر عبدالمالک کانسی وزیر مذہبی امور کی صدارت میں ہونے والے اس اجلاس میں ڈاکٹر محمود احمد غازی ممبر نیشنل سیکورٹی کونسل بطور خاص شریک ہوئے اور اپنی عالمانہ اور پر مغز گفتگو کے ذریعے مختلف مسائل کا تجزیہ پیش کیا، اس اجلاس میں جہاں اور بہت سے امور زیر بحث آئے راقم الحروف نے ڈاکٹر کانسی اور ڈاکٹر غازی کی توجہ بطور خاص "بیجنگ پلس فائیو کانفرنس" کی طرف دلائی جس میں پاکستان بھی شریک ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے اس کانفرنس کے ایجنڈے سے صرف ان افراد یا اقدام کو اتفاق ہو سکتا ہے جو پوری انسانی تاریخ اور تہذیب کو ایک مخصوص زاویے سے دیکھتے ہیں ورنہ مسلمہ سماجی و اخلاقی اقدار سے معمولی سی دلچسپی ظاہر کرنے والے لوگ اس پروگرام کو "شیطانی پروگرام" کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دے سکتے۔ اگر یہ کانفرنس اپنی سفارشات کو متفقہ طور پر منوانے میں کامیاب ہو گئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اب دنیا خیر و شر کی تمیز سے عاری، جائز و ناجائز کے فرق سے محروم اور حرام و حلال کے تمام ضابطوں سے باغی ہو گئی ہے۔ انسان اور حیوان کے درمیان کچھ فرق ہے تو خیر و شر کے شعور کا ہے کچھ اخلاقی اقدار کا ہے، کچھ سماجی پابندیوں کا ہے کچھ رشتوں کے تقدس کا ہے اور کچھ

رویوں کے تعین کا ہے اگر ان میں سے کچھ بھی باقی نہ بچے تو پھر انسانی معاشرے اور حیوانی باڑے میں کوئی حدِ فاصل نہیں رہ جاتی اس امر کی طرف توجہ دلانے پر ایک خوشگوار تاثر سامنے آیا اور غازی صاحب نے بھرپور تفصیلات سے آراستہ اپنے جواب میں بتلایا کہ بحمد للہ حکومت پاکستان اس باب میں بہت مستعد اور بیدار ہے، چنانچہ پاکستان وفد کی قیادت کے لیئے وزیر تعلیم محترمہ زبیدہ جلال کو منتخب کیا گیا ہے جو مشرقی وضع کی ایک باوقار خاتون ہیں۔ وزارت خارجہ نے تمام اسلامی ممالک اور او آئی سی سیکرٹریٹ کو ایک سرکاری مراسلے کے ذریعے اس کانفرنس کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس معاملے میں اسلامی بلاک کو ایک متفقہ اور عمدہ موقف اختیار کرنے کی ضرورت کا اظہار کیا ہے اسی پر موقوف نہیں بلکہ صدر پاکستان جو بذات خود اپنی وضع قطع رکھنے والے اور مذہبی اقدار کی حامل شخصیت ہیں انہوں نے سرکاری اور ذاتی دونوں حیثیتوں میں اسلامی ممالک کے سربراہاں مملکت اقدام متحدہ کو اپنے احساسات اور تحفظات سے آگاہ کریں اور کھل کر کہیں کہ وہ کانفرنس کی ان سفارشات کی منظوری میں ہرگز شریک اور حصہ دار نہیں ہوں گے جو اسلامی احکام اقدار اور اصولوں سے متصادم ہیں اور تمام نکات سے اظہار برات کریں جو سماجی اعتبار سے اخلاق باختہ اور اباحیت پسندانہ ہیں جو پورے مشرقی اور اسلامی معاشرتی نظام کی جڑوں پر تیسہ چلانے کے مترادف ہے۔ یہ عزم اور فیصلہ بہر حال خوش آئند اور حوصلہ افزا ہے اور حکومت پاکستان کو اس بارے میں مزید سرگرمی کے ساتھ اپنا نقطہ نظر ہر فورم پر پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تا کہ ابلیسی تہذیب کے غلبے کی سازش نا کام بنائی جا سکے بیجنگ پلس فائیو کے حوالے سے رابطہ عالم اسلامی بھی متحرک ہے اور اس کے سیکرٹری ڈاکٹر عبد اللہ بن صالح عبید نے بھی ایک زور دار اور نہایت جاندار خط اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان کو بھی لکھا ہے جس میں شق وار ان نکات کی نشاندہی کی گئی ہے

جو صریحاً اسلامی احکام اور مسلمہ انسانی اقدار کے منافی ہیں۔

اگرچہ حکومت پاکستان نے سرکاری سطح پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے اور یہ بات قابل تحسین ہے لیکن میرے نزدیک مزید اقدامات بھی ضروری ہیں۔

۱۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ ٹی وی اور ریڈیو پر ایسے مذاکروں کا اہتمام کرے جن میں سنجیدہ متوازن فکر اور جدید رجحانات سے آگاہ علماء اور دانشور عوام کو بتائیں کہ عورت کے بارے میں اسلام اور مغرب کے نقطہ نظر اور زاویہ فکر میں کیا جوہری فرق ہے؟ تاکہ مغرب کے اس پراپیگنڈہ کا ازالہ ہو کہ اسلام عورت کو مجبور اور محصور دیکھنا چاہتا ہے اور مغرب اس کے تشخص اور حقوق کا نگہبان ہے۔

۲۔ حکومت ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے کانفرنس کی دستاویز اور اس کی اہم شقوں کی تشہیر کا اہتمام کرے اور بتائے کہ یہ شقیں کسی بھی صورت میں اسلام، اخلاق اور عورت کے وقار سے کوئی میل نہیں کھاتیں، اس لئے عورت کو کسی فریب میں نہیں آنا چاہیے۔

۳۔ حکومت پاکستان کو صرف رسمی اور تحریری احتجاج و اختلاف پر قناعت نہیں کرنی چاہیے بلکہ اس سلسلے میں ایران، سعودی عرب، سوڈان، لیبیا، کویت، بنگلہ دیش وغیرہ اسلامی ممالک کے ساتھ گہرا ربط پیدا کر کے اپنی آواز بلند کرنی چاہیے نیز پاپائے روم، ہندوؤں کے پیشوا، بدھ مت کے روحانی رہنما اور یہودی علماء سے بھی رابطہ کر کے اپنی کوششوں کو مربوط بنانا چاہیے کیونکہ یہ سفارشات دنیا کے کسی مذہب کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ پوپ پال نے تو قاہرہ کانفرنس کے موقع پر ایک سخت بیان جاری کیا تھا اور اب بھی وہ ان سفارشات کے مخالف ہیں اس سے احتجاج وسیع تر اور موثر بن سکتا ہے۔

اونٹ، بیل، دُنبہ اور امریکہ

زندگی کے انتہائی عمیق حقائق کو تمثیل کے انداز میں پیش کرنے کی عالمی شہرت رکھنے والے مولانا رومؒ نے اپنی شہرہ آفاق مثنوی میں ایک حکایت درج کی ہے کہ

"ایک بار اونٹ، بیل اور دنبہ ہمسفر تھے راستے میں کہیں رکے تو کسی نے ترس کھا کر مٹھی بھر گھاس انہیں کھانے کو دی، گھاس ملنے پر تینوں خوش تو ہوئے مگر ساتھ ہی سوچنے لگے کہ اگر یہ تینوں برابر تقسیم ہوئی تو کسی کا ناشتہ تو کیا ایک داڑھ گرم کرنے کا سامان بھی نہیں ہوگا، کیوں نہ ایسی ترکیب نکالی جائے کہ گھاس کسی ایک کے حصہ میں آئے تاکہ کسی ایک کی بھوک تو رفع ہو، چنانچہ تینوں نے مل کر طے کیا کہ ہر ایک اپنی اپنی فضیلت بیان کرے جو زیادہ صاحب فضیلت ہو ساری گھاس اسے دے دی جائے چنانچہ سب سے پہلے دنبے سے پوچھا گیا کہ بتاؤ تمہاری خوبی کیا ہے؟ دنبے نے جواباً کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بدلے قربانی کے لئے جو دنبہ جنت سے بھیجا تھا میں اس کی اولاد میں سے ہوں اور اس وقت روئے زمین پر اس دنبے کے خاندان کی واحد یادگار اور نشانی صرف میں ہوں اس لئے گھاس پر میرا حق بنتا ہے۔

فضیلت ثابت کرنے کے ضمن میں اسی طرح کا سوال بیل سے کیا گیا تو اس نے بتایا جب حق تعالیٰ نے حضرت آدم کو زمین پر اتارا اور انہوں نے کھیتی باڑی شروع کی تو بیلوں کی جس جوڑی سے انہوں نے ہل چلائے میں اسی جوڑی کے ایک بیل کی نسل سے ہوں اسی طرح مجھے یہ خاندانی فخر اور نسلی شرف حاصل ہے اس اعتبار سے

میں گھاس کا زیادہ حق دار بنتا ہوں اب اونٹ کی باری آئی ظاہر بات ہے اونٹ میں کیا امتیازی صفت ہو سکتی ہے اس کی تو کوئی کل ہی سیدھی نہیں ہوتی، اپنی بزرگی اور فضیلت کے لئے وہ کیا دلیل لا سکتا تھا اس نے جھٹ سے گھاس منہ میں رکھی اور گردن کو بہت اونچا لے جا کر کہا میرے پاس کہنے کو تو کچھ نہیں البتہ یہ کچھ میں کر سکتا تھا سو کر لیا اب جس میں ہمت ہے وہ مجھ سے گھاس چھین لے ورنہ میں ہی اس کا واحد مستحق ہوں، بھلا اونٹ کے قد اور اس کی لمبی گردن کے مقابلے میں بیل اور دُنبہ گھاس چھیننے کی کیا تدبیر کر سکتے تھے ناچار وہ دونوں بے بسی سے خاموش ہو کر رہ گئے۔

یہ حکایت موجودہ عالمی منظر نامے میں امریکہ کے رول کو دیکھ کر یاد آئی کہ امریکہ جب بھی اپنی بڑائی جتاتا ہے کسی دلیل اور فضیلت کی بنیاد پر نہیں بلکہ اپنے اونچے فوجی قد اور لمبی معاشی گردن کے باعث ہر جگہ ہر ایک کا حصہ ہڑپ کر لیتا ہے اور پھر ساری دنیا سے مطالبہ کرتا ہے کہ مجھے بلا شرکت غیرے ہر تنازعے میں ثالث ہر معاملے میں قاضی اور ہر مسئلے میں لیڈر تسلیم کر لیا جائے حالانکہ ثالث وہ ہوتا ہے جو غیر جانبدار اور فریقین کے لئے غیر متنازعہ ہو قاضی وہ ہوتا ہے جو دلیل اور شہادت پر اپنے فیصلوں کی بنیاد رکھے اور لیڈر کی خصوصیات میں بلند نظری خوئے دلنوازی اور جان سوزی شامل ہیں ادھر امریکہ بہادر کا عالم یہ ہے کہ وہ ہر تنازعے میں نہ صرف جانبداری کا اہتمام نہیں کرتا بلکہ خود ہی تنازعہ کھڑا کرنے کا موجب بنتا ہے اور اس میں اپنی مرضی کا اور جانبدارانہ کردار ادا کرنے کا جواز پیدا کرتا ہے اس کی منصفی کا حال یہ ہے کہ ہر نوع کا اور ہر خطے میں بہنے والا خون ناحق اس کی گردن پر ہے وہ ہمیشہ ظالم کی پشت پناہی کرتا اور مظلوم کی گردن کو دباتا ہے رہ گئے اوصاف رہبری تو صورت واقعہ یہ ہے کہ وہ نہ تو بلند نگاہ ہے اور نہ سخن دلنواز کا حامل، البتہ گدھ کی طرح تیز نگاہ ضرور ہے کہ مردار جہاں بھی ہو، وہاں فوراً پہنچ جاتا ہے نیز بات جب بھی کرے گا دلنوازی کی نہیں دل آزاری کی کرے گا دھمکی، بائیکاٹ، اور گھیراؤ یہ اس کی مرغوب اصطلاحات

ہیں حالانکہ امریکہ کو جو آج یک قطبی دنیا میں ایک بہت بڑی طاقت ہونے کا اختصاص و امتیاز حاصل ہے اسے اپنی یہ فیصلہ کن حیثیت عالمی امن کے قیام اور مظلوم اقوام کے سیاسی و معاشی استحکام کے لئے استعمال کرنی چاہیے۔ مگر وہ اپنی طاقت کو اپنی "چوہدراہٹ" منوانے کے لئے بروئے کار لا رہا ہے جو کسی بھی اعتبار سے اس کے منصب سے ہم آہنگ نہیں معاملہ عراق کا ہو یا لیبیا اور افغانستان کا وہ معروضی حقیقتوں اور تقاضوں کی بجائے موضوعی خواہشوں اور منصوبوں کے پیش نظر فیصلہ اور اقدام کرتا ہے جس سے دنیا میں امن کی بہار آنے کی جگہ خوف و ہراس ابھرتا ہے اور ہر قوم کے اندر نفرت کا ایک الاؤ دہک اور آتش فشاں پرورش پا رہا ہے۔ اسرائیل اور بھارت کے بارے میں اس کا دہرا معیار سب کے سامنے ہے، کشمیر کے مسئلے پر اس کی چشم پوشی اور گریز پائی اور کویت کے حوالے سے اس کی تیزی رفتاری آج تک سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔

چیچنیا میں روس کیا کر رہا ہے شہروں کے شہر کھنڈر بن گئے امریکہ اس جانب کانی آنکھ سے بھی دیکھنے کا روادار نہیں آخر دنیا اس قدر آشوب چشم کا شکار تو نہیں ہو گئی کہ وہ کچھ بھی نہ دیکھ رہی ہو، مگر معاملہ دنبے اور بیل والا ہے، یعنی بے بسی اور بے چارگی اس وقت واقعہ یہ ہے کہ ایک طرح کا عالمی بحران جس سے ہر زاویہ زندگی ٹیڑھا ہو کر رہ گیا ہے اور اس بحران کے سرے پر امریکہ دکھائی دیتا ہے جس طرح بیل اور دنبہ اپنے ہمسفر اونٹ کے رویے سے لاجواب اور لاچار ہوئے تھے اس طرح دنیا اپنے "کرمفرما" کے اندازِ قیادت سے نیم جان ہے اور امریکہ کے پاس دلیل صرف ایک ہے کہ اس کی گردن لمبی اور اونچی ہے اگر استدلال کا یہ عالم ہے تو کل کو قدرت اس سے بھی بڑی اور اونچی گردن والی طاقت پیدا کر سکتی ہے۔ ضرورت گردن کی لمبائی سے مرعوب کرنے کی نہیں دلیل کی سچائی سے قائل کرنے کی ہے گردن ماپنا مشکل نہیں سچ کے آگے گردن جھکانا مشکل ہے اور امریکہ اسی مشکل میں گرفتار ہے۔

پروفیسر صاحب! آپ کو اتنی کیا جلدی ہے؟

۱۲ اکتوبر ۹۹ء کے فوجی انقلاب کے بعد ریاست وحکومت کے بہت سے معاملات واقدامات میں عوام کو جس تیزی کی توقع تھی وہ تیزی نظر نہیں آئی، نہ ہضم شدہ رقوم کی اصولی میں نہ احتساب میں اور نہ محکمہ جاتی کارکردگی میں البتہ پانچ حضرات تیز اور چاق وچوبند دکھائی دینے لگے جناب عمران خان، فاروق خاں لغاری، محترم اجمل خٹک، جناب اعجاز الحق اور پروفیسر طاہر القادری لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عمران خان کا لہجہ بدلنے لگا لغاری صاحب کا طنطنہ بھی پہلے والا نہیں رہا، اجمل خٹک کا دریا جتنا چڑھا تھا اتنا ہی اتر چکا ہے اعجاز الحق، وکیل صفائی بنے رہے اب ان کا بھی معاملہ کچھ کچھ کھٹائی میں پڑ گیا ہے ایک ہمارے پروفیسر صاحب ہیں جن کی ون وے ٹریفک زوروں پر ہے اول الذکر چار حضرات کی کیا آرزوئیں تھیں یہ انہیں معلوم ہے یا خدا کو معلوم اور پروفیسر صاحب کا کیا راز ہے؟ یہ بھی صرف انہیں معلوم ہے ہم کسی بھی پہلو سے تبصرہ کرنے کے نہ تو اہل ہیں اور نہ روادار! تاہم ہماری حیرت روز افزوں اور استعجاب برقرار ہے۔

جنرل صاحب کی طرف سے بظاہر نہ تو کوئی سندیسہ ہے نہ نام و پیام اور نہ شوقِ ملاقات مگر بارہ اکتوبر کے اقدام سے لیکر دو روز قبل پیش ہونے والے بجٹ کی حمایت تک پروفیسر صاحب کے ہر بیان ہر تقریر پریس ریلیز اور ہر اعلامیے میں حکومت

کے لئے نیک جذبات اور غیر مشروط تعاون کی جھلک نظر آتی ہے جب کہ حکومت اس باب میں بالکل خاموش ہے نہ ہاں اور نہ ناں غالب کو بھی اس حیریت نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

اس انداز کی حمایت ایک سیاسی مزاج آدمی سے عجیب معنے پیدا کرتی ہے دوسری دو باتیں بھی چونکا دینے کے لئے کافی ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ میرے جیسے آدمی کے لئے بہت ہی اجنبی اور ورطہ حیرت میں ڈالنے والی ہیں۔

ایک عوامی تحریک کے کلچر ونگ کا قیام اور دوسرا پروفیسر صاحب کا روزنامہ "نوائے وقت" میں چھپنے والا ایک بیان، جس میں انہوں نے فرمایا ہے۔

"داڑھی مونچھ کے سوا مذہبی جماعتوں سے ہماری کوئی قدر مشترک نہیں اور دینی جماعتوں میں اسلام کا کوئی تصور نہیں۔"

کلچرل ونگ میں جو لوگ آئے ہیں ان میں معروف اداکار ندیم، فردوس جمال، افضال احمد اور ورسٹائل آرٹسٹ ڈاکٹر انور سجاد شامل ہیں۔

کلچر ونگ کا قیام اور داڑھی مونچھ کے حوالے سے دیا جانے والا بیان دراصل خود کو "لبرل"" "ماڈریٹ" اور"" انلائٹنڈ" ظاہر اور ثابت کرنا ہے، حالانکہ ہمارے خیال میں یہ دونوں باتیں روشن خیال ہونے کی قطعاً دلیل نہیں بلکہ غیر ضروری طور پر اور بہت عجلت میں "پاپولر" بننے کی غمازی کرتی ہیں اور ان بنیادوں پر پاپولر ہونا ایک پڑھے لکھے، سنجیدہ و فہمیدہ اور مصطفوی انقلاب کے علمبردار شخص کے لئے اعزاز نہیں بلکہ توہین ہے پاپولری تو علم و فضل سنجیدگی و متانت تصنیف و تالیف، منہاج القرآن جیسے عالی شان دینی ادارے کے قیام اور اپنی تقریر و تحریر کو قرآن و حدیث کے حوالوں

سے آراستہ کرنے کے بغیر بھی حاصل کی جا سکتی ہے بشرطیکہ کوئی ایسی پاپولریٹی کی قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہو، شہرت ایک رات میں اور ایک اقدام سے بھی مل سکتی ہے مگر ثقاہت و متانت کے لئے برسوں ریاضت کرنی پڑتی ہے۔

عوامی تحریک جس کا نصب العین ملک میں مصطفوی انقلاب برپا کرنا ہے کیا اس انقلاب کے بعد وہی کلچر رائج کیا جائے گا جو دو برسوں سے ٹی وی اور فلم کے ذریعے جناب ندیم، فردوس اور افضال احمد پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ۱۹ جون کے معاصر اخبار میں خیر سے یہ خبر بھی آ گئی کہ کلچر ونگ کے جنرل سیکرٹری فردوس جمال نے فرمایا کہ ۱۰ جولائی کو ''خواجہ غلام فریدؒ'' کے عرس کے موقع پر عوامی تحریک کے زیراہتمام کلچرل شو ہوگا جس میں عابدہ پروین، ثریا خانم وغیرہ اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے اور انہوں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ عابدہ پروین کو کلچرل ونگ کے شعبہ خواتین کا صدر بنایا جائے تاکہ بیک وقت خواتین، سندھ اور موسیقی کی نمائندگی ہو سکے اب ان باتوں پر ایک ایسا شخص کیا تبصرہ کرے جس کے دل میں پروفیسر صاحب کا احترام بھی ہو محبت بھی ہو اور جسے ایک گونہ ذاتی تعلق خاطر بھی ہو آخر پروفیسر صاحب کو اتنی جلدی کیا پڑ گئی ہے؟ جس کا کام اسی کو ساجھے کے مصداق یہ فنکار بس فنکار ہی اچھے لگتے ہیں سیاسی حوالے سے ان کی حیثیت صفر کے برابر ہے یہ عوامی تحریک کے لئے کیا سپورٹ فراہم کریں گے؟ ۱۹۸۵ء کے الیکشن میں قوی خان، جمیل فخری اور عنایت حسین بھٹی نے حصہ لیا اور نتیجہ دیکھ چکے ہیں انہی دنوں ڈرامہ اندھیرا اجالا چل رہا تھا جس کے مرکزی کردار قوی خان اور جمیل فخری تھے اور یہ ڈرامہ دیکھنے کے لئے بازار اور کاروبار سنسان ہو جاتے تھے مگر انہی اداکاروں کے پولنگ بوتھ الیکشن کے روز بھی سنسان نظر آئے۔

اسی طرح پروفیسر صاحب کا دینی افراد اور جماعتوں سے فاصلہ رکھنے، گریز کرنے اور اظہار بیزاری فرمانے سے عام آدمی بھی ان کے قریب نہیں آئے گا نہ پیپلز

پارٹی کا کوئی سپورٹر اور نہ مسلم لیگ کا کوئی ووٹر، انہیں جو بھی حلقہ عقیدت میسر آیا ہے دینی افراد کا میسر آیا ہے۔

وہ اپنی بنیاد سے کیوں کٹنا چاہتے ہیں جب تک پروفیسر صاحب کے سر پر ٹوپی ،منہ پر داڑھی، ہاتھ میں تسبیح اور زبان پر قرآن وحدیث ہے وہ لاکھ "لبرل" بنیں لوگ انہیں "مولوی" ہی سمجھیں گے اسے لوگوں کی کور ذوقی اور "کم فہمی" ہی کہہ لیں امر واقعہ یہ ہے سوال یہ ہے کہ ان کی اگر دینی جماعتوں سے داڑھی مونچھ کے علاوہ کوئی قدر مشترک نہیں تو دوسروں سے کیا قدر مشترک ہے؟ مثلاً پیپلز پارٹی سے کیا قدر مشترک؟ فلمی اداروں سے کیا قدر مشترک ہے فوجی حکمرانوں سے کیا قدر مشترک ہے ؟ عمران خان سے کیا قدر مشترک؟ منظور وٹو سے کیا قدر مشترک ہے؟ ساکنانِ شہر تازہ ہوا کا شوق ضرور پالیں لیکن اس کے لئے گھر میں اتنے دروازے نہ بنا دیں کہ دیوار ہی گر پڑے۔

پروفیسر صاحب ماشاء اللہ جہاندیدہ آدمی ہیں انہیں ہم سے زیادہ معلوم ہے کہ سیاست امکان اور انتظار کا کھیل ہے امکان شکر اور انتظار صبر کا تقاضا کرتا ہے کئی سیاستدانوں کو جتن کرتے عمر گزر گئی مگر صدر اور وزیر اعظم نہ بن سکے۔ یہ انتظار ہے اور تارڑ صاحب گھر بیٹھے صدر بن گئے یہ امکان ہے ان دو کے علاوہ تیسرا راستہ ہمارے خیال میں خسارے کا ہے مٹی پر چلنے والا کم گرتا اور سنگ مرمر پر دوڑنے والا جلد پھسلتا ہے۔

نیا سیاسی نظام؟

آج کل ایک نئے سیاسی نظام کا چرچا اخبارات میں بہت نمایاں ہے چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف وزیر داخلہ جنرل (ر) معین الدین حیدر اور ادارہ قومی تعمیر نو کے سربراہ جنرل (ر) تنویر نقوی بڑے تواتر کے ساتھ نئے سیاسی نظام کا پرچار کر رہے ہیں جنرل پرویز مشرف کا کہنا "ہم نیا نظام لا کر واپس چلے جائیں گے"

جنرل حیدر فرماتے ہیں "ہماری بات مان لیں جمہوریت واپس آجائے گی"

اور جنرل نقوی کا فرمان ہے "جوتا مرمت کے قابل نہیں رہا اسے بدلنا پڑے گا"

اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ نیا سیاسی نظام وقت کی آواز اور فرمانِ امروز ہے جمہوریت کی واپسی یا بحالی بہر حال قوم کی آرزو ہے اور نظام کی یکسر تبدیلی ایک دیرینہ عوامی مطالبہ ہے لیکن اصل سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ مجوزہ سیاسی نظام کیا اور کون سا ہے ؟ ارباب اقتدار کے ذہنوں میں کوئی نقشہ اور خاکہ ہو تو کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے مگر اس کے خدوخال ابھی تک لوگوں کے سامنے نہیں آئے کوئی ناک نقشہ سامنے آئے تو پھر بحث چھڑ لے گی سوالات ابھریں گے حسن و قبح پر بات ہوگئی اور مجوزہ نئے سیاسی نظام کے مردود و قبول کا مرحلہ آئے گا حکومتی زعماء کو چاہیے کہ وہ اپنے نو ماہ کے غور و فکر اور تحقیق و مشاورت کا حاصل عوام کے سامنے رکھیں تا کہ بات آگے بڑھے، تاہم کچھ معروضات اس مرحلے میں بھی پیش کی جا سکتی ہیں کہ گذشتہ مختلف ادوار میں سیاسی

نظام بدلنے کی کوششیں ہوتی رہیں، فیلڈ مارشل ایوب خان اور جنرل ضیاء الحق نے اپنے طور پر عوام کو نیا سیاسی نظام دیا مگر وہ ان کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا کہیں اب کے بھی ایسا نہ ہو" ایبڈو لگا کر بہت سے سیاستدانوں کو سیاسی فیلڈ سے آؤٹ کر کے نئے نظام کے تحت نئے لوگ متعارف کرائے گئے لیکن وہ اگلوں سے بھی نکمے ثابت ہوئے یہاں محدود جمہوریت کا بھی تجربہ ہو چکا ہے مگر کوئی برگ و بار نہیں لا سکا، بنیادی جمہوریت کا ڈنکا بھی بجا مگر سوائے سمع خراشی کے کچھ حاصل نہ ہوا، جنرل ایوب خان اور جنرل ضیاء الحق کے ادوار میں غیر جماعتی انتخابی سیاست بروئے کار لائی گئی لیکن اس کے ذریعے سیاست میں بجائے کسی منشور اور پروگرام کے پیسے اور برادری کو کلیدی حیثیت حاصل ہوئی جس کا خمیازہ قوم آج تک بھگت رہی ہے بھٹو دور میں جو کھلی عوامی اور جماعتی سیاست کا آغاز ہوا تھا اور قوم نسبتاً ذہنی وسیاسی بلوغ کی طرف بڑھی تھی اسے واپس شخصی جاگیری سیاست کی طرف دھکیل دیا گیا اس لئے اب ایسی کوئی کاوش بہرہ منداور ثمر آور نہیں ہو سکے گی ہمارے خیال میں موجودہ حکمرانوں کے سامنے ماضی کی یہ ساری تصویر اور فلم ہو گی اور وہ اسے دہرانے سے گریز کریں گے ممکن ہے سابقہ تجربات بھی اپنے دامن میں کچھ افادیت رکھتے اور قوم اصلاح پذیر ہوتی مگر اصل خرابی یہ ہوئی کہ فیلڈ مارشل ہوں یا مرحوم ضیاء الحق وہ خود سیاسی عزائم اور حکومتی لذائز کا شکار ہو گئے سچ ہے نیت میں فتور آ جائے تو توفیق عمل کافور ہو جاتی ہے ایسی صورت میں انسان کی توجہ اصلاحات پر کم اور مفادات پر زیادہ ہو جاتی ہے۔

اب تک کے آثار و قرائن بتا رہے ہیں کہ جنرل پرویز مشرف اور ان کے رفقاء اقتدار کی توسیع اور فروغ کی دلدل میں نہیں اترنا چاہتے ان کی نظر وقت کے پل سے بہہ جانے والے پانیوں بین الاقوامی پیچیدگیوں، عدالتی سوچ کی کروٹوں اور غیر سیاسی نظام کی سنگینیوں پر ہے اور وہ کوئی ماضی جیسا ایڈونچر کرنے کے موڈ میں نہیں پھر بھی

انہیں اپنا مجوزہ خاکہ جلد از جلد عوام و خواص کے سامنے لانا چاہیے تاکہ کشمکش و پیچ کی فضا کا خاتمہ ہو۔

ہم فنی نکات کے بارے میں تو کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ نئے نظام کی فنی و تکنیکی ساخت کیا اور کیسی ہو؟ یہ ہمارے نزدیک ضمنی و ثانوی چیز ہے البتہ بنیادی اصطلاحات کے حوالے سے کچھ باتیں ذہن میں آتی ہیں خرابی نظام میں نہیں ہوتی بلکہ اکثر و بیشتر افراد میں ہوتی ہے جو کسی نظام کا حصہ بنتے اسے چلاتے اور بے راہرو بناتے ہیں اس لئے بنیادی زور افراد پر رہنا چاہیے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ

☆ ان تمام افراد خاندانوں پر سیاست اور انتخابات میں حصہ لینے پر پابندی عائد کر دی جائے جو ۱۹۴۷ء سے پہلے انگریز کی کسی کونسل اسمبلی اور حکومتی ٹیم کا حصہ رہے ہیں۔

☆ محکمہ مال کا ریکارڈ دیکھ کر ان خاندانوں کو سیاسی و انتخابی طور پر نا اہل قرار دیا جائے جنہیں انگریز نے اپنی مخصوص شخصی وسیاسی خدمات کے عوض جاگیروں اور مناقب سے نوازا۔

☆ ماضی کے ان تمام ارکان اسمبلی کو اس میدان سے خارج کر دیا جائے جنہوں نے فلور کراسنگ کی ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ وہ منتخب تو آزاد یا کسی دوسری پارٹی کے ٹکٹ پر ہوئے ہوں مگر بعد میں سرکاری پارٹی میں شامل ہو گئے ہوں سرکاری پارٹی سے نکل کر اپوزیشن میں بیٹھنے والے اس سے مستثنیٰ رہیں کیوں کہ سرکاری پارٹی میں جانے کا مطلب واضح طور پر نفع اندوزی اور لوٹا کریسی ہے۔

☆ اسمبلی کا ریکارڈ چیک کیا جائے جو ارکان اسمبلی (صوبائی ہوں یا قومی) اپنے پورے دور نمائندگی میں کسی بحث میں شریک نہ ہوئے ہوں اور نہ انہوں نے کبھی قومی و ملی مسئلے پر اظہار خیال کیا ہو محض بھتہ، مراعات اور تنخواہ وصول کرتے اور

ممبری کے نام پر اپنے علاقے کی انتظامیہ پر رعب ڈالتے رہے ہوں ایسے تمام ''گونگے پہلوانوں'' کو فارغ کر دیا جائے۔

☆ ریٹائرڈ جرنیل زادگان، ریٹائرڈ بیوروکریٹس اور ان کے صاحبزادگان سے ہاتھ جوڑ کر رخصت اور نجات حاصل کر لی جائے کیوں کہ وہ دنیا کی نعمتوں سے بہت سا حصہ پا چکے اب اخروی نعمتوں پر دھیان فرمائیں۔

اب آخر میں نئے سیاسی نظام کے حوالے سے یہ گزارش بھی ضروری ہے اور یہ موجودہ حکمرانوں اور سیاستدانوں دونوں سے ہے کہ اگر ملک کو کوئی پائیدار اور مثبت سیاسی نظام دینا ہے تو براہ کرام حکمران کسی سیاستدان اور سیاسی جماعت کو اپنی چھتری مہیا نہ کریں اور سیاستدان خدا کے لئے کسی کی بیساکھی کا سہارا نہ لیں تا کہ جو کچھ ہو میرٹ پر ہو اور میرٹ ہی سیاسی نظام کا سنگ بنیاد ہے۔

"الھٰکُم التّکاثُر"

اگر آنکھ کھول کر پڑھنے، کان دے کر سننے، سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے اور قلبِ سلیم کو حاضر کر کے ماننے کی انسان کو توفیق نصیب ہو تو قرآن مجید سے بڑھ کر کوئی صحیفہ حکمت، مرقعِ عبرت ترجمانِ حقیقت اور ذریعہ نصیحت نہیں، دو لفظوں میں دونوں جہان کے عقدے کھولنے کا کمال کوئی قرآن سے سیکھے، "الھکم التکاثر" یہ ایک مختصر آیت ایک چھوٹا سا جملہ اور دو الفاظ کا مجموعہ ہے، مگر جہاں معنی اس میں پوشیدہ ہے اس آیہ کا مطلب اور مفہوم ہے "تمہیں کثرت کی ہوس نے ہلاک کر دیا"

کیا یہ سچ نہیں کہ روز اول سے دنیا جس اونچ نیچ اور طبقاتی تفریق کا شکار ہے اس کا اصل سبب "کثرت کی ہوس" ہے کیا ظلم واستحصال کی راہ کثرت کی ہوس سے نہیں پھوٹی؟ کیا حق مارنے کا رجحان اس ہوس کثرت کا شاخسانہ نہیں؟ کیا غربت و امارت میں یہ مہیب خلاء کثرت کی ہوس نے پیدا نہیں کر رکھا؟ کیا عالمی جنگوں کے پیچھے کثرت کی ہوس کا جذبہ کارفرما نہیں تھا؟ کیا ہر زوال کا نقطہ آغاز کثرت کی ہوس نہیں بنی؟ کیا ہر حاکم کو آمر اور مطلق العنان بننے کی پٹی اسی کثرت کی ہوس نے نہیں پڑھائی؟ اور کیا اسی کثرت کی ہوس نے ظہر الفساد فی البر والبحر کی کیفیت پیدا نہیں کر رکھی مال کی کثرت، جاہ کی کثرت، طاقت کی کثرت، اختیارات کی کثرت، لذات کی کثرت اور اسی کثرت کی ہوس نے انسان اور معاشرے کو ہلاکت میں ڈال رکھا ہے،

دور کیوں جایئے کل کی بات ہے میاں نواز شریف کے پاس کس چیز کی کمی تھی؟ انہیں دعا گو مشفق اور مہربان ماں باپ میسر تھے، وفا شعار اور تابعدار بھائی موجود تھے مشرقی مزاج بیوی کی رفاقت حاصل تھی گوری رنگت اور اچھی صحت نصیبوں میں تھی دولت کی ریل پیل تھی، قید و بند اور فقر و فاقہ سے کبھی صحبت نہیں رہی سیاست میں آئے تو کوئی دقت پیش نہ آئی اقتدار کی راہداریوں میں پھولوں سے گزر کر داخل ہوئے، زمین اور اس کی سختیاں قدموں میں سمٹتی چلی گئیں، اقتدار کی اگلی سیڑھیوں پر چڑھنے کے لئے پاؤں کو حرکت دینے کی نوبت نہیں آئی زینے خود بخود طے ہوتے گئے عوام سے مقبولیت ملی، قسمت نے یاوری کی گردو پیش نے کھل کر ساتھ دیا اور زندگی خوابوں جیسی خوبصورتی کے ساتھ بسر ہو رہی تھی کہ اچانک ''کثرت کی ہوس'' نے ان کے دل میں انگڑائی لی کہ اب ''ہم چوما دیگرے نیست'' کا نعرہ بلند کر دینا چاہیے اب میاں صاحب ہیں اور ان کا نا آسودہ ارمان۔

کوئی ان سے پوچھے یا وہ خود اپنے آپ سے دریافت کریں کہ آپ کو اور کیا درکار تھا؟ وہ کیوں بھول گئے کہ ان کے بزرگوں کے پاس جاتی امراء میں دو چھوٹی چھوٹی بھٹیاں تھیں اور آج ان کے پاس بائیس بڑی بڑی فیکٹریاں ہیں ان کے بڑوں نے ایک روپیہ یومیہ اجرت پر کام کیا آج ان کے پاس پانچ ارب روپے مالیت کا ۱۸۰۰ ایکٹر پر محیط رائے ونڈ فارم ہے جس میں صرف ان کا بنگلہ پینسٹھ ایکڑ کو گھیرے ہوئے ہے۔ انہیں کیوں یاد نہ رہا کہ وہ کبھی کونسلر بھی نہیں بنے تھے کہ کسی کی نگاہ التفات نے انہیں یک بیک منسٹر بنا دیا، وہ ایک زمانے میں جمعیت علماء پاکستان سے انتخابی ٹکٹ کے امیدوار تھے بعد میں وہی جمعیت ان کی معمولی حصہ دار بننے پر برضا و رغبت آمادہ ہو گئی ایک وقت تھا کہ وہ تحریک استقلال کے اجلاسوں میں بہت پیچھے کی کرسیوں پر بیٹھے اور بڑوں کو حسرت کے ساتھ تکتے تھے مگر بعد کو ائر مارشل اصغر خان

سے ہاتھ ملانا بھی انہیں گوارا نہ تھا وہ کل تک کسی انکم ٹیکس آفیسر کے برآمدے میں انتظار کرتے نظر آتے تھے اور پھر آدھی دنیا کے وزراء اعظم ہوائی اڈوں پر ان کے منتظر پائے گئے صدیوں نہیں چند برسوں کی بات ہے کہ ان کے والد بمشکل چار ہزار روپیہ ماہانہ کما پاتے تھے اور ایک وقت وہ آیا کہ میاں نواز شریف کے ذمے واجب الادا ٹیکس چالیس کروڑ روپے ہو چکا تھا وہ ۸۱ء سے پہلے ایک عام سے شہری تھے محدود اور گمنام لیکن وہ ۹۹ء میں وی آئی پی بن چکے تھے چار دانگ عالم میں معروف و بلند مقام محض اٹھارہ برسوں میں انہوں نے وزارت خزانہ، وزارت علیاء اور وزارت عظمٰی کی تمام منزلیں عبور کر لیں، دو بار وزیر اعلیٰ اور دو ہی بار وزیر اعظم اور کیا درکار تھا؟ لیکن کثرت کی ہوس نے بے چین اور بے خود کئے رکھا اور انجام سب کے سامنے! مسئلہ حکومت کے خاتمے کا نہیں اس طریقے کا ہے جس طرح ختم ہوئی۔

سلطان محمود غزنوی کے وزیر دربار اور چہیتے غلام آیاز کے بارے میں آتا ہے کہ حاسدوں نے بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دیئے کہ ایاز نے اپنے گھر میں کوئی خزانہ چھپا رکھا ہے اور وہ روزانہ چھپ کر صندوق کھولتا اور اس کا جائزہ لیتا ہے، سلطان نے ایک بار وہ صندوق بھرے دربار میں منگوا کر اپنے سامنے کھلوایا تو اس میں سے دو تین میلے کپڑوں کے جوڑے اور ''ایک ٹوٹے جوتے برآمد ہوئے، محمود غزنوی نے ایاز سے یہ چیزیں اس قدر سنبھال کر رکھنے اور ہر روز انہیں دیکھنے کا سبب پوچھا تو دانا غلام نے کہا'' سلطان معظم، میں جب آپ کی نظروں میں آیا تھا تو میرا کل اثاثہ یہی تھا اور آج میں آپ کا معتمد ترین وزیر ہوں انہیں دیکھنے کا مقصد اپنی اوقات یاد رکھنا ہے کاش میاں صاحب کو سرائے سلطان کا چھوٹا سا گھر یاد رہتا، تنہائی کے لمحے تازہ رہتے گمنامی کا دور یادداشتوں میں زندہ رہتا اور ''ایازی وقت'' آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتا۔
معلوم نہیں ہر حکمران اقتدار سنبھالتے ہی فرعون بننے کی کیوں ٹھان لیتا ہے

دولت ہاتھ آتے ہی اسے قارون ہونے کا لپکا کیوں ہو جاتا ہے؟ اور وسائل کی فراہمی پر شداد جیسی جنت بسانے پر کیوں فریفتہ ہو جاتا ہے؟

حیرت ہے بندہ خدا کی ''دیر گیری'' پر تو رتچھتا ہے مگر اس کی ''سخت گیری'' سے کیوں نہیں پسیجتا؟ مہلت ضروری نہیں نعمت ہی ہو وہ خدا کی تدبیر و حکمت بھی ہو سکتی ہے لیکن کثرت کے طالب بصیرت سے عاری ہوتے ہیں، جناب نواز نے سوچا ہوگا، ایک چیف جسٹس ایک صدر اور ایک آرمی چیف نگل چکا ہوں ایک اور لقمہ لینے سے نظام ہضم پر کوئی اثر نہیں پڑے گا انہوں نے شاید ہر عہدے کو ''سری پائے'' سمجھ لیا تھا اور ہر بندہ ان کے لئے ''حلوہ'' تھا۔

موت کی آخری ہچکی کو ذرا غور سے سن
زندگی بھر کا خلاصہ اسی آواز میں ہے

خواہش اور روش میں تضاد

ہمارے جتنے بھی حکمران ہو گزرے ہیں اگر ان کی آنکھوں میں جھانک اور دل میں اتر کر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا نام تاریخ میں زندہ اور بڑوں کی صف میں اپنا قد اونچا دیکھنا چاہتے تھے مگر وہ عشق کا دعویٰ تو جلدی میں کر بیٹھے مزاج عاشقی پیدا نہ کر سکے، اور بڑا بننے کا سودا تو دماغ میں سما بیٹھے لیکن بڑا بننے کا انداز نہ اپنا سکے۔

ہمارے ہر حکمران کی خواہش رہی ہے کہ وہ حضرت ابو بکرؓ کی طرح ...... صدیق ...... مشہور ہوں مگر یہ لوگ نہ سچ بولتے ہیں، نہ سچ سنتے ہیں اور نہ سچ سہتے ہیں۔

ان کی آرزو اہی کہ تاریخ انہیں حضرت عمرؓ کے برابر جگہ دے لیکن انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ حضرت عمرؓ...... فاروق اعظم ...... میزان انصاف کھڑی کر کے بنے تھے اور یہ الٹا قانون پر دونوں ہاتھ صاف کرتے رہے۔

حکمرانوں کا تقاضا رہا کہ انہیں حضرت عثمانؓ کی طرح ...... سخی ...... کا لقب دیا جائے مگر یہ لوگ اپنی جیب سے ایک دمڑی خرچ کرنا تو کجا الٹا ملک کا خزانہ ہڑپ کر گئے انہیں یہ خیال لاحق رہا کہ وہ حضرت علیؓ کی طرح ...... دانش و حکمت کا باب ...... کہلائیں مگر اپنے ہاں صرف بھانڈوں اور جگت بازوں کو جمع کرتے رہے۔

حکمرانوں کی یہ تمنا رہی کہ وہ بھی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی طرح عوام سے ...... خلیفہ راشد ...... کا خطاب حاصل کریں، لیکن اپنا پورا دور حکومت اعلیٰ مقاصد کے

بجائے صرف فروغِ مفاسد کے لئے وقف رکھا تو پھر ایسے حکمرانوں کو عوام اتنے بڑے اعزاز سے کیسے نوازیں؟۔

انہیں یہ خواب ہمیشہ ستاتا رہا کہ وہ ثانی صلاح الدین ایوبیؒ کے طور پر معروف ہوں مگر یہ اہلِ صلیب سے میدانوں میں لڑنے کے بجائے حرم خانوں میں معانقے کرتے رہے۔ ہمارے حکمرانوں کا یہ مخمصہ رہا کہ وہ محمود غزنوی کے جانشین کہلائیں لیکن سومنات کا مندر گرانے کی بجائے اپنی ذات کا بت بنانے میں لگے رہے۔

انہیں یہ ہوس رہی کہ شیر شاہ سوری بن کر دکھائیں لیکن رعایا کو خوش حال رکھنے کے بجائے مال سمیٹنے میں مصروف رہے۔

حکمرانوں پر یہ خبط سوار رہا کہ وہ اکبر اعظم کی جگہ سنبھالیں لیکن وہ یہ بھول گئے کہ اس کے مشیر ابوالفضل اور فیضی تھے جب کہ ان کے درباری محض طبلچی اور مالشی رہے۔

انہیں اس بات کی شدید پیاس رہی کہ وہ جہانگیر کی مانند امر ہو جائیں لیکن زنجیر عدل لگانے کی بجائے مخالفوں کو لٹکانے کا اہتمام کیا اور پوری قوم کو پابہ زنجیر رکھا۔

ہمارے حکمرانوں کا پیمانہ طلب ہر دور میں لبریز رہا کہ وہ بھی اورنگ زیب عالمگیر کے ہم پلہ نظر آئیں لیکن انہیں اورنگ زیب کا ''عالمگیر'' کہلوانا تو یاد رہا اس کا مزاجاً ''فقیر'' ہونا یاد نہ رہا۔

ان کا دل سلطان ٹیپو بننے کو بھی مچلتا رہا جس نے آزادی کی خاطر اپنے بیٹوں کو یرغمال بنادیا لیکن ہمارے حکمرانوں نے پوری قوم کو اپنے دور میں یرغمال بنائے رکھا۔

بڑا بننے کے مخمصے میں تو ہمارا ہر حکمران گرفتار رہا لیکن اس بات پر غور نہ کیا کہ صرف سر منڈوانے سے کوئی قلندر اور چائے پینے سے کوئی ابوالکلام نہیں بن جاتا، حالانکہ قلندری کے لئے دل کا غنی ہونا اور ابوالکلام بننے کے لئے حسن بیان ضروری ہوتا ہے۔

اسی طرح ہمارے حکمرانوں کو افرنگی صوفے تو مرعوب ہیں لیکن وہاں کے

جمہوری رویے ایک آنکھ نہیں بھاتے، امریکہ کے اونچے پلازے تو انہیں مسحور کرتے ہیں وہاں کے احتسابی ادارے متاثر نہیں کرتے، سوئٹزرلینڈ کی گھڑیاں تو ان کے دل کو بھاتی ہیں وہاں کی رفاہی پالیسیاں انہیں ''وارا'' نہیں کھاتیں، فرانس کا پروٹوکول تو انہیں بہت پسند ہے مگر وہاں کا علمی ماحول پسند نہیں، جاپان کی برقی مصنوعات کے تو یہ لوگ شیدائی ہیں لیکن وہاں کی دفتری روایات سے بھاگتے ہیں جرمنی کی پائیدار اور چمکدار گاڑی کی طرف تو لپکتے ہیں لیکن جرمن قوم کے احساس ذمہ داری کے وصف سے بدکتے ہیں اور ہمارے تمام حکمرانوں کو دلی کی نہاری کھانے کا شوق تو رہا ہے لیکن وہاں کی کفائت شعاری کا ذوق اپنے اندر پیدا نہیں کر پائے۔

ویسے میرے نزدیک حکمرانوں کا یہ مخمصہ اور وہم بے سود ہے کہ وہ تاریخ کی لوح پر اپنا نام کندہ نہیں کرا سکے کوئی ریکارڈ قائم نہیں کر سکے اور اپنے پیچھے کوئی یادگار نہیں چھوڑ سکے۔

ہمارے درجن بھر حکمرانوں نے کوئی درجن بھر ریکارڈ قائم کیے ہیں ان کے یاد رکھنے کو اتنا ہی مواد کافی ہے ہمارا ملک نو سال تک ''سرزمین بے آئین'' رہا یہ کارنامہ حکمرانوں کا نہیں تو اور کس کا ہے؟ ابتدائی نو سالوں میں نو حکومتیں بدلیں یہ ''بے بدل'' کارکردگی نہیں تو اور کیا ہے؟۔

۵۶ء میں مشکلوں سے ایک دستور بنا اور بڑی آسانی سے اسے ۵۸ء میں توڑ دیا گیا یہ ریکارڈ توڑنے والی بات نہیں تو اسے کیا عنوان دیا جائے گا؟

فیلڈ مارشل ایوب خان دس سال تک ''لائل پور'' کا نہیں پورے پاکستان کا ''گھنٹہ گھر'' بنے رہے یہ معمولی ہنر ہے؟

یحییٰ خان آدھا پاکستان نگل گیا ایسا ہاضمہ تاریخ میں کس حکمران نے پایا ہے۔

قائد عوام کا پورا دورِ حکومت ''شترِ بے زمام'' اور ''اسپِ بے لگام'' کی مانند

کیا یہ سیاسی تاریخ کا منفرد حوالہ نہیں؟

"مردِ حق جنرل ضیاء الحق نے گیارہ برس تک اسلام اور عوام کو چکمہ دیئے رکھا کیا ایسی ذہانت تاریخ میں بطور امانت محفوظ نہیں رہے گی؟

محترمہ بے نظیر نے ملک کو کرپشن کے اعتبار سے دنیا بھر میں دوسرے نمبر پر پہنچایا کیا یہ غیر معمولی واقعہ اور سر توڑ کوشش کا نتیجہ نہیں تھا؟

اور میاں محمد نواز شریف نے مغل شہزادہ بن کر رنگیلا شاہی دور کا اعادہ کر دیا تاریخ کا پہیہ الٹا گھما دینا ہر ایک کے بس میں کہاں؟ یہ حوصلہ صرف ہمارے حکمرانوں کا ہے۔

آج جنرل صاحب بھی کچھ خواہشوں کے ساتھ موجود ہیں دیکھیں وہ اپنی روشوں سے کیا روایت قائم کرتے ہیں؟ حکمران نئے ہیں لیکن امتحان پرانا ہے۔

شعروں کی زبانی

نثر کے حُسن اور تاثیر میں کوئی کلام نہیں مگر شعر میں جو ابلاغ ہوتا ہے اس کی اپنی ہی بات ہے، صدیوں کو لمحوں میں سمیٹنا نثر سے نہیں شعر سے ممکن ہے، حُسن تخیل، حسنِ اسلوب اور حسن بیان یہ تینوں خوبیاں بیک وقت شعر میں پائی جاتی ہیں، اور اس طرح سرِّ دلبراں کو حدیث دیگراں میں واضح کرنا بھی شعر کی ایک خوبی ہے جب کوئی حقیقت شعر کے ذریعے منکشف ہوتی ہے یا کوئی بات شعر کے اسلوب میں سامنے آتی ہے تو ہر ایک پکار اٹھتا ہے بس یہی کچھ میں کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں پایا، نثر سے افکار روشنی پاتے اور شعر سے جذبات آسودگی کشید کرتے ہیں بیٹھے بٹھائے میرا دھیان بعض سیاسی وملی شخصیات کی طرف منتقل ہو گیا کچھ زمانہ ماضی کی اور کچھ عہد حاضر کی، جس شخصیت کا پیکر نگاہ تصور کے سامنے آتا تو کوئی نہ کوئی شعر لوح ذہن پر ابھر آتا اور یہ اشعار بہت حسب حال نظر آئے۔

میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا قارئین خود اس شخص کے بارے میں غور کرتے جائیں اور شعر پڑھتے جائیں ایک ایک شعر پوری سوانح حیات کو واضح کرتا چلا جاتا ہے۔

☆ قائداعظم محمد علی جناحؒ

کوئی تصویر نہ ابھری تیری تصویر کے بعد
ذہن خالی رہا کاسہ سائل کی طرح

بعد میں آنے والے سیاسی بازیگراں کے حالات سے قوم پوری طرح آگاہ ہے اس پس منظر میں قائداعظمؒ کو دیکھا جائے۔

☆ مولانا مودودی

قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

مولاناؒ کے بعد آنے والے مفکرین اور دانشوروں کی تصویر ذہن میں رکھ لیجئے

☆ ابوالکلام آزادؒ

کبھی کبھی تو اُسی مشتِ خاک کے گرد
طواف کرتے ہوئے ہفت آسماں گزرے

ابوالکلامؒ کی عبقریت، حسن انشاء، عظمتِ کردار، ادائے بے نیازی اور شانِ قلندرانہ کیوں نہ اس خراج کی مستحق ٹھہرے؟

عبدالرّب نشتر

جب ساتھ چل سکے نہ حریفانِ سست گام
ہم لوگ قافلے سے نکلوا دیئے گئے

پچاس کے عشرے کی سیاسی سازشیں، حکومتی جوڑ توڑ اور حریص لوگوں کے اطوار پوری قوم کے سامنے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو

تو قد و قامت سے شخصیت کا اندازہ نہ کر
جتنے اونچے پیڑ تھے، اتنا گھنا سایہ نہ تھا

بھٹو صاحب کے نعرے، عوام کی توقعات اور نتیجہ؟ تفصیل میں جانے اور گڑے مردے اُکھاڑنے کی ضرورت نہیں۔

☆ نواب زادہ نصر اللہ خان

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

نواب زادہ صاحب کا ہر دور میں تحریک برپا کئے رکھنا، اتحاد بنانا اور توڑنا اور ہر دور میں اپنے حلیف وحریف بدلنا لہو گرم رکھنے کا ذریعہ رہا۔

خان عبدالولی خان

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

پچاس سالہ سیاست میں نہ دوقومی نظریہ راس آیا نہ نظریہ پاکستان سمجھ آیا اور نہ قیام پاکستان کا زخم بھلایا۔

☆ مولانا شاہ احمد نورانیؒ

ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومت عشق
سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں

مولانا سیاسی اعتبار سے ہمیشہ جمہوری موقف پر قائم رہے اور دائیں بائیں لڑھکنے سے محفوظ، اور ظاہر ہے یہ چلن رائج نہیں ہوسکا۔

☆ مولانا عبدالستار خان نیازی

ماجرا برہنہ پائی کا ہمارے مجنوں
خار سے پوچھ کہ سب نوک زباں ہے اس کو

ساٹھ سال کی سیاسی دشت پیمائی اور آبلہ پائی کوئی معمولی بات نہیں اس عرصے میں کیا کیا حشر نہیں اٹھے۔

☆ قاضی حسین احمد

مفاہمت نہ سکھا جبرِ ناروا سے مجھے
میں سر بکف ہوں لڑا دے کسی بلا سے مجھے

موجودہ سیاسی عہد کی سب سے زیادہ فعال، متحرک اور سخت جان شخصیت کی پوری کہانی اور آئندہ عزائم اس ایک شعر میں سمٹ گئے ہیں۔

☆ ائیر مارشل اصغر خان

تنہا کھڑا ہوں میں بھی سر کر بلائے عصر
اور سوچتا ہوں میرے طرفدار کیا ہوئے ؟

اکبر بگٹی سے لے کر مشیر پیش امام، نواز شریف سے لیکر خورشید محمود قصوری اور جاوید ہاشمی سے لیکر منظور وٹو تک سبھی ائیر مارشل کے شاگرد رہے ہیں۔

☆ میاں نواز شریف

ہاں دکھا دے اے تصور ! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

وزارتِ خزانہ سے لیکر وزارت عظمٰی تک کا پھولوں کا سفر اور اب جیل کی تنہائی خوبصورت تصورات ہی واحد سہارا رہ گئے ہیں۔

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

☆ شیر باز مزاری

لازم ہے زمانے پہ کرے قدر ہماری
ہم لوگ قمر لوٹ کے آیا نہیں کرتے

مزاری صاحب نے جس طرح سیاست کی اور وہ جس طرح ناموزوں سمجھے گئے اہل نظر اس حادثے سے خواب واقف ہیں۔

☆ بے نظیر بھٹو

اب اداس پھرتے ہو کیوں سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

مکافات عمل نے ظاہر ہے کبھی سامنے تو آنا تھا خواہ دستانے کتنے موٹے کیوں نہ ہوں آستین کا لہو پکار ہی اٹھتا ہے۔

☆ الطاف حسین

تمہیں رہبر سمجھنا پڑ گیا ہے
ہماری بے بسی کی انتہا ہے

دماغ چکرا دینے والا ایک سپاسنامہ

ہماری قومی تاریخ میں سیاسی وڈیرے اگر بہت گل کھلاتے رہے ہیں تو مذہبی باوے بھی بہت سے حادثوں کے ذمہ دار ہیں ایک نے دولت کے بل پر عوام کا استحصال کیا تو دوسرے نے "روحانیت" کے پردے میں یہ کھیل جاری رکھا، عوام کا حال اب بھی یہ ہے کہ "وڈیرا" اس کے گلے سے طوق اترنے نہیں دیتا اور "باوا" کی سونے کی زنجیر عوام کو اپنے پاؤں میں خود ہی راس آئی ہوئی ہے اسے میں روحانی کرشمہ یا فیض کرامت ماننے کو ہرگز تیار نہیں البتہ مسمریزم یا عوام کی اپنی حد سے بڑھی ہوئی ذہنی وفکری غلامی، نادانی و جہالت اور ہندو سماج کی صحبت کا اثر ضرور کہوں گا کہ ہمارے عوام ہر سجادہ نشین اور کسی مقبرے کے مجاور کو "قاضی الحاجات" اور "جنت کا کنجی بردار" سمجھتے ہیں اور اپنا ذہنی، فکری اور مالی استحصال کرا کے بہت خوش ہوتے ہیں کوئی باوا "کڑے والا" ہے کوئی "گھڑیال والا" کسی نے اپنا نام "میٹرھے شاہ" رکھا ہوا ہے اور کسی کا لقب "موتیاں والی سرکار" ہے یہ مخلوق اللہ جانے کہاں سے نکل آئی ہے؟ حالانکہ فقر و تصوف کوئی راز اور معمہ نہیں خانقاہی نظام تاریخ کا بڑا قدیم نظام ہے صوفیاء کرام اسلامی تہذیب و تاریخ کا معتبر اور قابل قدر حوالہ ہیں شیخ جنید بغدادیؒ سے کون واقف نہیں؟ حضرت شیخ جیلانیؒ کی اسلامی خدمات کس سے پوشیدہ ہیں؟ خواجہ اجمیریؒ کے فیض کا کون منکر ہے؟ بابا فریدؒ نے جس ہمت اور مشقت سے پنجاب

میں اسلام کا پودا لگایا اس سے کون نا آشنا ہے؟ اسی طرح سینکڑوں صوفیاء اور اولیاء جن کی سوانح اور خدمات صفحہ تاریخ پر درج ہیں لیکن ان سب میں قدر مشترک ایک تھی خدا خوفی، بے نیازی، تقوی، خدمتِ اسلام اور پاکیزگی قلب و نظر، مگر پچھلے ڈیڑھ سو سال میں یہ ادارہ اپنے نصب العین سے بہت دور چلا گیا ہے اور گدیاں محض وراثتیں بن کر رہ گئی ہیں اور گدی نشین صرف نام کے ''روحانی رہنما'' اچھے لوگ اب بھی ہیں اور ان کا ہمیشہ استثناء رہا ہے عوام کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ روحانیت وراثت میں ملتی ہے حالانکہ صاف اور واضح بات ہے کہ نبوت اگر وراثت میں نہیں ملتی تو ولایت کیسے مل سکتی ہے؟ ہاں اولاد میں سے جو کوئی بزرگوں کے نقش قدم پر چلے تو وہ روحانی فیض کا وارث ہو سکتا ہے محض اولاد اور نسل کی بناء روحانیت کی منتقلی کا عقیدہ ایک لطیفہ ہے اگر نسل کو دیکھا جائے تو پھر دنیا بھر کے سادات کرام سے بڑھ کر اولیاء کون ہو سکتا ہے؟ کیوں کہ سادات تو آل رسول سمجھے جاتے ہیں یہ بات مختلف حیلوں بہانوں، کہانیوں، حکایتوں، تقریروں، کرشموں اور مجلسوں کے ذریعے ذہنوں میں اس قدر راسخ کر دی گئی ہے کہ عوام سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں پھر بھی ان کا عقیدہ کمزور نہیں پڑتا، پنجاب اور سندھ کے معروف اور مشہور گدی نشین جس قدر روحانیت کے سرچشمے ہیں سب کو پتہ ہے چشمِ بددور سب سے بڑے روحانی رہنماؤں میں ہمارے پیر صاحب پگاڑا، مخدوم امین فہم، صالح حیات، مودود مسعود چشتی، جمال محمد کوریجہ، بی بی عابدہ، یوسف رضا گیلانی ایسے حضرات شامل ہیں اور ان سب کی کرامات سے کون واقف نہیں؟ حالانکہ آج بھی جو شخص کتاب و سنت کا پابند ہے فرائض سے اسے رغبت اور کبائر سے نفرت ہے علم سے آراستہ ہے حسن کردار کا مالک ہے بھلا اس پر کون انگلی اٹھا سکتا ہے اور ان سے آج بھی انسان اچھی تعلیم و تربیت حاصل کر سکتا ہے چاہے وہ معروف ہو گیا یا گمنام لیکن دوکان اونچی ہو اور پکوان بالکل پھیکا ہو یعنی پیر صاحب اولاد تو

ہوں کسی خدا رسیدہ بزرگ کی مگر اشغال ہوں حکومتِ وقت کا کاسہ لیسی، غریبوں کی عزت پر جھپٹنا، لوگوں کی زمینوں پر قبضہ کرنا مجرے دیکھنا، کتے لڑانا اور ناؤ نوش کی محفلوں کی زینت بننا تو اسے سرخاب کی دم میں کوے کا پر ٹانکنا کہا جائے گا۔

یہ ساری باتیں نوک قلم پر اس لئے آ گئیں کہ کچھ عرصہ پہلے ایک معاصر اخبار کے خصوصی ایڈیشن میں ایک سپاسنامہ چھپا دیکھا جو مغربی پنجاب کے سجادہ نشین حضرات نے پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اڈوائر کی خدمت میں بڑی عاجزی کے ساتھ پیش کیا تھا یہ صاحب وہی ذاتِ شریف ہیں جنہوں نے امرتسر لاہور اور گوجرانوالہ میں مارشل لاء نافذ کیا اور جن کے حکم پر جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر نے جلسہ عام پر گولیاں برسا کر سو سے زیادہ انسانوں کو بھون ڈالا تھا، یہ انگریزی عہد کے ہندوستان کا بڑا دل گداز اور مشہور حادثہ ہے یہی سنامہ معروف صحافی جناب وکیل انجم نے اپنی کتاب ''سیاست کے فرعون'' میں نقل کیا ہے سچی بات یہ ہے کہ سپاسنامے کا ایک ایک لفظ خون کھولانے، دماغ چکرانے، بھیجا پگھلانے ہوش اڑانے اور عقیدتوں کی ساری متاع خاک میں ملانے والا ہے۔ یہ سپاس نامہ کیا ہے چاپلوسی کا ایک پلندہ کاسہ لیسی کا ایک پروانہ اور قوم فروشی کا ایک بیعانہ ہے، یہ سپاسنامہ آج لاہور کے سول سیکرٹریٹ میں محفوظ ہے اس لئے اس کے درست ہونے میں کوئی شبہ نہیں ظاہر ہے جب عقابوں کے نشیمن زاغوں کے تصرف میں آ جائیں تو ایسے سانحے رونما ہوتے رہتے ہیں ہم نے کچھ دن پہلے انہی کالموں میں جنوبی پنجاب کے لغاریوں مزاریوں کھوسوں اور دریشکوں کے سپاسنامے کا اقتباس دیا تھا مگر مشائخ کا یہ سپاسنامہ اس پر بازی لے گیا ہے یہ سپاسنامہ پڑھ کر دل سے ہوک اٹھی۔

یہاں بھی کشمکش دیکھی وہی سوداگری دیکھی
میں سمجھا تھا کہ میخانے کی دنیا دوسری ہو گی

اب ذرا دل تھام کر سپاسنامہ کے اقتباسات پڑھیے اس محضر نامے پر دستخط بھی ہیں لیکن نام لکھوں گا تو بہت سی پیشانیوں پر بل پڑیں گے اور بہت سوں کے ذائقے خراب ہوں گے۔

"حضورِ والا ہم خادم الفقراء سجادہ نشیناں و علماء متعلقین شرفائے حاضر الوقت مغربی حصہ پنجاب نہایت ادب اور عجز و انکسار سے یہ ایڈریس لیکر خدمت عالی میں حاضر ہوئے ہیں اور ہمیں یقینِ کامل ہے کہ حضورِ انور جن کی ذاتِ عالی صفات میں قدرت نے دلجوئی، ذرہ نوازی اور انصاف پسندی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے ہم خاکساران باوفا کے اظہار دل کو توجہ سے سماعت فرما کر ہمارے کلاہِ فخر کو چار چاند لگا دیں گے...... حضور کا زمانہ ایک نہایت نازک زمانہ تھا اور پنجاب کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی عنان حکومت اس زمانے میں حضور جیسے صاحب استقلال، بیدار مغز اور عالی دماغ حاکم کے مضبوط ہاتھوں میں رہی جس سے نہ صرف اندرونی امن ہی قائم رہا بلکہ حضور کی دانشمندانہ رہنمائی میں پنجاب سے اپنے ایثار و وفاداری اور جاں نثاری کا وہ ثبوت دیا جس سے "شمشیرِ سلطنت" کا قابل فخر و عزت لقب پایا...... صرف جناب والا کو ہماری بہبود مطلوب نہ تھی بلکہ صلیب احمر و تعلیم نسواں کے نیک کاموں میں حضور کی ہمدم و ہمراز جنابہ لیڈی اڈوائر صاحبہ نے جن کو ہم مروت کی زندہ تصویر سمجھتے ہیں ہمارا ہاتھ بٹایا، اور ہندوستانی مستورات پر احسان کر کے ثواب دارین حاصل کیا۔"

یہ سپاسنامہ چونکہ بہت طویل ہے اس لئے اقتباسات پر اکتفاء کیا جا رہا ہے آگے دیکھئے "ہم سچ عرض کرتے ہیں کہ جو برکات ہمیں اس سلطنت کی بدولت حاصل ہوئیں اگر ہمیں عمر خضر بھی نصیب ہو تو بھی ہم ان احسانات کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ ہندوستان کے لئے سلطنتِ برطانیہ ابر رحمت کی طرح نازل ہوئی...... ہم حضور سے درخواست کرتے ہیں کہ جب حضور وطن کو تشریف لے جاویں تو اس نامور تاجدارِ

ہندوستان کو یقین دلائیں کہ چاہے کیسا ہی انقلاب کیوں نہ ہو ہماری وفاداری میں سرِ مُو فرق نہ آیا ہے اور نہ آ سکتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہم اور ہمارے پیران و مرید فوجی وغیرہ جن پر سرکارِ برطانیہ کے بے شمار احسانات ہیں ہمیشہ سرکار کے حلقہ بگوش اور جان نثار رہیں گے۔"

آگے چل کر کہا گیا۔

"ہم کو ان کوتاہ اندیش دشمنان ملکپر بھی سخت افسوس ہے جن کی سازش سے تمام ملک میں بدامنی پھیل گئی اور جنہوں نے اپنی حرکات ناشائستہ سے پنجاب کے نیک نام پر دھبہ لگایا مقابلہ آخر مقابلہ ہی ہے ہم حضور کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم ان گمراہ لوگوں کی حرکات مجنونانہ و جاہلانہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔"

یہ سپاسنامہ ۱۹۱۹ء میں پیش کیا گیا اور اہل نظر اس دور کے حالات سے خوب واقف ہیں یہی وہ دور تھا جب ترکی کی خلافت ختم کی جارہی تھی، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام پر بغاوت کے مقدمے تھے، مولانا حسرت موہانی جیل میں چکی پیس رہے تھے مولانا سندھی جلاوطن ہورہے تھے، تحریک ریشمی رومال کے خلاف جاسوسی ہو رہی تھی اور ہر شریف اور غیور مسلمان کوڑوں کی زد میں تھا اور آزادی مانگنے کی سزا سولی تھی، یا خدا ہمیں بھی کیسے "وڈیرے" اور "باوے" ملے ہیں کیا بات ہے ہمارے مقدر کی!

کس کو کیا ہونا چاہیے؟

انسانی سوسائٹی مختلف ذوق اور مزاج کے افراد کا مجموعہ ہوتی ہے زندگی کے بیسیوں شعبے اور کام کے درجنوں زاویے ہیں اور ہر شخص اپنی صلاحیت اور درجے کے اعتبار سے مسئول اور جوابدہ ہے خدا، وقت اور تاریخ کے دربار میں دعویٰ کافی نہیں دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔

اقبال نے اسی لئے زبانی لا الہ کی بجائے دل ونگاہ کی مسلمانی پر زور دیا ہے۔

ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اسے اپنا حکمران مان لیں لیکن حکمرانی کی کچھ شرائط ہیں ہر انسان چاہتا ہے کہ وہ لیڈر بنے مگر رہنمائی کے کچھ تقاضے ہیں ہر ایک گمان کرتا ہے کہ لوگ اسے اپنا دوست سمجھیں مگر دوستی کے بھی کچھ آداب ہیں، ہر دل میں یہ امنگ ہوتی ہے کہ سوسائٹی میں اسے دانشور تسلیم کیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ دانشوری بازار کا سودا نہیں جو چاہے خرید کر بیگ میں ڈال لے۔

آج جو لوگ جریدہ عالم پر ثبت اور صفحہ تاریخ پر رقم نظر آتے ہیں ان کا یہ ثبات و دوام سفارش کے رقعے نہیں آزمائش کے مرحلے سے گزرا ہے۔

یہ کائنات مظاہر ومناظر کا خوبصورت مرقع ہے انسان دائیں بائیں دیکھے تو زمین وآسمان کے درمیان مختلف انداز وآہنگ سے آشنا ہوتا ہے چرند پرند، پہاڑ، دریا، سمندر، باغات اشیاء، پھول، پتے، رنگ، خوشبو اور شکلوں کا ایک بے بہا خزانہ ہے

جو قیامت تک ختم نہیں ہوگا۔ کوئی غور نہ کرے تو کچھ بھی نہیں اور کوئی چشم بینا رکھتا ہو تو اس کو قطرے میں دجلہ اور ذرے میں صحرا دکھائی دیتا ہے ہر زاویے میں ایک حسن ہر ذرے میں ایک حکمت ہر قطرے میں ایک سبق ہر گوشے میں ایک کردار اور ہر شعبے میں ایک جوہر ملتا ہے۔

انسان اگر چاہے کہ وہ باکمال ہو کر عزیز جہاں بن جائے تو اوراق و صفحات میں نہیں کتاب کائنات پر غور کرے تو خوبیوں اور خوبصورتیوں کا ایک ختم نہ ہونے والا باب کھلا ہوا ملتا ہے انسان اس سے اپنے شعبے سے متعلق خوبیاں چنتا اور جزوِ سیرت بناتا جائے تو اسے انسان کامل بننے کا ہنر ہاتھ آ جائے گا۔ قدرت نے ہر چیز با مقصد بنائی ہے اور کوئی شے فالتو اور عبث نہیں، آسمان کے ستارے سے لیکر خاک کے ذرے تک میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہے جو اس کائنات کی تکمیل و تقویم اور تحسین و تزئین کا باعث ہے، کوئی اہل نظر ہو تو اسے ثبوت حق کے لئے صبح کا منظر اور کوئی رمز آشنائے فطرت ہو تو اس کے لئے کلی کا چٹکنا کافی ہے۔

انسانوں کے مختلف شعبے اور پیشے ہیں، حکمران، سیاستدان، دانشور، صحافی، استاد، مرشد، خطیب، شاعر، منصف، مفکر، عالم، اہل قلم، دوست، کارکن، سپہ سالار یہ سب انسانی شعبے ہیں اور ان شعبوں کے افراد سوسائٹی کے نمایاں اور قابل تقلید لوگ ہوتے ہیں ان کو کیسا ہونا چاہیے؟ تاکہ یہ اپنے شعبے سے انصاف کر سکیں، یہ اوصاف محض تخیلاتی اور ناممکن الحصول نہیں بلکہ واقعات اور اصل الاصول ہیں ورنہ ہر دعوی بے دلیل رہے گا۔

☆ حکمرانوں کو سمندر کی طرح گہرا، شام کی طرح سنجیدہ، افق کی طرح وسیع، آسمان کی طرح بلند، نوشیروں کی طرح عادل اور حضرت ایوبؑ کی طرح صابر ہونا چاہیے۔

☆ سیاسی رہنما کو شاہین کی طرح خوددار، کچھوے کی طرح سخت جان، چیل کی طرح تیز نگاہ، شیر کی طرح حوصلہ مند، چیتے کی طرح تیز رفتار، اور بارش کی طرح مسلسل ہونا چاہیے۔

☆ دانشور کو آئینے کی طرح صاف، فاختہ کی طرح پرامن، ریشم کی طرح ملائم، چاندنی کی طرح آسودہ اور بہار کی طرح شگفتہ ہونا چاہیے۔

☆ صحافی کو تلوار کی طرح کاٹ دار، فولاد کی طرح مضبوط، پتھر کی طرح بھاری، دن کی طرح روشن، رات کی طرح گھمبیر، اور دھوپ کی طرح کڑا ہونا چاہے۔

☆ استاد کو چشمے کی طرح رواں، موتی کی طرح آبدار، روح کی طرح پاکیزہ، کوئل کی طرح دل گداز، زمین کی طرح بردبار اور فراخ ہونا چاہیے۔

☆ مرشد کو شاخ تر کی طرح نرم، بچے کی طرح معصوم، قلندر کی طرح بے سروسامان، سونے کی طرح کھرا اور چھاؤں کی طرح ٹھنڈا ہونا چاہیے۔

☆ خطیب کو آبشار کی طرح مترنم، شہد کی طرح شیریں، شعر کی طرح فی البدیہہ، نرگس کی طرح خودبین اور آنکھ کی طرح جہان بین ہونا چاہیے۔

☆ شاعر کو فقرے کی طرح چُست، مصرے کی طرح برجستہ، مسکراہٹ کی طرح بے ساختہ، نسیمِ سحر کی طرح سبک، اور شبنم کی طرح تروتازہ ہونا چاہیے

☆ منصف (جج) کو کنول کی طرح شفاف، روشنی کی طرح بے داغ حسن کی طرح بے نیاز اور جھیل کی طرح گہرا ہونا چاہیے۔

☆ مفکر کو پہاڑ کی طرح مجسمہ وقار، برف کی طرح یخ، قوس وقزح کی طرح ہفت رنگ اور شاہراہ کی طرح ہموار ہونا چاہے۔

☆ دوست کو محبت کی طرح بے داغ صبح کی طرح خندہ رو، سرو کی طرح بے گرہ، پانی کی طرح مصفا اور گلاب کی طرح نفیس ہونا چاہیے۔

☆ کارکن کو آنسو کی طرح گرم، آہ کی طرح سرد، دل کی طرح سادہ، عشق کی طرح بے تاب، پارے کی طرح مضطرب، طوفان کی طرح ہنگاہ خیز اور سیلاب کی طرح تند ہونا چاہیے۔

☆ سپاہی کو تیر کی طرح سیدھا، آگ کی طرح شعلہ بداماں، منظر کی طرح واضح، بجلی کی طرح تیز، عاشق کی طرح جفا کیش پروانے کی طرح جان باز، اور چکور کی طرح بلند پرواز ہونا چاہیے۔

اور طالب علم کو علم کی پیاس اس طرح ہونی چاہیے جس طرح ریتلی زمین کو پانی کی پیاس ہوتی ہے اسے ہر لائبریری کا یوں طواف کرنا چاہیے جسے بھنورا ہر پھول کے گرد گھومتا ہے، اسے کتاب پر یوں لپکنا چاہیے جس طرح پروانہ شمع پر گرتا ہے اور اسے بارگاہِ علم میں یوں حاضر رہنا چاہیے جس طرح بھکاری سخی کے دروازے پر بیٹھتا اور خیرات لے کر اٹھتا ہے۔

انسان کی تلاش

پہلے دن کی طرح آج بھی مسئلہ عالم، متکلم، فلسفی، مفتی، فقیہہ، صوفی، شاعر ادیب، خطیب، اداکار، حکمران، لیڈر، شیخ، چودہری، مناظر اور مصنف بننے کا نہیں ...... انسان ...... بننے کا ہے نہ فرشتہ نہ شیطان کوئی عالم تو ہو مگر بے عمل، فلسفی تو ہو مگر صرف دوسروں کو الجھانے والا، متکلم تو ہو مگر محض باتونی، فقیہ تو ہو مگر مفروضے گھڑنے والا، خطیب تو ہو مگر جس کی خطابت نری آفت ہو شاعر تو ہو مگر شعور سے عاری، ادیب تو ہو مگر محروم ادب، اداکار تو ہو مگر فقط ریاکار، شیخ تو ہو مگر شیخی خورا، لیڈر تو ہو مگر صرف لاؤڈ سپیکر، حکمران تو ہو مگر بدعنوان اور مصنف تو ہو مگر لفظ جوڑنے اور دل توڑنے والا تو کیا حاصل؟ بات تو انسان بننے کی ہے اور یہی مشکل ہے سچی بات یہ ہے کہ اونچی دکان پر پکوان ہمیشہ پھیکا ہی ملا ہے کئی عالم ایسے ملے جن کے پاس علم کے علاوہ سب کچھ تھا شاعر ایسے پائے گئے کلام سنو یا پڑھو تو آنکھیں ساون کی بدلی بن جائیں مگر ملو تو ان سے بڑا پتھر دل کوئی نہ دیکھا۔ ایسے خطیب بھی دیکھے گئے ہیں جن کی خطابت کی گونج تھی مگر زیارت کرنے سے کراہت حاصل ہوئی ایسے صوفی بھی موجود ہیں جو صافی شربت سے زیادہ کڑوے ہیں ایسے شیخ بھی نظر آتے ہیں جو صرف شیخی اور شوخی کا پیکر ہیں اور ایسے مصنف بھی بہتیرے ہیں الفاظ دیکھو تو سبحان اللہ اور اخلاق دیکھو تو معاذ اللہ۔

مولانا روم کو اپنے دور میں یہی مسئلہ درپیش تھا وہ سرّ دلبراں کو حدیث دیگراں

میں بیان کرتے ہیں کہ ایک اہل نظر دن کی روشنی میں چراغ ہاتھ پر رکھ کر کوئی چیز ڈھونڈ رہا تھا اور وہ بھی بھرے بازار میں لوگوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا اور پوچھا کس کی تلاش ہے؟ اس مجذوب نے کہا انسان کی لوگ ہنس پڑے اور بولے کیا یہ ہجوم ناکافی ہے؟ اس نے کہا جنہیں میں دیکھنا نہیں چاہتا وہ سامنے ہیں اور جسے پانا چاہتا ہوں وہ دستیاب نہیں اور جو دستیاب نہیں وہی میرا ہدف ہے۔

گفت آنکہ یافت می نہ شود آنم آرزوست

علامہ اقبال کو بھی پورے قافلہ حجاز میں ایک...... حسینؓ.....کی ہمیشہ تلاش رہی ،غالب کو بھی یہی غم ستاتا رہا۔

سخت دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ کسی دور میں انسان دستیاب نہیں رہا؟ نہیں بات کچھ یوں ہے کہ ایک تو مولانا رومؒ اقبالؒ اور غالبؒ کے معیار کا مسئلہ ہے اور یہ کسی حد تک جائز بات ہے اقبالؒ نے شرق وغرب کے میخانے کھنگال ڈالے لیکن یہ الجھن دور نہ ہو سکی۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

یہ الگ بات ہے مگر ہم لوگ بڑا اور اچھا انسان اونچے ایوان میں ڈھونڈھنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ کچے مکان میں مل جاتا ہے ہم صوفی مسندوں، حجروں، گدیوں، اور خانقاہوں میں ڈھونڈتے ہیں مگر وہ تو گلی کوچوں میں مل جاتے ہیں۔ ریڑھی لگا کر رزق حلال کمانے اور جائز و ناجائز مین امتیاز کرنے والے، ہم نے علماء مکتب و مدرس میں تلاش کرنے چاہے حالانکہ وہ دائیں بائیں نظر آجاتے ہیں، عمامہ کلاہ کے بغیر، جن

کی زبان اور کردار کے درمیان ایک انچ کا بھی فاصلہ نہیں۔

ہم نے متقی اور پرہیز گار نوافل کے انبار وظائف و اذکار اور جبہ و دستار میں دیکھنے چاہے حالانکہ وہ تو ہر قصبے اور شہر میں مل جاتے ہیں جن کے دم سے بستیاں خدا کے غضب سے محفوظ ہیں یہ عام انسانی لباس میں مل جاتے ہیں جو کباڑ سے بچتے اور فرائض کے پابند ہیں نہ لوٹا بردار نہ تسبیح بدست، نہ خرقہ پوش، ہم نے بزرگ پہاڑوں کی چوٹیوں دریا کے کناروں اور مریدوں کے نرغے میں پانے چاہے حالانکہ وہ بزرگ ہمیں دفتروں، دکانوں، کارخانوں، اور منڈیوں میں مل جاتے ہیں جن کے حلق کبھی حرام سے آشنا نہیں ہوئے، جو کاروبار کرتے ہیں اور خوف پروردگار سے بھی غافل نہیں وہ مزدور ہیں جن کی پیٹھ تو بوجھ اٹھا کر جھک جاتی ہے مگر ان کی گردن سوائے خدا کے کسی کے آگے نہیں جھکتی، جن کی زبان حق کی ترجمان ہوتی ہے جن کی آنکھیں ہوسناک جن کی نیت بھوکی، جن کے آزار ڈھیلے، اور جن کے دماغ غلام نہیں، آدمی کا انسان ہونا پہلے بھی مطلوب تھا اور آج بھی مطلوب ہے لیکن ہماری تلاش کا زاویہ اور جستجو کا قرینہ درست نہیں تبھی تو شیخ بخارا نے ایک جگہ فرمایا کہ میں دو جگہوں پر حیرت کا مرقع بن کر رہ گیا ایک مطاف کعبہ میں کہ ایک شخص کو مصروف طواف دیکھا مگر اس کا دل یاد خدا سے غافل پایا اور دوسرے بخارا کے بازار میں ایک دکاندار کو دیکھا کہ ہاتھ کاروبار میں ہے اور دل پروردگار کی طرف، ہم سمجھتے ہیں جس کا طرہ اونچا ہو وہی لیڈر ہے حالانکہ جس کا نظریہ اونچا ہو وہ لیڈر ہوتا ہے، ہمارا خیال ہے جس کے ہاتھ میں زمرد اور یاقوت کی تسبیح ہو وہ شیخ کامل ہوتا ہے حالانکہ جس کے ہاتھ اور زبان سے خلق خدا کو راحت پہنچے وہ مرشد برحق ہوتا ہے۔ ہمارا یہ نقطہ نظر بنا ہوا ہے کہ جو بھی لمبا اور اونچی کلاہ پہنتا ہے وہ عالم اور فقیہ ہے حالانکہ جو پاکیزہ اور بلند نگاہ ہو وہ عالم و فقیہ ہوتا ہے انسان آج بھی میسر ہیں مگر ہم غالباً فرشتہ ڈھونڈھنے میں لگے ہوئے ہیں جو پلک

جھپکتے ہی آسمانوں پر چلا جائے، فضاؤں میں اڑتا دکھائی دے سمندروں میں تیرتا ہوا نظر آئے نہ کھائے نہ پیئے۔ نہ بولے نہ ہنسے جب چاہے نظروں سے غائب ہو جائے اور جب چاہے آ جائے جب کہ انسان تو انسانوں کے درمیان رہتا ہے آسمانوں میں نہیں فضاؤں میں پرندے اور سمندر میں مچھلیاں ہوتی ہیں، انسان کھاتا پیتا بھی ہے اور بولتا ہنستا بھی اسے نظروں سے اوجھل نہیں سامنے رہنا چاہیے اور جیسا ہو ویسا نظر آنا چاہیے انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے اور مٹی کی زمین پر رہتا اور بستا ہے۔

فرشتہ مجھ کو کہنے سے میری توہین ہوتی ہے
میں مسجود ملائک ہوں مجھے انسان رہنے دو

انسان تسبیح کے دانوں، عمامہ کے پیچوں، دستار کے اوٹ، کلاہ کے سائے، پہاڑ کی چوٹی، مسند کی بلندی، کتاب کے اوراق اور الفاظ کے پیچ وخم میں نہیں انسانی بستیوں، آبادیوں، قصبوں بازاروں اور گلی کوچوں میں ملتا ہے۔ وفا کے موتی اکثر ویرانوں اور خزانے بسا اوقات خرابوں میں ملتے ہیں۔ شرط ہے طلب صادق اور نیت خالص کی۔

عاصمہ بی بی......آپ کا مسئلہ کیا ہے؟

علماءِ نفسیات نے برسوں کی تحقیق کے بعد اپنے طور پر انسان کی تین خواہشات کا پتہ چلایا ہے جن کی تکمیل کے لئے وہ سرگرداں رہتا ہے ان علماء کے نزدیک سیاست ،شوق فرمانروائی ،جنون جنگ ،شاعری ،ادب ،آرٹ وغیرہ یہ سب پردے ہیں جن کے پیچھے دولت ،شہرت اور مسرت کے حصول کی خواہش پوشیدہ ہوتی ہے اگرچہ ہمیں اس تحقیق اور اس سے اخذ کردہ نتائج سے کلی اتفاق نہیں تاہم یہ تحقیق چونکہ ایڈلر اور ژونگ وغیرہ نامور مغربی دانشوروں نے کی ہے اس لئے ایک دنیا ان نتائج سے متفق نظر آتی ہے۔

ہم نے جب سے عاصمہ بی بی کا نام پڑھا اور سنا ہے کسی نہ کسی متنازعہ حوالے اور واقع سے پڑھا سنا ہے ،دولت تو ان کا مسئلہ قطعاً نہیں اس لئے کہ ان کے والد سیٹلمنٹ کمشنر رہے اور یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اس محکمے کے ذریعے کوئی اور SET ہوا ہو یا نہ لیکن محکمے کے جملہ کارپرداز اور افسر بہت اچھی طرح Settle ہوئے ہیں انگریز کی گھوڑپال سکیم کے طفیل انہوں نے سینکڑوں ایکڑ اراضی بھی حاصل کی ،نیز شیخ مجیب الرحمٰن اور یوسف ہارون کے ساتھ ان کے گہرے اور پہلودار مراسم ان کے لئے ''فتح الباب'' بن گئے ظاہر ہے یہ ساری دولت عاصمہ بی بی اور ان کی بہن کے حصے میں آئی باقی دو خواہشیں ایسی ہیں جن کی تکمیل کے لئے محترمہ یہ سرگرمیاں جاری رکھے

ہوئے ہیں، یعنی شہرت اور مسرت لیکن عاصمہ جیسی پڑھی لکھی خاتون نجانے کس منفی رد
عمل کا شکار ہے کہ وہ آج تک نہیں سمجھ سکی کہ شہرت تو بلا شبہ راتوں رات مل جاتی ہے
لیکن مسئلہ عظمت کا ہوتا ہے جس کے لئے طویل ریاضت اور فکر و کردار کی استقامت
مطلوب ہوتی ہے۔ شہرت بذات خود کوئی چیز نہیں اور یہ بہت ہی سطحی حرکتوں اور بے
فیض سرگرمیوں سے بھی حاصل ہو جاتی ہے جیسا کہ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے پا
کھنڈ کرتے رہتے ہیں مثلاً چار فٹ تک مونچھیں بڑھا لینا، دانتوں سے بھاری وزن
اٹھانا سائیکل پر ساری دنیا کا چکر لگانا، دس انچ ناخن رکھنا، شیشے کے ٹکڑے چبانا،
آنکھوں میں سوئیاں چبھونا، اور لکڑی اور اس کا برادہ بطور غذا استعمال کرنا یہ سارے
پاپڑ سطحی شہرت کے لئے بیلے جاتے ہیں اور یہ سارے حربے بے فائدہ کمتر اور چھوٹے
ذہن کی تسکین کا سامان ہوتے ہیں کوئی معقول اور تعلیم یافتہ آدمی ان باتوں میں دلچسپی
نہیں لیتا، ہاں علم و ادب میں اصول و کردار میں، کسی نئی سائنسی ایجاد میں اور کسی بین
الاقوامی اور انسانی خدمت میں شہرت پانا اچھی چیز بھی ہے اور دلیلِ عظمت بھی۔

ہر لمحے اور ہر آن ایسی حرکت یا بات کرنا جو چونکا دینے والی اور اخباری
اصطلاح میں اپنے اندر خبریت رکھنے والی اور جنگل کی آگ کی طرح پھیل جانے والی
ہو، ایسی حرکت اور بات سے **Nuisance** پیدا کرنا شہرت کی وہ خواہش ہے جسے
شرق و مغرب کے تمام علمائے نفسیات مریضانہ خواہش قرار دیتے ہیں۔

عاصمہ جہانگیر کا کوئی سا انٹرویو پڑھ لیجیے۔ اس میں استدلال، تحمل ربط اور
اثباتی انداز نہیں ملے گا بلکہ اشتعال انگیزی، طعنہ زنی، نفرت آمیزی اور مضحکہ خیزی نظر
آئے گی، اور یہ سارے مظاہر حصول شہرت کے ہوتے ہیں شہرت کی چاٹ جسے لگ
جائے اور اخبارات کی سرخیوں میں آنے کی عادت جسے پڑ جائے وہ مثبت اور منفی اور
احسن اور قبیح کے امتیاز سے عاری ہو جاتا ہے چاہے ایسا شخص ڈانس کے ذریعے خبروں

میں آئے یا کوئی عورت سگریٹ کے کش لگا کر منفرد دکھائی دے اور سرخیوں کی زینت بنے، کچھ ایسا ہی مسئلہ عاصمہ جہانگیر کا لگتا ہے، ایک اور خواہش جسے مسرت کہتے ہیں زندگی کی اہم خواہشات میں شمار ہوتی ہے، یعنی زندگی کے کسی موڑ پر کوئی مسرت وراحت سے محروم رہ جاتا ہے پھر وہ ساری باگیں توڑ اور حدیں پھلانگ کر حصول مسرت کے لئے کوشاں ہوتا ہے یہ بھی احساس ناکامی کی ایک قسم ہے اگر حصول مسرت کا جذبہ مثبت ہو تو بہت اچھا ہے لیکن اس کے پیچھے کوئی نفسیاتی انتقام ہو تو وہ بہت زہرناک بن جاتا ہے راحت ومسرت کا ایک انداز تو یہ ہے کہ کوئی شخص یتیم پروری کرے اور اسے راحت ملے، ہسپتال بنا دے سبیل لگا دے غریب بچیوں کے جہیز کا بندوبست کر دے قیدیوں کو چھڑانے اور گمشدہ بچوں کو گھر پہنچانے کا کام کرے یہ سارے مثبت انداز ہیں مگر عاصمہ بی بی قسم کے لوگوں کی مسرت کا سرچشمہ دوسروں کی اذیت سے پھوٹتا ہے یعنی جس قدر کسی دوسرے شخص، خاندان، گروہ اور سوسائٹی کو تکلیف پہنچتی ہے انہیں مسرت حاصل ہوتی ہے یہ سراسر منفی نفسیات کا شاخسانہ ہے، عاصمہ کو معلوم ہے کہ کشمیر میں بہتے ہوئے خون اور لٹتی ہوئی عصمتوں کی قیمت پر بھارت سے محبت کے پیمان لڑیاں کِکلیاں، بھنگڑے اور والہانہ نعرے کشمیریوں اور پاکستانیوں کے لئے بہت تکلیف دہ ہیں مگر عاصمہ کی مسرت کا راز ہی دوسروں کی اذیت میں پوشیدہ ہے عاصمہ دوسروں کی بہو بیٹیاں کو گھر میں بسا کر نہیں بلکہ ان کے گھر اجاڑ کر راحت محسوس کرتی ہیں اور بولی وہ بولتی ہیں جن سے دوسروں کی توہین ہو لیکن اس میں انہیں تسکین نصیب ہوتی ہے میرے خیال میں عاصمہ کا مسئلہ نہ انسانی حقوق ہیں نہ علاقائی امن، نہ آزادی نسواں اور نہ پیسہ بلکہ صرف شہرت ہے اور وہ بھی عظمت سے خالی اور مسرت ہے جو دوسروں کو اذیت دے کر ملتی ہے اور یہ نتیجہ ہے نفسیات کی کجی اور شخصیت کے ادھورے پن کا۔

حکام اور عوام

جس طرح برف ہمیشہ پہاڑوں پر پگھلتی ہے اور آگے چل کر یہی پانی ندی نالوں سے ہوتے ہوئے میدانوں اور کھیتی کو سیراب کرتا ہے اسی طرح عوام میں دیانت، قناعت، امانت، سادگی، کفایت اور فرض شناسی کے احساسات حکمرانوں سے ان کی طرف منتقل ہوتے ہیں، اصلاح و انقلاب کی ترتیب صعودی نہیں نزولی ہوتی ہے یعنی نیچے سے اوپر کی جانب نہیں بلکہ اوپر سے نیچے کی طرف ہوتی ہے۔ جب مصر فتح ہوا تو مقامی کمانڈر نے حضرت عمرؓ کو مال غنیمت بھجوایا اور ساتھ ایک رقعہ بھی بھیجا جس میں درج تھا کہ میرے سپاہی اس قدر دیانتدار ہیں اگر کسی کو سونے کا ڈلا ملا ہے یا معمولی سی سوئی اس نے اپنے پاس رکھنے کے بجائے میرے سپرد کی ہے۔ جب یہ خط حضرت عمرؓ کو ملا آپ نے کھول کر پڑھا تو آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے، پاس ہی حضرت علیؓ بیٹھے تھے وہ چونک گئے اور مضطرب ہو کر پوچھا "یا امیر! کیا محاذ جنگ سے کوئی بری خبر آئی ہے؟ آپ نے فرمایا "نہیں یہ خوشی کے آنسو ہیں اور پھر ساری بات پڑھ کر سنا دی اس پر حضرت علیؓ نے نہایت ایمان افروز حقیقت کشا اور تاریخ ساز جملہ کہا۔

"یہ سپاہیوں کی دیانت کا مسئلہ نہیں آپ کی دیانت کا کرشمہ ہے اگر آپ امانتدار نہ ہوتے تو سپاہیوں میں یہ وصف کبھی پیدا نہیں ہوتا۔"

آج ملک کا مسئلہ نمبر ایک معاشی مسئلہ بنا ہوا ہے اس میں کوئی دوسری رائے

نہیں لیکن اس مسئلے کا حل اور اس بحران کا ازالہ ان تمام طریقوں اور فارمولوں سے کیا جا رہا ہے جو نہ صرف آزمودہ اور بلکہ بہت حد تک از کار رفتہ اور پامال ہو چکے ہیں۔

یعنی ٹیکسوں میں اضافہ، جرمانے، وصولیاں اور دیگر اقدامات، بلا شبہ یہ بھی معاشی استحکام کے ذرائع ہیں لیکن معمول کے حالات میں اگر حالات غیر معمولی ہوں تو پھر اقدامات بھی غیر معمولی درکار ہوتے ہیں ہمارے نزدیک اولین، غیر معمولی اور نتیجہ آفرین اقدام ایک ہی ہے اور وہ ہے حکام کا خود اپنے اطوار بدلنا اور اپنی مراعات پر نظر ثانی کرنا اس مشورے کو ہمیشہ وعظ و تلقین کہہ کر اور غیر سائنسی و غیر عملی تجویز قرار دے کر نظر انداز کیا جاتا ہے حالانکہ اصل شاہ کلید یہی ہے قحط کے دنوں میں حضرت عمرؓ نے جو طرزِ عمل اپنایا وہی اسلوب زیست آج کے حکمرانوں کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے جت تک قحط سالی رہی آپ نے گھی اور گوشت کا استعمال ترک کر دیا جس سے رنگت سیاہ پڑ گئی اور پیٹ میں قراقر اٹھنے لگے عمال و حکام نے جب آپ کو اس قدر مشقت اٹھانے سے روکا تو آپ نے فرمایا۔

"مجھے لوگوں کی تکلیف کا احساس کس طرح ہو سکتا ہے جب تک مجھ پر بھی وہی کچھ نہ گزرے جو ان پر گزرتی ہے۔"

اپنے پوتے کو پھل کھاتے دیکھا تو غصے میں لال پیلے ہو گئے فرمایا "محمدؐ کی امت بھوکی مر رہی ہے اور عمر کا پوتا پھل کھا رہا ہے اور وہ پھل بھی کوئی انار، سیب اور انجیر نہیں تربوز تھا۔

خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع
تخیل ملکوتی و جذبہ ہائے بلند

آج پاکستان جس معاشرتی گرداب میں ہے اس کے لئے حکام کو تخیل ملکوتی اور جذبہ ہائے بلند سے کام لینا پڑے گا، اگرچہ یہ چیزیں "محض وعظ" ہیں تو پھر بتایا

جائے کہ مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ کیا یہ حقائق نہیں اور ان کے ہوتے ہوئے معاشی گرداب کیسے ختم ہوسکتا ہے کہ

سندھ کے گورنر ہاؤس کا بجلی کا ماہانہ بل اکیس لاکھ روپے آتا ہے۔

ایک خبر کے مطابق ڈائریکٹر ریلوے کی تنخواہ ڈیڑھ لاکھ روپے ہے، دیگر مراعات وسہولیات اس کے علاوہ ہیں۔

امریکی صدر کا دفتر اپنے دامن میں صرف بیس افراد کو سموسکتا ہے اور ہمارے صدر اور وزیراعظم (اور اب چیف ایگزیکٹو) کا دفتر بھی کیا اتنا ہی مختصر ہے؟

سویڈن اور برطانیہ کے وزرائے اعظم تین کمروں پر مشتمل گھر میں رہائش رکھتے ہیں کیا ہمارے ہاں بھی صدارتی ووزارتی بنگلے اسی نوعیت کے ہیں؟

جو گاڑیاں ہمارے ہاں وزراء استعمال کرتے ہیں کیا بھارت میں بھی وزیراعظم اور وزراء ایسی ہی گاڑیاں رکھتے ہیں؟ ہر ایک جانتا ہے ہرگز نہیں یہی وجہ ہے کہ بھارت کے عوام غریب ہیں اور حکومت امیر، ہمارے ہاں عوام بھی غریب ہیں حکومت بھی غریب ہے البتہ حکمران امیر ہیں ان کے معمولات ومراعات سے قطعاً غربت کا شائبہ نہیں ابھرتا۔

آفاقی، کائناتی، عملی، سادہ اور پر اثر حل یہی ہے کہ حکمران اپنی مٹھیاں کھول دیں جب ان کا خالی ہاتھ سب کے سامنے آجائے پھر کسی کی تجوری کا منہ بند نہیں رہ سکتا، اگر کسی نے ایسا کیا تو پھر حکام نہیں عوام خود اس کا ناطقہ بند کردیں گے۔

لینن جب برسراقتدار آیا تو وہ عرصے تک اپنے دفتر کی میز پر سوتا رہا، دن بھر کام اور رات کو فائلیں ہٹا کر میز کو بستر بنالیتا تھا، ماوزے تنگ نے تین برس تک کوئی نیا لباس نہیں سلوایا، وزیراعظم چواین لائی ہمیشہ سائیکل پر سواری کرتا تھا۔

۷۰ء تک چین کے حکمران نیلے رنگ کی مزدوروں جیسی ڈھیلی ڈھالی وردی

پہنتے رہے۔ جب ملک معاشی گرداب سے نکل گیا تو اب اسی چین میں صوفے بھی ہیں قالین بھی ہیں، گاڑیاں بھی ہی، فانوس بھی ہیں اور سب کچھ ہے جس کی ہوس نے ہمیں معاشی گرداب میں گرفتار کرر کھا ہے، لیکن ہر سہولت کا ایک وقت ہوتا ہے۔

آخر حضورﷺ بھی حامل منصب نبوت کے ساتھ ساتھ سربراہ مملکت بھی تھے آپ کی سرکاری رہائش کا طول وعرض ساری دنیا کے سامنے ہے جس میں آج صرف تین قبریں بنی ہیں ایک آپ کی مرقد منور اور دوسری دو حضرات ابوبکر وعمرؓ کی آرام گاہیں ہیں اور یہ حضرات بھی لاکھوں مربع میل پر محیط ریاستوں کے حکمران تھے، لیکن ان کی کوئی حویلی کوئی بنگلہ کوئی ریسٹ ہاؤس اور کوئی سپورٹس گراؤنڈ آج تک دستیاب نہیں ہوسکی کہا جاتا ہے کہ دور اور کلچر ہی ایسا تھا بالکل غلط، ایران وروم اور مصر وعراق کی حکومتیں اپنے جاہ وجلال طمطراق، طظنہ دبدبہ اور عیش وعشرت کے اعتبار سے آج کے ملکوں سے کسی صورت کم نہیں تھیں۔ اس کے باوجود مدینے کی ریاست کے فرمانروا گار سے لیپ کیئے ہوئے نیچی چھت کے گھروں میں رہتے اور جو کی روٹی کھاتے تھے اس لئے کہ قوت حیدری کا مدار ہمیشہ نان شعیر پر رہا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ سدا کچے گھروں میں رہا جائے ستو کھا کر گزارا کیا جائے اور ایک جوڑے میں زندگی بسر کی جائے بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کم از کم پانچ سال کے لئے حکمران ایک آہنی حصار کھینچ لیں، جب قرضے اتر جائیں جب آئی ایم ایف کی زنجیر ٹوٹ جائے اور جب معاشی طوفان تھم جائے پھر ساری مراعات بحال کردی جائیں بنیاد مضبوط ہوجائے تو پھر چھوٹے موٹے زلزلے عمارت کا کچھ نہیں بگاڑتے۔

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک ودیں

عید ایک سماجی تہوار بھی ہے اور مذہبی تقریب بھی، سماجی حوالے سے یہ اظہار مسرت اور مذہبی اعتبار سے یہ تشکر نعمت کا دن ہے، عید الفطر اہل اسلام کی تاریخی، دینی ،سماجی اور سیاسی شناخت ہے، تاریخی یوں کہ بہت سے اہم معرکے رمضان میں مسلمانوں نے سر کئے اور وہ فتوحات عید کا لطف دوبالا کر گئیں، سماجی اس طرح کہ ہر تہذیب وتمدن میں عید کا تصور پایا جاتا ہے، اسلام اپنے پیروکاروں کو بھلا اس خوشی سے کیسے محروم رکھ سکتا تھا؟ دینی اس اعتبار سے کہ خدا اور رسولؐ نے اہل اسلام کے لئے اس روز کو ''روز عید'' قرار دیا ہے، اور سیاسی شناخت اس حوالے سے کہ عید کا اجتماع محض دعا، تلاوت، معانقہ ومصافحہ عمدہ پکوان اور کھیل کود کا مظہر نہیں بلکہ شوکت اسلام و مسلمین کی عکاسی کرتا ہے، ہر بڑے قصبے اور شہر میں نمازِ عید کا اجتماع مسلمانوں کی ملی و سیاسی قوت اور جمعیت کو واضح کر رہا ہوتا ہے۔

اسلام میں کوئی فرض کوئی رکن اور کوئی عمل ایسا نہیں جو تہذیبی حکمت اور تمدنی مصلحت سے خالی ہو اس لئے کہ اسلام محض مذہب نہیں بدھ مت، ہندو مت، اور مسیحیت کی طرح بلکہ ایک طرزِ زیست اور اسلوب خیال ہے اور ظاہر ہے زندگی بے شمار تقاضوں سے عبارت ہے اور ہر تقاضا ایک دوسرے سے منسلک یہ کیسے ممکن ہے کہ زندگی کا ایک تقاضا دوسرے کے بغیر مکمل ہوتا ہو اسی طرح مسلمان بھی جہاں ہوتا ہے وہ

مسلمان ہوتا ہے یہ نہیں کہ اس کا مذہبی تقاضا اور ہو اور سماجی حوالہ کوئی اور ذاتی اعتبار سے وہ مسلمان ہو اور اجتماعی لحاظ سے کسی اور طرزِ عمل کا حامی و حائل ہو۔ چنانچہ عید کو بیٹھ بیک وقت کئی حوالوں سے اسلامی تاریخ و تہذیب میں اہمیت افادیت اور حیثیت دی گئی۔

عید الفطر روزہ داروں کے لئے یقیناً روز مسرت ہے کہ یہ دن ان کی مہینہ بھر کی جسمانی و روحانی محنت کا اجر ملنے کا دن ہے۔ مسلمانوں نے پورا مہینہ بھوک، پیاس اور دیگر جذبات پر ایک طرح سے کنٹرول رکھا اور سب کچھ موجود ہونے کے باوجود صرف حکم الٰہی کی تعمیل میں اپنے آپ کو ان چیزوں کی طرف بڑھنے سے روکا، روزے کے ذریعے بھوک پیاس پر قابو پایا، قیام اللیل کے ذریعے اپنی نیند کو روکا اور ضبط نفس کے ذریعے سفلی اور منفی جذبات کو کنٹرول کیا۔ عید کا دن ایک کریم آقا کا اپنے مطیع و وفادار غلام کو بھرپور اجر و اجرت دینے کا دن ہے۔ یہ تو ہے انفرادی سطح پر عید کے روز سعید ہونے کا مفہوم، مگر اجتماعی تناظر میں عید جب تک پوری سوسائٹی اور پوری امت کے لئے ساعت سعید نہ بنے تو یہ بالکل ایسے ہے کہ چمن تو ہو مگر اس میں بہار نہ اترے، پھول تو ہو مگر اس میں شگفتگی نہ ہو، چاند تو ہو مگر گرہن گزیدہ آنکھیں تو ہوں مگر افسردہ، بازار تو ہو مگر بے رونق، دل تو ہو مگر اداس اور ہجوم تو ہو مگر ہنگامے سے محروم۔

عید محض تہوار نہیں کہ اسے فقط، مہندی کے رچنے، چوڑیوں کے کھنکنے، سویوں کے پکنے، عید کے بٹنے، گلے سے لگنے، اور سنورنے سجنے تک محدود کر دیا جائے بلکہ یہ دن بیک وقت دین، تہذیب اور سماج کی نمائندگی کرتا ہے۔ فرد اور ملت کے جذبات و بہجت کا آئینہ دار ہے۔

فرد اگر اس روز نئے کپڑے پہن بھی لے تو کیا ہوا اگر پورا معاشرہ غیروں کی اترن پہننے پر مجبور ہو؟

فرد اگر عید کے دن منہ میٹھا بھی کر لے تو کیا ہوا اگر سوسائٹی کا تہذیب و اخلاقی

ذائقہ پہلے کی طرح کڑوا ہے؟

فرد اگر عید کی صبح جیب میں نئے نوٹ ٹھونس بھی لے تو کیا ہوا اگر ملکی خزانہ سرے سے خالی ہو۔؟

فرد اگر عید پڑھ کر دوسروں سے گلے بھی مل لے تو کیا ہوا اگر افراد معاشرہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر تلے ہوئے ہوں؟ فرد اگر عید آنے پر لبوں پر مسکراہٹ سجا بھی لے تو کیا ہوا اگر قوم اجتماعی سطح پر نوحہ زنی ہو۔

اہل اسلام نے پہلی عید وہ منائی تھی جب انہیں میدان بدر میں تعداد پر استعداد اور مقدار پر معیار کی برتری اور فتح کا مژدہ ملا تھا، اہل اسلام کی وہ عید بھی یادگار ہے جب بیس رمضان المبارک ۸ ہجری کو فتح مکہ جیسا عظیم الشان واقعہ رونما ہوا، طارق بن زیادؒ کی عید حقیقی معنوں میں عید تھی جب اس نے رمضان کے آخری دنوں میں سپین پر اسلامی پرچم لہرایا تھا محمد بن قاسم کے لشکریوں کو بھی ہی عید زیب دیتی تھی کہ انہوں نے ۱۰ رمضان المبارک کو خطہ ہند میں اسلام کی پہلی شمع روشن کی تھی غازی اصلاح الدین ایوبی کو یہ حق حاصل تھا کہ عید پوری شان سے منائے کہ اس نے ماہ رمضان میں صلیبی جنگوں میں آخری فتح پائی تھی اور صدیوں تک مغربی مسیحیت زخم چاٹتی رہی، سچی بات یہ ہے کہ نماز ہو، روزہ ہو، حج ہو یا عید ہو یہ سب مرد حر کے لئے ہیں۔ وہ مرد آزاد کہ جب نماز میں قیام کرتا ہے تو زمانہ اس کے احترام میں کھڑا ہو جاتا ہے جب وہ رکوع میں جھکتا ہے تو باطل کی ساری نخوتیں سرنگوں ہو جاتی ہیں جب وہ سجدہ کرتا ہے تو روح زمین کانپ اٹھتی ہے اور جب وہ تکبیر پڑھتا ہے تو منبر و محراب اور عالم خاک و آب وجد میں آجاتے ہیں۔

شکوہ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن
قبول حق ہیں فقط مردِ حر کی تکبیریں

عید کے روز ایسے کالم لکھنے کا مقصد میٹھی عید میں کھنڈت ڈالنا نہیں صرف توجہ دلانا ہے کہ نماز عید برحق مگر قیام بے حضور نتیجہ خیز نہیں ہوتا، سجودِ عبادت بجا مگر محرومِ سرور سجدے کارگر نہیں ہوتے، ذہنی و معاشی طور پر قوم نہ عید کے جلال سے آگاہ ہوتی ہے اور نہ اس کے لازوال جمال سے آراستہ، بدن میں خون گرم نہ ہو تو سجدہ محض رسمِ کہن بن جاتا ہے۔

عید آزاداں شکوہ ملک و دین
عیدِ محکوماں ہجوم مومنین

علامہ اقبالؒ روایتی غزل گو اور میر کی طرح رونے دھونے والے شاعر نہیں تھے اور نہ ہی چاک گریبان اور خانماں ویراں قسم کے قنوطی فلسفی، وہ خودی کے پیامبر اور کاروانِ اسلام کے رجز خواں تھے مگر اس کے باوجود وہ ''ہلال عید'' دیکھ کر کسی اور دنیا میں چلے گئے اور اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

اوجِ گردوں سے ذرا دنیا کی بستی دیکھ لے
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے
قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہبر و در ماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
دیکھ کر تجھ کو افق پر ہم لٹاتے تھے گہر
اے تہی ساغر، ہماری آج ناداری بھی دیکھ
فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ ان کی گرفتاری بھی دیکھ
دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیح شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

جس کو ہم نے آشنا لطفِ تکلّم سے کیا
اس حریف بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ

عید بلاشبہ خوشی کا دن ہے مگر یہ سودا بازار سے نہیں ملتا اس کا سرچشمہ دلِ بیدار ہے، وہ نگاہیں جن سے بجلیاں پناہ مانگتی تھیں اگر غیروں سے دوچار نہ ہوسکیں تو وہ نظارہ عید کیا کشید کرسکیں گی؟ اور وہ بیکراں جذبے جو بحر ظلمات کے کنارے تک پہنچ کر بھی نہیں تھمتے تھے اگر وہ امپورٹڈ گوٹہ کناری، اور سلمی ستارے تک محدود ہو جائیں تو وہ عید کا مفہوم کیا سمجھ نہیں پائیں گے؟ جسے اندیشہ افلاک حاصل نہ ہو۔ جو پرواز لولاک کے قابل نہ ہو اور جو نگاہ بے باک کا حاصل نہ ہو وہ شاہین کہلاتا بھی پھرے تو کون یقین کرے گا۔

خدائے زندوں کا خدا ہے

براہ کرم اقبال کو آئندہ ''علامہ'' نہ لکھا جائے

ہر ایک کو معلوم ہے کہ لفظ کا ایک لازمہ اور حرف کا ایک احترام ہوتا ہے، اسی طرح القاب و خطابات میں ایک معنویت ہوتی ہے اگر یہ چیزیں ملحوظ نہ رہیں۔ تو پورا علمی و ادبی ذخیرہ اور معنی و مفہوم بیکار ہو جاتا ہے، لقب ایک اعزاز اور خطاب کسی کی عظمت کا اعتراف ہوتا ہے، لقب خواہ کوئی حکومت اور ادارہ دے یا خطاب از خود عوام میں شہرت پالے، مگر ایک عرصے سے ہمارے ہاں الفاظ و حروف معنویت سے محروم اور القاب و خطابات مولی گاجر کی طرح ارزاں ہوتے جا رہے ہیں۔ ''علامہ'' ایک محترم اور باوقار خطاب ہے۔ اور کسی شخصیت کے لئے اس کا لازمہ بننے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پیچھے اس کے علمی مرتبے اس کے دینی مقام اس کے ادبی منصب اور اس کے عمر بھر کے ذہنی و فکری مجاہدے کا دخل ہے۔ اہل علم و ادب آگاہ ہیں کہ بعض شخصیات وہ ہوتی ہیں کہ ان کا نام نہ لیا جائے اور صرف لقب یا خطاب کا ذکر کر دیا جائے تو اہل ذوق اور سخن شناس از خود جان جاتے ہیں کہ کون سی شخصیت مذکور ہے ہمارے ہاں جب ''رئیس الاحرار'' بولا جاتا ہے تو ہر پڑھے لکھے کو معلوم ہے کہ اس سے مراد مولانا محمد علی جوہر ہیں ''قائداعظم'' کا مطلب محمد علی جناح ہے راشد الخیری، مصور غم کے خطاب سے مشہور ہیں۔ اکبر الہ آبادی کے لئے ''لسان العصر'' کا خطاب معروف ہے۔ ''رئیس المتغزلین'' سے ہر ایک مولانا حسرت موہانی مراد لیتا ہے۔

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کو کہا جاتا ہے''مسیح الملک'' حکیم اجمل خان سے مخصوص ہے اور''شہید ملت یا قائد ملت'' کہنے پر لیاقت علی خان کی کیفیت سامنے آتی ہے۔ ایسے بے شمار القاب وخطابات ہیں کہ وہ لب پر آئے نہیں اور متعلقہ شخصیت کی تصویر پردہ ذہن پر ابھر آتی ہے۔ انہی میں ایک معروف ومشہور خطاب''علامہ'' کا ہے اور یہ خطاب پڑھتے، لکھتے، یا سنتے ہی ذہن فوراً شاعر مشرق حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور بذات خود شاعر مشرق اور حکیم الامت کے خطابات بھی انہی کے لئے مخصوص ہیں کسی دوسری شخصیت کا ذہن میں کوئی تصور نہیں ابھرتا۔

علمی وادبی حلقوں میں بغیر کسی تکلف کے کہہ دیا جاتا ہے''حضرت علامہ نے فرمایا'' علامہ کے خیال میں''علامہ کا ایک شعر ہے'' اور کسی مخاطب کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی کہ یہاں حوالہ علامہ اقبالؒ کا دیا جارہا ہے۔

لیکن میں اسے ذہنی دیوالیہ، فکری المیہ، علمی حادثہ اور سماجی سانحہ سمجھتا ہوں کہ جلسے کے سامعین اور اخبارات کے قارئین اس بات کو نوٹ کرتے ہوں گے۔ کہ اب'' علامہ'' کا لفظ ہر ایک کے لئے اس بے تکلفی سے بولا اور لکھا جاتا ہے کہ گویا یہ کوئی باوقار لقب اور خطاب اور اس کا کوئی وزن اور احترام نہیں بلکہ یہ کوئی ہلدی کی گانٹھ، لہسن کی قاش یا دھنیے کی گٹھی ہے جو سبزی منڈی سے چار آٹھ آنے میں مل جاتی ہے سچ ہے ذوق مر جائے تو ہر بات غیر معتبر ہو جاتی ہے ہر ایک کے نام کے ساتھ علامہ لکھنے والے اور بقلم خود اپنے نام کے ساتھ یہ لاحقہ جمانے والے کیوں نہیں سوچتے کہ چلو ان کا تو کچھ نہیں بگڑتا لیکن علامہ اقبالؒ، علامہ شبلیؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی روحیں کس قدر بے قرار ہوتی ہوں گی؟

ہر بو الہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی

نجانے لوگوں کو از خود اپنے نام کے ساتھ القاب و خطابات لکھنے اور لکھوانے کا شوق کیوں ہے؟ یہ کوئی حیاتیاتی نقص ہے یا نفسیاتی پرابلم ہمارے کئی پیر صاحبان اپنی نگرانی میں اپنے القاب لکھواتے ہیں۔ مثلاً غوثِ زمان، زبدۃ العارفین، پیر طریقت، رہبر شریعت، ولی کامل وغیرہ، اسی طرح بعض مقررین کو اس کا بڑا لپکا ہوتا ہے ایک صاحب اپنے آپ کو "خطیبِ ارض وسما" کہلواتے ہیں۔ اب اللہ جانے اس کا کیا مطلب ہے؟ حالانکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گل لالہ بازار سے مہندی لے کر نہیں لگاتا اسکی حنابندی خود فطرت کرتی ہے۔ خوشبو خود بخود بکھرتی ہے اشتہار سے نہیں نکھرتی ،غالب کے لئے عمر بھر مسئلہ رہا کہ کوئی اس کا دیوان چھاپ دے مگر آج ادب کی دنیا میں اس کا سکہ رواں ہے کیا جس کے دس بیس دیوان چھپ گئے وہ بڑا شاعر ہے یا غالب؟ یہ سمجھنے میں کوئی دیر نہیں لگتی کالم کی طوالت کا خواف دامنگیر نہ ہوتو اس پرا پورا مقالہ قلمبند ہوسکتا ہے۔ میں بہت سے ایسے "علامہ صاحبان" کو جانتا ہوں اور میرے قارئین میں سے ہر ایک اپنے گردو پیش میں ایسے حضرات سے واقف ہوں گے کہ علامہ تو کہلواتے ہیں مگر خود اس کا تلفظ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ مثلاً بعض علامہ صاحبان وہ ہیں جو علم ادب، تحریر، تقریر کسی بھی شعبے میں کچھ نہیں بن سکے انہوں نے سوچا چلو علامہ ہی بن جاتے ہیں اور اپنے خیال میں شائد بن بھی گئے ہوں۔ بعض وہ ہیں جو روزانہ گھر سے سائیکل یا ویگن پر سوار ہو کر نکلتے ہیں راستے میں کسی دوست سے اپنا بیان لکھواتے ہیں اور اخبار کے دفتر میں استقبالیہ پر بڑی لجاجت سے اسے جمع کرواتے ہیں اور اگلے ایک دو دن میں سنگل کالمی خبر دیکھ کر یوں سمجھتے ہیں کہ وہ کوہ طور کی سیر کر کے آئے ہیں بعض علامہ صاحبان وہ ہیں جنہیں دوستوں نے نشانہ مذاق بناتے ہوئے علامہ کہنا شروع کر دیا اور وہ اس پر ڈٹ گئے بعض وہ ہیں جن کا خیال ہے کہ لوگ تو انہیں کبھی نہ علامہ کہیں گے اور نہ لکھیں گے کیوں نہ اس ناقدری زمانہ کا ماتم

کرتے ہوئے خود ہی علامہ بن جائیں شائد لوگوں کا بھی اس طرف دھیان جائے،
بعض ستم ظریف، علامہ صاحبان ایسے بھی ہیں جو ابھی ہیں تو زیر تعلیم لیکن حفظ ماتقدم
کے طور پر یہ لقب انہوں نے پہلے الاٹ کرالیا۔ بعض ایسے ہیں کہ جن کو تقریر کرنا بھی
نہیں آتی اور دو جملے ادا کرنا ان کے لئے قبروں کے حساب کتاب سے مشکل ہوتے
ہیں۔ مگر مائیک ہاتھ میں لے کر تصویر کھنچوانا نہیں بھولتے، اخبار سے کسی کو کیا پتہ چلے گا
کہ علامہ صاحب نے خطاب فرمایا تھا یا نہیں؟

بہر کیف یہ سارے لطائف نہیں حقائق ہیں اب ایسے میں اگر میں یہ دہائی
دوں یا گزارش کروں کہ آئندہ اقبال ؒ کو علامہ نہ لکھا جائے تو میں حق بجانب ہوں
کیا علامہ کے لفظ میں کوئی حرمت رہ گئی ہے کہ اقبالؒ جیسی پیکر علم و خرد اور مجسمہ فکر
و آگہی شخصیت کے ساتھ اب ''علامہ'' کا خطاب ضرور استعمال کیا جائے، اقبال آج
ہمارے درمیان ہوتے تو وہ خود یہی تجویز پیش کرتے اور فرماتے۔

جب سے دیکھا ہے کہ کم ظرف بھی ہیں جام بکف
مجھ کو پیمانہ اٹھانے سے حیا آتی ہے

''تجاہل عارفانہ''

چند سال اُدھر غالباً ۹۱ء کی بات ہے۔ الحمرا میں یوم اقبالؒ کی تقریب تھی اور اس دور میں نئے نئے منتخب ہونے والے وزیر اعلیٰ مرحوم غلام حیدر وائیں مہمان خصوصی تھے۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے خطاب کے دوران ذرا تلخ مگر طنز آمیز لہجے میں کہا۔

''ایک تو ملک میں مسلم لیگیں اس قدر بن گئی ہیں پتہ نہیں چلتا کہ اصلی مسلم لیگ ہے کون سی؟ جب وائیں صاحب کی باری آئی تو انہوں نے اس حیرت افزا سوال کا جواب اس طرح دیا کہ پورا ہال کھل کھلا اٹھا اور جسٹس صاحب بھی جھینپ گئے وائیں صاحب نے کہا'' جناب مسلم لیگ وہی ہے جس کو سینٹ کی نشست کے لئے آپ نے درخواست دے رکھی ہے کسی اور کو ابہام اور مغالطہ تو ہو سکتا ہے آپ کو کم از کم نہیں ہونا چاہیے۔

یہ بات مجھے سیدہ عابدہ حسین کی اس اخباری گفتگو سے یاد آئی جس میں انہوں نے کہا ہے کہ ''حیران ہوں نواز شریف اور شہباز شریف کیسے لیڈر بن گئے؟''

مجھے چونکہ سیاست رواں اور کسی ''رہبر دوراں'' سے کوئی دلچسپی نہیں اس لئے کسی کا حلیف اور حریف نہیں اور روز مرہ کے سیاسی بیانات کو کبھی اپنے ''سقراطی'' تجزیوں اور ''افلاطونی'' کالموں کا موضوع نہیں بناتا، لیکن بعض باتیں اس قدر مضحکہ

خیز اور تکدّر انگیز ہوتی ہیں کہ خواہ مخواہ غصہ آجاتا ہے اور خواہی نخواہی دماغ کا ناریل چٹخ جاتا ہے۔ بی بی عابدہ کے اس جملے کو پڑھ کر انہیں وہی کچھ کہا جا سکتا ہے جو مرحوم وائیں نے جسٹس جاوید اقبال کو کہا تھا، بی بی نواز شریف اور شہباز شریف اسی دن لیڈر بن گئے تھے جس دن آپ نے ان کو اپنا لیڈر مانا، ان سے امریکہ کی سفارت کا عہدہ قبول کیا قومی اسمبلی کا ٹکٹ مانگا اور ان کی کابینہ میں شمولیت کا فیصلہ کیا تھا نواز شریف اگر لیڈر نہ ہوتے تو محترمہ عابدہ جیسی پشتینی جاگیردار اور خاندانی سیاستدان ان کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا الیکشن کیوں لڑتیں؟ ان کے کہنے پر امریکہ کی سفیر کیوں بنیں۔ ان کی کابینہ میں شمولیت کیوں اختیار کرتیں اور بجلی چوری کے الزام میں کابینہ سے استعفیٰ (یا برطرفی) سے پہلے تک وہ مسلم لیگ اور نواز شریف کی پالیسیوں اور فیصلوں کی ہر فورم پر وضاحت اور ان کا دفاع اور پرچار کیوں کرتیں؟

ہم اس کے حق میں تو بالکل نہیں کہ کوئی سیاسی ورکر اپنے آپ کو کسی شخصیت کا ذاتی ملازم بنائے کسی سیاسی پارٹی کو اپنا دین و ایمان سمجھے اور کسی لیڈر کو قبلہ کعبہ قرار دے ڈالے لیکن اخلاقیات کا تقاضا یہ ہے کہ اختلاف پر یا اپنے لیڈر کے زیر عتاب آنے پر بات وہ کہے جو خدا لگتی بھی ہو اور دل لگتی بھی۔

بی بی صاحبہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''خاندانی سیاست نہیں چلنی چاہیے'' بلاشبہ یہ بات درست اور اصولی ہے مگر کیا خود عابدہ بی بی خاندانی سیاست کی سب سے بڑی نشانی نہیں۔ کیا کرنل عابد حسین کا سیاسی ورثہ بی بی کو منتقل نہیں ہوا؟ کیا وہ اسی حوالے سے سب سے پہلے پیپلز پارٹی میں سامنے نہیں آئیں؟ پنجاب اسمبلی کی ممبر اور ضلع کونسل کی چیئر پرسن نہیں بنیں؟ اور آگے نہیں بڑھیں؟ ہمارے ہاں سیاست ہے ہی خاندانی، یہ کون سی انوکھی اور نئی بات ہے اگر یہ بیماری نہ ہوتی تو آج کے نامور سیاسی سپوت ہر جماعت میں کہاں پائے جاتے؟ بے نظیر بھٹو سے لیکر بی بی عابدہ تک مخدوم

امین فہیم سے فاروق لغاری تک شاہ محمود قریشی سے جعفر اقبال گجر تک اور چوہدری شجاعت حسین سے لیکر اعجاز الحق اور حسن نواز تک بھی اسی ''ہنر'' کے شاہکار ہیں اور یہ کرشمے ابھی قوم کوئی برسوں تک دیکھنے پڑیں گے۔

ابھی سال گزشتہ کی بات ہے کہ بی بی کی صاحبزادی صغری امام ضلع کونسل جھنگ کی چیئر پرسن تھیں آخر کیوں؟ کیا پورے ضلع میں ان کے علاوہ کوئی سیاسی رہنما، کوئی اہل شخص اور کوئی قابل آدمی نہیں تھا؟ کیا صغریٰ بی بی اگر عابدہ بی بی کی نور چشم نہ ہوتیں تو پھر بھی ضلع کونسل کی سربراہ بن جاتیں۔ یہ سارے سوال خود اپنے اندر واضح جواب رکھتے ہیں کوئی تجاہل عارفانہ اور طوطا چشمی سے کام لے تو الگ بات ہے ورنہ ملک کا سیاسی شجرہ اور منظر نامہ بالکل واضح ہے سرمایہ و جاگیر خاندانی ورثہ اور برادری سسٹم اس ملک کی سیاست کے تین ستون ہیں اور اس عمارت کی تکمیل اور پختگی کیلئے چوتھا ستون حکومت مہیا کر دیتی ہے اور وہ ہے وزارت سفارت اور مشاورت، اس محل کا بھلا کوئی جھونپڑا کیا مقابلہ کرے گا؟

نواز شریف جس راستے سے سیاست میں آئے ہیں اسی راستے سے باقی بھی آئے ہیں۔ ہمارے نزدیک دونوں ایک ہی تصویر کے دورخ ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر ڈراؤنا اور بھیانک

طوفِ لیلائے وزارت پہ ہے موقوف حیات
کیا ضروری ہے کہ آئین وفا پر سوچیں
ہم نے جو کچھ بھی کیا خوب کیا، ٹھیک کیا
سوچنا کیا ہے جو سوچیں تو خلا پر سوچیں
ہاتھ آ جائے وزارت تو کہیں ''سب اچھا ہے''
بات رہ جائے تو پھر زلفِ دوتا پر سوچیں

تعلیمی نتیجہ......ایک خطرناک اشارہ

پنجاب یونیورسٹی نے بی اے بی ایس سی کے سالانہ امتحان ۲۰۰۰ء کے نتائج کا اعلان کر دیا۔ جس کے مطابق مجموعی طور پر ۲۷ فیصد امیدوار کامیاب اور ۷۳ فیصد ناکام ہوئے، ہمارے نزدیک نتائج کا یہ معیار بیک وقت حکومت، اساتذہ، والدین اور خود معاشرہ کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے اور موجودہ نتیجہ ایک خطرناک اشارہ اس میں ہمارے نظام تعلیم، یونیورسٹیوں اور کالجوں کے ماحول، اساتذہ کی تدریس میں عدم دلچسپی اور والدین کی غفلت کا کس قدر دخل ہے اس پر کسی تفصیلی بحث میں پڑے بغیر تین باتیں ایسی ہیں جو بنیادی قرار دی جا سکتی ہیں جن کے باعث ہماری سوسائٹی مجموعی طور پر اور نو جوان خصوصی طور پر علمی و تعلیمی رجحان سے گریز کا شکار ہیں۔ فلسفہ بگھارے اور منطق جھاڑے بغیر براہِ راست ان تینوں اسباب پر غور اور انہیں دور کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ تین اسباب یہ ہیں۔

اولاً: حکومت کی علم و تعلیم کے شعبے میں شدید حد تک عدم توجہی بلکہ اسے نظر انداز کرنے کی پالیسی۔

ثانیاً: گلیمر کلچر جو ہر حکومت کی سر پرستی میں اس قدر فروغ پذیر ہو رہا ہے کہ نو جوان پاگل پن کی حد تک اس کی جانب راغب ہو رہے ہیں۔

ثالثاً: اقدار حیات کی الٹی ترتیب اور پیسے کا معیار عزت قرار پانا ایران کی

افسانوی شہرت کے حامل فرمانروا ملک شاہ سلجوقی کے بارے میں آتا ہے کہ اس نے ایک بار اپنے وزیراعظم اور مشہور سیاسی مفکر نظام الملک طوسی سے تشویش آمیز انداز میں کہا کہ مجھے اطلاعات مل رہی ہیں کہ ملک کی سرحدوں پر خطرات بڑھ رہے ہیں اس صورتحال کا آپ فوری طور پر تدارک کریں اور منصوبہ بنا کر مجھے پیش کریں۔ چنانچہ نظام الملک نے چند روز بعد بادشاہ سے مل کر کہا جناب خطرات کے نمٹنے کی سکیم تو تیار ہے لیکن اس کے لئے پیسہ بہت درکار ہوگا۔ سلجوقی نے جواب میں کہا آپ پیسے کی فکر نہ کریں۔ اس کے لئے شاہی خزانہ بہت وسیع ہے چنانچہ نظام الملک نے حسب منشاء رقم لی اور ساری کی ساری رقم ملک بھر میں جگہ جگہ تعلیمی اداروں کے قیام پر صرف کر دی اور ملک شاہ سلجوقی کو جا کر بتایا بادشاہ معظم اب میں نے سلطنت کے اردگرد وہ حصار کھڑا کر دیا ہے جسے کوئی دشمن بھی ہرگز نہیں توڑ سکے گا۔ یہ محض افسانوی کتابی واعظانہ یا نکتہ ورانہ بات نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ علم سے بڑا ہتھیار علم سے زیادہ مضبوط حصا اور علم سے بڑھ کر محفوظ دفاع اور کوئی نہیں۔ طوسی کے دور میں پھر بھی جنگیں لوہے اور فولاد کے اسلحے سے لڑی جاتی تھیں مگر آج تو فتح و شکست کا سارا دار و مدار علم اور ٹیکنالوجی پر رہ گیا ہے مگر سلجوقی کی دور اندیشی اور مستقبل بینی کی داد دینی چاہیے کہ اسے کس دور میں کیا نکتہ سوجھا۔ ادھر ہماری حکومتوں کا عالم یہ رہا ہے کہ ہمارا تعلیمی بجٹ کبھی دو فیصد سے بڑھ نہیں پایا اس سے بڑھ کر عدم توجہی کیا ہو سکتی ہے؟ ہماری حکومتوں نے اپنی اس غفلت اور علم کش عادت کا ازالہ اس طرح کیا کہ بجائے اس کے کہ تعلیم کی شرح بڑھے انہوں نے تعلیم کی تعریف اس طرح بدل دی کہ کچھ خرچ کیے اور بجٹ بڑھائے بغیر قوم پڑھی لکھی شمار ہو، مثلاً جو دستخط کر سکتا ہے اسے بھی پڑھا لکھا شمار کیا جائے جو ناظرہ قرآن مجید پڑھا ہوا ہے وہ بھی پڑھے لکھوں میں گنا جائے اور جو نام نہاد تعلیم بالغاں سنٹر میں چار دن بیٹھا ہے اسے بھی تعلیم یافتہ لوگوں کا حصہ بنا دیا جائے

اور شرح تعلیم میں اضافہ کا اعلان کر دیا جائے۔ اس لئے ہمارے ہاں چارٹوں، نقشوں اور دفتری کاغذوں میں اب شرح تعلیم چالیس فیصد تک پہنچادی گئی ہے یہ تھا آسان، سستا اور بے تکلف حل، جو حکومتوں نے ڈھونڈ نکالا، حکومت کو لفظاً نہیں بلکہ عملاً جنگی بنیادوں پر فروغ تعلیم پر توجہ دینی چاہیے۔ بنگلہ دیش بھی ہم سے تعلیمی میدان میں بہت آگے ہو تو ہمیں اپنے گریبان میں ضرور جھانکنا چاہیے۔

تعلیمی میدان میں پسماندگی کا دوسرا سبب وہ گلیمر کلچر ہے جو ہر سطح پر فروغ پذیر ہے جس سے قدم قدم پر سابقہ پیش آتا ہے اور ٹی وی اسے ابھارنے اور دلوں میں اتارنے میں رات دن مصروف ہے۔ اشتہارات کے ذریعے ڈراموں کے ذریعے اور مختلف پروگراموں کے ذریعے حسن وعشق کی داستانیں، فلم اور کرکٹ کے سٹارز کے رنگین افسانے، مغربی تہذیب کی نظر فریب جھلکیاں، بنگلوں اور کوٹھیوں کے دیدہ زیب مناظر آرائش وزیبائش کے مقابلے، یہ ساری باتیں علم کے فروغ اور اس کی پرورش کے لئے زبردست مواقع ہیں۔ نوجوانوں کی ترغیب کا مرکز اور ہدف یہ رہ گیا ہے کہ وہ گلوکار بنیں، فلم ساز بنیں، باغوں اور پارکوں کی روشنیوں پر کسی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے نظر آئیں کرکٹ کھیلیں اور دیکھیں۔ پاپ میوزک سیکھیں تالیوں کی گونج میں اپنے فن کا مظاہرہ کریں اور بس، تعلیمی شوق اور رجحان کی کمی کی تیسری وجہ ہماری اقدار حیات کی الٹی ترتیب اور پیسہ کا معیار عزت قرار دیا جانا ہے۔ طاقت اور دولت کو ہم نے قریب قریب خدا کا درجہ دے دیا ہے۔ ایسے میں علم بیچارہ کہاں جگہ پا سکے گا؟ جس ملک اور سوسائٹی میں آٹھویں گریڈ کا تھانیدار ''چوہدری صاحب'' ہو اور جس گلی سے گزر جائے سناٹا چھا جائے اور اٹھارویں گریڈ کا پروفیسر ویگن میں سیٹ پر بیٹھنے کا حقدار بھی نہ ہو وہاں کسی کا علم حاصل کرنے کا شوق کیسے پروان چڑھے گا، جہاں چونگیوں کے ٹھیکیدار پجارو پر سوار ہوں وہاں کوئی اپنا مغز علم میں کیوں کھپائیگا؟ جس

ماحول میں دانشور، صحافی، مصنف اور معلم سب سے زیادہ تنگی اور بدحالی کا شکار ہوں وہاں کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ علم و تعلم کی طرف رجوع کرے۔

یونین کونسل سے لیکر قومی اسمبلی تک کا سارا سفر طاقت اور دولت کے پہیوں پر ہوتا ہے وہاں کوئی اپنے پاؤں میں علم کی زنجیر کیوں ڈالے گا؟

ہمارا معاشرہ اور ہمارا اقتدار آج عزت اور سہولت کو علم سے منسلک اور مشروط کر دے کل سے ہر ایک کے قدم درسگاہوں کی طرف اٹھتے اور بڑھتے نظر آئیں گے۔ کوئی ایم اے پاس جب اپنی ڈگری بغل میں داب کر بڑے لجاجت آمیز لہجے میں ملازمت کے لئے میونسپل کمیٹی کے ان پڑھ چیئرمین کے سامنے پیش ہوتا ہے اور اس کے عزیز و اقارب اور دوست احباب اسے اس حال میں دیکھتے ہیں تو آدھے سے زیادہ تعلیم کا شوق اسی لمحے دم توڑ دیتا ہے، یہ شوق آگے کیوں کر بڑھے گا؟

ہم سمجھتے ہیں کہ حکومت اگر ملک کو مضبوط، خوشحال اور معزز بنانا چاہتی ہے تو تمام شعبوں کے مقابلے میں تعلیمی شعبے پر سب سے زیادہ خزانے کی رقم خرچ کرے اور سوسائٹی اگر اپنے اندر علم کا فروغ چاہتی ہے تو وہ علم اور عالم کی عزت کرنا سیکھے اور بالخصوص حکومت اپنے ذرائع ابلاغ کو گلیمر کلچر کے بجائے ایجوکیشن کلچر ابھارنے کے لئے وقف کر دے۔ صرف ایک سال کی یہ شعوری مہم اگلے سال کے نتائج کو حیرت انگیز حد تک خوشگوار بنا سکتی ہے۔

نہیں یہ آپ نے اچھا نہیں کیا

پیری مریدی کے حلقے میں پیر اور مرید کے درمیان یہ فارمولا طے شدہ ہے کہ پیر صاحب کو اگر مرید گھر میں قدم رنجہ فرمانے کی درخواست کرے تو پیر صاحب پوچھتے ہیں ''کیا نذرانہ دو گے'' اور اگر مرید شریف باریابی کی اجازت چاہے تو کہا جاتا ہے'' کیا نذرانہ لے کر آؤ گے''۔ کچھ یہی معاملہ ہمارے سیاستدانوں اور امریکہ اور برطانیہ کے اعلیٰ افسروں اور حکمرانوں کا ہے یعنی ہم وہاں جائیں تو اپنے ہی دکھڑے سناتے ہیں اور اگر وہ یہاں آئیں تب بھی ہم اپنا ہی رونا پیٹتے ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ والے ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف والے میزبان ہوں تب بھی ہم اپنا دل کھول کر ان کے سامنے نذر کرتے ہیں اور اگر وہ مہمان بن کر آئیں تو بھی ہم اپنا ہی پیٹ ننگا کر کے دکھاتے ہیں۔ آخر کیوں؟ سیاسی اور سماجی مسائل ان کے بھی ہیں۔ علاقائی اور دفاعی ضروریات انہیں بھی لاحق ہیں لیکن وہ کبھی شکایات کا دفتر بغل میں داب کر ہمارے پاس نہیں آتے کہ اپنوں کے خلاف ایف آئی آر درج کرائیں اور نہ کبھی وہ ہمیں اپنے پاس بلا کر اپنا قصہ درد سناتے ہیں، صاف گوئی پر معذرت خواہ ہوں (دل سے نہیں محض رسمی طور پر) کہ ہم لاکھ مونچھوں پر تاؤ دیں لاکھ کلف لگا طرہ پہنیں، لاکھ بڑھکوں سے رعب جمائیں اور کام چلائیں ہم (حکمران اور سیاستدان) اپنا آقائے ولی نعمت بہر حال برطانیہ اور امریکہ کو سمجھتے ہیں یہ مخمصہ اب ختم ہونا چاہیے یا تو ہمیں سیدھے بھاؤ

ان کی برتری تسلیم کر کے اپنی چمڑی بچانی چاہیے یا پھر اپنی صلیب اپنے ہی کندھوں پر ڈال کر باہر نکل آنا چاہیے کیا آپ سیخ بن کر ہر پہلو کروٹیں بدلنے سے زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے حال ہی میں دولت مشترکہ کے سیکرٹری جنرل ڈونلڈ میکنن نے پاکستان کا دورہ کیا اور حکمرانوں کے علاوہ انہوں نے سیاستدانوں سے بھی ملاقات کی، ان سے جی ڈی اے کے وفد نے نواب زادہ نصر اللہ کی قیادت میں ملاقات کی جس میں مخدوم امین فہیم، اسفند یار ولی اور شیخ آفتاب شامل تھے، مسلم لیگ کا وفد بھی ان سے ملاقات کرنے گیا جس میں راجہ ظفر الحق، الٰہی بخش سومرو، سرانجام خان، سرتاج عزیز، سردار یعقوب ناصر اور ظفر علی شاہ شامل تھے، جماعت اسلامی کا وفد پروفیسر غفور احمد لیاقت بلوچ اور خالد الرحمٰن پر مشتمل تھا، بیگم کلثوم نواز بھی اپنی بہو کے ہمراہ ان سے ملیں اور پیپلز پارٹی کے رضا ربانی بھی الگ سے مسٹر میکنن سے ملنے گئے، اخباری رپورٹ کے مطابق جی ڈی اے کے وفد نے ان سے بحالی جمہوریت اور بلدیاتی انتخابات کے بجائے عام انتخابات کرانے کیلئے دباؤ ڈالنے اور تعاون کرنے کی درخواست کی، جماعت اسلامی نے پاکستان کی دولت مشترکہ میں واپسی بھارت کی رکنیت منسوخ کرنے اور کشمیر کا مسئلہ سلجھانے کی بات کی، مسلم لیگ والوں نے نواز شریف سے حکومت کے ناروا سلوک کی شکایت اور انسانی حقوق کی بات کی، متحدہ قومی موومنٹ کے شیخ آفتاب نے منصفانہ احتساب اور فوری بحالی جمہوریت پر گفتگو کی، پیپلز پارٹی کے رضا ربانی نے بھی احتساب اور جمہوریت کو اپنا موضوع سخن بنایا سوال یہ ہے کہ یہ ملاقات کس کی درخواست پر ہوئی؟ میکنن نے ملنا چاہا یا ہمارے زعمائے سیاست نے؟ اگر تو شوقِ ملاقات میکنن کو تھا تو پھر وہ کوئی اپنا مسئلہ بتاتے، اور ہمارے سیاستدان اس پر غور کا وعدہ کرتے، اگر درخواست ملاقات ہمارے سیاستدانوں نے پیش کی تو انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ آخر اس شوق اور بیتابی کا سبب کیا تھا؟

بحالی جمہوریت، منصفانہ احتساب، بلدیاتی یا عام انتخابات، انسانی حقوق وغیرہ یہ ہمارے اندرونی مسائل ہیں۔ میکئن کا ان سے کیا تعلق؟ نہ کہ بابا جمہوریت ہیں نہ محتسب اعلیٰ نہ چیف الیکشن کمیشن اور نہ انسانی حقوق کے خدائی فوجدار، ان سے فریاد چہ معنی دارد؟ رہ گیا مسئلہ کشمیر تو برطانیہ یا میکئن کیوں حل کرے؟ اس نے یہ مسئلہ آج سے ترپن سال پہلے اس لئے تو انہیں الجھایا تھا کہ وہ بعد میں اسے سلجھا دے گا۔

قبل ازیں کالا باغ ڈیم کے حوالے سے محترمہ بے نظیر ورلڈ بینک کو ایک انتباہی خط لکھ چکی ہیں کہ وہ اس کی تعمیر کے لئے پاکستان کو فنڈ مہیا نہ کرے کیونکہ موجودہ حکومت غیر جمہوری ہے کالا باغ ڈیم کوئی ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی ہے کہ جنرل پرویز جب حکومت سے واپس جائیں گے تو اسے ہاتھ میں پکڑ اور جیب میں ڈال کر چلے جائیں گے؟ اس طرح کی عالمی اداروں کے نام خطوط بازی، میاں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو پہلے بھی کرتی رہی ہیں جو کسی بھی اعتبار سے قابل رشک نہیں۔

مولانا مودودی جب ایک بار سعودی عرب گئے اور وہاں ان سے پاکستانی سیاست کے بارے میں سوال و جواب کیا گیا تو مولانا نے اس وقت کی حکومت سے شدید سیاسی اختلاف کے باوجود بڑی متانت اور ملائمت سے جواب دیا میں پاکستان کے معاملات کراچی کی بندرگاہ پر چھوڑ آیا ہوں واپس جا کر سنبھال لوں گا۔

۷۸ء میں مرحوم مفتی محمود جب دیو بند کے سو سالہ جشن میں شرکت کے لئے بھارت گئے تو وہاں کے صحافیوں نے انہیں گھیر لیا اور پاکستان میں لگنے والے مارشل لاء کے بارے میں کھوج کرید کرنے لگے۔ مگر مفتی صاحب نے جواب دیا "پاکستان کا مسئلہ پاکستان کی سرزمین پر زیر بحث آتا ہے یہ بھارت کی سرزمین ہے۔

یہ وہ ذمہ دارانہ طرز عمل ہے جسے ہمارے حکمرانوں اور سیاستدانوں کے شایان

شان کہا جا سکتا ہے۔ مگر امریکہ جا کر دکھڑے سنانا اور برطانیہ سے آئے ہوئے لوگوں کے آگے اپنی لاج گنوانا کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ کیا کبھی امریکہ نے اپنے الیکشن کے حوالے سے ہم سے مشورہ مانگا ہے؟ پچھلے سال جب کلنٹن مونیکا کیس میں الجھے انہوں نے آ کر ہمیں بریف کیا تھا؟ کبھی آئر لینڈ کے مسئلے پر برطانیہ نے ہم سے مدد مانگی ہے؟ کیا مغربی اور مشرقی جرمنی نے اتحاد کرتے وقت ہمیں اعتماد میں لیا تھا؟ کیا امریکہ کی سیاسی پارٹیوں نے الگور اور بش کو صدارتی امیدوار بناتے ہوئے ہم سے رائے لی ہے؟ آخر ہمیں اپنے ہر مسئلے میں ان سے مشاورت اور معاونت حاصل کرنے کی کیا پڑی ہے؟ اگر تو یہ معاملہ دوطرفہ ہو تو کوئی حرج نہیں مگر ہمیشہ یکطرفہ نیاز مندی آداب و اخلاق میں شمار نہیں ہوتی ذہنی و سیاسی افلاس کا پتہ دیتی ہے۔ بین الاقوامی وفود آتے رہتے ہیں۔ حکومتی نمائندے ان سے ملتے رہتے ہیں۔ جھوٹ سچ کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ اور سفارتی زبان میں غلط ملط پیغامات کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ انہی کا کام ہے وہ کرتے رہیں، اول تو حکمرانوں کو بھی زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے معاملات میں دوسروں کو دخل دینے کا موقع دیں لیکن یہ سیاستدانوں کے منصب کے تو بالکل منافی ہے انہیں کیا مجبوری لاحق ہے کہ اپنا کچا چٹھا کھولتے پھریں۔؟

جناب احسن اقبال کا سات نکاتی ایجنڈا

کونسل آف نیشنل افیر ز ایک غیر سرکاری ''تھینک ٹینک'' کے طور پر سیاسی وصحافتی حلقوں میں خاصی معروف ہے۔ اس کے گذشتہ چار سال سے مسلسل ہونے والے ہفتہ وار اجلاس کافی اہمیت اور کشش اختیار کر گئے ہیں ملک کی شائد ہی کوئی اہم سیاسی، علمی اور سماجی شخصیت ہو جو اس فورم پر آ کر اظہار خیال نہ کر چکی ہو۔ رواں اجلاس (جمعہ) کے مہمان خصوصی مسلم لیگ کے نئے نامزد ہونے والے چیف آرگنائزر جناب احسن اقبال تھے، احسن اقبال ایک نیک نام اور معزز خانوادے کے فرد اور طبعاً خوش خوش شخص ہیں زمانہ طالب علمی میں وہ انجینیر نگ یونیورسٹی کی سٹوڈنٹس یونین کے صدر رہے اور بعد ازاں اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ چلے گئے ان کی والدہ محترمہ آپا نثار فاطمہ جنرل ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ اور بعد ازاں قومی اسمبلی کی رکن رہیں۔ احسن اقبال سفر کرتے کرتے مسلم لیگ میں جا پہنچے اور جناب نواز شریف کی نظروں میں جچ گئے، یوں وہ پچھلی حکومت میں منصوبہ بندی کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین اور پروگرام ۲۰۱۰ء کے چیف کوآرڈی نیٹر بن گئے، حال میں مسلم لیگ کے اندر برپا ہونے والی رسہ کشی اور کشمکش میں وہ ایک بار پھر فرنٹ لائن پر آ گئے ہیں اور آج کل اخباروں میں بہت نمایاں جگہ پا رہے ہیں۔ ملکی صورتحال اور مسلم لیگ کے تازہ ترین احوال جاننے کے لئے سی این اے نے انہیں مہمان کے طور پر اپنے ہاں مدعو کیا، اگرچہ آغاز کلام انہوں نے بہت سی ''آف دی ریکارڈ'' باتوں سے کیا تاہم اس کے بعد وہ کھل کر بولے راقم نے انہیں اظہار خیال کی دعوت دی تو انہوں نے حسب توقع

مسلم لیگ کے اندرونی خلفشار سے پہلے موجودہ حکومت کے خلاف اپنی بھڑاس نکالی،
ان کا کہنا تھا کہ موجودہ فوجی حکومت دس ماہ کے اندر اندر اپنے زوردار اور دھما کہ خیز
سات نکاتی ایجنڈے کے ایک ایک نکتے سے بتدریج پسپا ہو چکی ہے، احتساب ایک
سوالیہ نشان بن چکا ہے۔ ڈوبی ہوئی رقم کی واپسی کا عالم یہ ہے کہ شروع شروع میں بتایا
گیا کہ سیاستدان ڈھائی کھرب روپے کا قومی سرمایہ لوٹ گئے اور دبا کر بیٹھ گئے لیکن
بعد ازاں جنرل صاحب نے ایک پریس کانفرنس کے دوران بڑے ''ہولے'' سے
انداز میں وزیر خزانہ شوکت عزیز سے کہلوا دیا کہ یہ رقم دراصل ڈھائی کھرب نہیں بلکہ
اکانوے ارب روپے تھی اور اس میں سے بھی دس ماہ میں بمشکل دس ارب روپے
وصول ہو سکی ہے۔ لیکن خوف و ہراس اور نعرہ بازی کے نتیجے میں بقول احسن اقبال بیس
ارب ڈالر سرمایہ ملک سے پرواز کر گیا ہے یہ وہ خسارہ ہے جو برسوں تک ملک ادا نہیں
کر پائیگا۔ حکومتی ایجنڈے میں وفاق کی مضبوطی ایک اہم نکتہ تھا مگر صورت یہ ہے کہ
صوبائی حقوق کے مسئلے پر اس عرصے میں دو گورنر مستعفی ہو چکے ہیں یعنی سندھ کے داؤ
پوتا اور سرحد کے جنرل شفیق اس سے فیڈریشن کے تعلقات کار ہیں مضبوطی کی بجائے
کمزوری کا تاثر سامنے آیا۔ حکومت کے سات نکاتی ایجنڈے میں معیشت کی بحالی
سرفہرست تھی لیکن اس میدان میں بھی پیش رفت کی بجائے پسپائی ہوئی ہے۔ ان کا
کہنا تھا کہ حکومت نے بڑی مشکلوں سے قومی پیداواری شرح سات فیصد تک پہنچائی
تھی وہ اب گر کر صفر پر آ گئی ہے ہمارے دور میں زرمبادلہ کے ذخائر تقریباً سوا ارب
ڈالر تھے اس وقت صرف ستر کروڑ ڈالر ہیں یعنی اضافے کی بجائے کمی واقع ہوئی ہے۔
جناب احسن اقبال بڑے تسلسل اور روانی سے بول رہے تھے اگرچہ وہ پیشے
کے لحاظ سے وکیل نہیں لیکن ان کا انداز استدلال ایک ماہر وکیل کا لگ رہا تھا شائد اسی
لئے نواز شریف نے اب انہیں مسلم لیگ کی وکالت کا فریضہ سونپا ہے۔ انہوں نے اس
تاثر کو ہر فوجی انقلاب کی حکمت عملی کا حصہ اور شاخسانہ قرار دیا کہ سیاستدان ایک

کرپٹ مخلوق کا نام ہے یہی وجہ ہے کہ ایوب خان، ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف کی تقریروں میں ایک خاص قسم کی یکسانیت اور مماثلت نظر آتی ہے وہ کہہ رہے تھے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ بھارت، مالدیپ، سری لنکا میں تو جمہوریت چل سکتی ہے مگر پاکستان میں نہیں؟ کیا بھارت میں کرپشن نہیں؟ سری لنکا میں برسوں سے خانہ جنگی نہیں؟ مالدیپ آخر دنیا کے نقشے پر کتنی جگہ گھیرتا ہے ان کے خیال میں مسئلہ کرپشن نہیں، بلکہ قومی پالیسیوں کا عدم تسلسل اور سیاسی عدم استحکام ہے جس ملک کے ۵۳ سالوں میں سے ۲۴ برس مارشل لاء رہے وہاں جمہوریت کیسے پروان چڑھ سکتی ہے اگر قومی پالیسیوں اور سیاسی و جمہوری اداروں میں تسلسل اور استحکام رہے تو قومی شرح نمو میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور معیشت بتدریج مضبوط ہوتی ہے۔ ایسے میں کرپشن ہو بھی تو کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوتا انہوں نے دو تین دوست ممالک کے نام (آف دی ریکارڈ) لے کر کہا کہ وہاں بہت کچھ ہوتا ہے اور ٹرانسپریینسی انٹرنیشنل کی رپورٹوں میں وہ بہت سرفہرست میں مگر ہر سال ان کی قومی شرح پیداوار بڑھ اور ان کی معیشت جڑ پکڑ رہی ہے۔ یہ تو ملکی صورتحال پر ان کی گفتگو کا خلاصہ تھا جب وہ مسلم لیگ پر آئے تو بھی اسی روانی سے محو گفتار ہوئے، احسن اقبال بتا رہے تھے کہ نواز شریف ایک انسان اور مسلم لیگ انسانوں کی ایک جماعت کا نام ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ لیڈر اور جماعت دونوں سے غلطیاں سرزد ہونے کا نہ صرف امکان ہے بلکہ ایسا ہوا اور مجھے انہیں Defend کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں تاہم میرے نزدیک اصل مسئلہ بیلنس شیٹ کا ہے میزانیہ بتاتا ہے کہ شر کے مقابلے میں خیر کا غلبہ ہے اس لئے میں مسلم لیگ اور اس کے لیڈر کا دفاع کرتا ہوں، انہوں نے برملا کہا کہ سپریم کورٹ پر حملے کا کسی پہلو سے دفاع ممکن نہیں لیکن لوگوں کو چیف جسٹس سجاد علی شاہ کا طرز عمل بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ جب نواز شریف بطور وزیر اعظم خود عدالت میں حاضر ہوئے تو ان کے وکیل ایس ایم ظفر نے فاضل عدالت سے کہا جناب آپ

سندھ کے باسی ہیں جہاں کی روایت ہے کہ قاتل بھی چل کر آ جائے تو اسے معاف کر دیا جاتا ہے نواز شریف تو بہر حال وزیر اعظم ہیں اس پر چیف جسٹس نے کہا۔

"نہیں یہ خود نہیں آئے میرے جاری کردہ سمن انہیں لے آئے ہیں میں ٹھونک بجا کر ہر معاملہ دیکھوں گا۔"

مسلم لیگ کے موجود خلفشار پر احسن اقبال کا نقطہ نظر تھا کہ ۲۰ جولائی کے اجلاس میں متفقہ طور پر نواز شریف کو صدر تسلیم کیا گیا اس کے بعد نئے مطالبے ہر اعتبار سے غیر جمہوری اور غیر اخلاقی ہیں رہ گیا حالیہ آرڈی نینس تو اس کو ہم کیا ملک کی کسی پارٹی نے تسلیم نہیں کیا۔ جناب ارشاد احمد عارف، ڈاکٹر انور سدید، ملک اختر جاوید اور کونسل کے چیئرمین غلام مصطفیٰ میرانی کے کڑوے کسیلے سوالوں کا بھی احسن اقبال نے بڑی بے تکلفی سے سامنا کیا۔ جو خاص طور پر مسلم لیگ کے اقتدار کی پیداوار ہونے، آئین کی چودھویں ترمیم، نواز شریف کے فیصلہ طرز عمل اور سیف الرحمٰن کے احتساب بیورو سے متعلق تھے۔ جناب احسن اقبال نے گفتگو کے آخر میں کہا کہ میرے نزدیک ایک نئے پولیٹکل آرڈر کی ضرورت ہے اور تمام مقتدر سیاسی جماعتیں اسے ایک ڈیکلریشن اور چارٹر کے طور پر تسلیم کریں اور سابقہ غلطیوں کے ازالے کے لئے اس پر کار بند رہنے کا عزم کریں تاکہ جمہوری عمل پر بار بار شبخون مارے جانے کا سلسلہ ختم ہو اور پاکستان کا جمہوری چہرہ گرد سے صاف ہو سکے۔ انہوں نے اعتراف کے لہجے میں کہا کہ ہماری جماعت سمیت سیاسی جماعتوں نے سیاسی عمل کو مستحکم کرنے میں ذمہ دارانہ انداز نہیں اپنایا جو اپنانا چاہیے تھا۔

انہوں نے سات نکاتی پولیٹکل آرڈر کے ضمن میں کہا کہ یہ باتیں اس ایجنڈے کی بنیاد بن سکتی اور اتفاق رائے حاصل کر سکتی ہیں۔

☆ سیاسی جماعتیں اپنے اندر برداشت اور رواداری پیدا کریں اور ایک دوسرے پر

فتوے داغنے سے گریز کریں۔

☆ ہر سیاسی جماعت قانون کی بالا دستی کو اپنا ماٹو بنائے۔

☆ حکومت ملنے پر ''گڈ گورننس'' کا اہتمام کرے۔

☆ قومی پالیسیوں میں آئے روز تبدیلیوں کے بجائے ان میں استحکام اور تسلسل کا عہد کرے۔

☆ سیاسی اداروں کی مضبوطی کو اپنا سیاسی ایمان قرار دے۔

☆ آزادی اظہار کی ہر مرحلے پر ضمانت دے۔

☆ درمیانی طبقے کو اپنی صفوں میں نمایاں مقام اور جگہ دینے کا پروگرام وضع کرے یہ تو تھا جناب احسن اقبال کا نقطہ نظر جو بڑا مفصل تھا مگر اجمالاً سامنے لا سکا ہوں مگر قوم کا ہر سوال ابھی تک تشنہ جواب ہے۔ ان سوالوں میں چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ ہماری سیاسی جماعتیں اقتدار کے اندر اور اقتدار سے باہر دوہرے معیار کیوں اپناتی ہیں؟

۲۔ لوٹ مار ڈھائی کھرب کی ہے یا ۹۱ ارب کی آخر ہوئی تو ہے آخر اس کا ذمہ دار کون ہے؟

۳۔ ہر دور میں فوج کے ہاتھوں حکومتیں گرانے اور اٹھانے میں کندھا کون لوگ پیش کرتے رہے؟

۴۔ ہر بار...... گا، گے گی،...... سے کام چلایا جاتا ہے ماضی اور حال کی بات کیوں نہیں ہوتی۔؟

۵۔ ملک روز بروز غریب اور لیڈر امیر کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟

۶۔ سیاسی جماعتوں کو متفقہ ضابطہ اخلاق کی پابندی سے کس نے روکا ہوا ہے؟

قاضی صاحب کا دوٹوک موقف

گذشتہ برس کی طرح اس سال بھی جولائی کا مہینہ پاکستان کے لئے موسمی گرمی کیساتھ ساتھ سیاسی گرمی کے حوالے سے بہت اہم رہا، پچھلے سال ۴ جولائی کو کارگل ایکشن کے پس منظر میں۔ "معاہدہ واشنگٹن" پاکستان کے سیاسی صحافتی اور حکومتی حلقوں میں ہلچل کا باعث بنا اور امسال ۴ جولائی کو مقبوضہ کشمیر کی سب سے قدیم منظم ترین اور خالصتاً مقامی جہادی تحریک "حزب المجاہدین" کے اندرون کشمیر آپریشنل کمانڈر عبدالمجید ڈار کا اعلانِ جنگ بہت ہی حیرت کا موجب ثابت ہوا۔

۴ جولائی ۹۹ کا معاہدہ تو اپنے نتائج و اثرات دکھا چکا ہے اب ۲۴ جولائی ۲۰۰۰ کا اعلان کیا برگ و بر لاتا ہے اس کا ابھی انتظار ہے، یہ فرق البتہ موجود ہے کہ پچھلے سال سول حکومت تھی اور اب کی بار فوجی حکومت

حزب المجاہدین کے اعلان جنگ بندی کی "ٹائمنگ" اپنے دامن میں بڑی پراسراریت رکھتی اور ذہن میں سوالات ابھارتی ہے حزب کے اندرون کشمیر آپریشنل کمانڈر عبدالمجید ڈار نے اس وقت اچانک اور یک طرفہ اعلان جنگ بندی کیا جب جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد اپنے ایک ماہ کے دورہ امریکہ کے آخری مرحلے میں تھے بلکہ ایک آدھ روز بعد وہ وطن واپس لوٹنے والے تھے۔ قاضی صاحب کے دورہ امریکہ کی خبریں یہاں کے اخبارات میں بہت نمایاں انداز میں شائع ہو رہی

تھیں اور امریکہ کے اعلیٰ احکام اور مختلف تھنک ٹینک سے ان کے مذاکرات اور خطابات کو یہاں بڑی حیرت ،دلچسپی اور اہمیت کیساتھ دیکھا اور پڑھا جا رہا تھا ، پاکستانی پریس میں اس دورے کے حوالے سے جماعت اسلامی کے آئندہ سیاسی کردار اور پاکستانی سیاست میں قاضی صاحب کی شخصیت کے ابھار پر تبصرے کالم اور تجزیے آنے شروع ہو گئے تھے اگرچہ مختلف اطراف اور حلقوں سے بعض شکوک وشبہات کا اظہار ہو رہا تھا اور دور کی کوڑی لانیوالے'' مبصر'' اور In side story سے بزعم خویش ہمیشہ آگاہ رہنے کا دعوی کرنے والے'' تجزیہ نگار'' الفاظ وحروف کی چاند ماری کر رہے تھے بایں ہمہ اس دورے کو بھرپور کوریج مل رہی تھی لیکن آخری مرحلے بلکہ آخری لمحوں میں حزب المجاہدین کے دھماکہ خیز اعلان نے افواہوں اور تبصروں کا ایک طوفان برپا کر دیا، اس قدر غبار اٹھا کہ اس میں جماعت اسلامی اور قاضی صاحب کے گم ہونے کا خدشہ پیدا ہو چلا تھا اور قریب تھا کہ قاضی حسین احمد لاہور ایئر پورٹ پر اس طرح اترتے جیسے میاں نواز شریف معاہدہ واشنگٹن کے بعد آئے تھے رات کا وقت ہو کا عالم، میاں صاحب پریشان مضطرب اور بیزار، چہار طرف سیکیورٹی نہ جماعتی لیڈروں سے ملاقات اور نہ صحافیوں سے ملاقات، ایک عالم تنہائی تھا اور ایک منظر شام غریباں مگر قاضی صاحب نے اس دھند کو کافی حد تک نیو یارک میں دور کر دیا اور بچی کھچی گرد لاہور پہنچ کر بٹھا دی نہ ان کے چہرے پر کوئی اضطراب تھا نہ ماتھے پر عرق ندامت، نہ آنکھیں وحشت زدہ نہ گردن خمیدہ، نہ لہجہ اکھڑا ہوا اور نہ الفاظ بے ربط و بے ترتیب، اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ حزب المجاہدین کا فیصلہ خود اس کا تھا اس کے پیچھے جماعت اسلامی کی کوئی خفیہ مشاورت اور اجازت اور امریکہ کے ساتھ قاضی صاحب کی خصوصی مصاحبت کارفرما نہ تھی، البتہ قاضی صاحب کے چہرے پر کرب کے آثار اور حزنیت کے نقوش ضرور تھے اور وہ بار بار کہہ رہے

تھے کہ حزب اور اس کے سپریم کمانڈر کو ہم سے مشورہ ضرور کرنا چاہیے تھا اس لئے کہ حزب کے چمن کے سارے بوٹوں کو ہم نے خون دے کر سینچا ہے انہوں نے بار بار حزب المجاہدین کو فریب خودگی، خوش فہمی، اور جلد بازی کا طعنہ دیا جسے اگرچہ سخت کہا جاسکتا ہے لیکن اس سے جماعت اور اس کے امیر کے دوٹوک موقف کا بخوبی اظہار ہوتا ہے کہ وہ آزادی کشمیر کے حوالے سے کسی سازش اور ڈیلنگ کا حصہ نہیں۔ ۲۹ جولائی کے خطبہ جمعۃ المبارک میں قاضی صاحب بہت جذباتی ہوگئے اور کہہ اٹھے۔

"خدا مجھے اس دن کے لئے زندہ نہ رکھے جب میں کبھی قومی مقاصد پر ذاتی یا جماعتی سمجھوتہ کروں۔ خانہ خدا میں اور منبر رسولؐ پر بیٹھ کر یہ جملہ وہی شخص ادا کرسکتا ہے۔ جس کے ضمیر اور زبان میں فاصلہ نہ ہو جس کے قول اور عمل میں تضاد نہ ہو اور جسے قوم اور خدا کے سامنے جواب دہ ہونیکا احساس ہو یہ تقریر کوئی ڈپلومیٹک اور رسمی نہیں تھی بلکہ خطبہ جمعہ تھا، ۳۱ جولائی (اتوار) کو جماعت کی لاہور شاخ نے منصورہ میں ایک مرکزی اجتماع کا اہتمام کیا، میں وہاں اس غرض سے حاضر ہوا کہ لفظ و حروف دل کی بات اس طرح ادا نہیں کر پاتے جس طرح انسان کا لہجہ چہرے کا تاثر اور کلام کا دروبست ادا کر پاتا ہے چنانچہ میں نے قاضی صاحب کے بہت قریب بیٹھ کر انکی تقریر سنی ان کے ہونٹوں کی جنبش نوٹ کی ان کی آنکھوں کے اشارے غور سے دیکھے چہرے پر ابھرنے والے آثار و تاثرات کا جائزہ لیا اور لہجے کی محکمی اور جملوں کی پختگی کا اندازہ لگایا تو وہ وسوسے اور خدشے حباب کی طرح تحلیل ہوتے چلے گئے جو دل و دماغ کے محیط میں کچھ دنوں سے ابھر رہے تھے۔

قاضی صاحب خود بھی کہہ رہے تھے اور اب بہت سے لوگوں کا یہ احساس ہے کہ حزب المجاہدین کے اس فیصلے کو حکومت کی تائید اور مشاورت حاصل ہے اور ٹائمنگ سیٹ کرنے والا معاملہ حکومت کا ہے تاکہ قاضی صاحب کے دورہ امریکہ کے اثرات

کسی قدر زائل ہوسکیں۔ اس معاملہ میں قاضی صاحب کے دوٹوک موقف سے اگرچہ بہت یکسوئی حاصل ہوئی ہے تاہم میری رائے میں کچھ باتیں توجہ طلب ہیں۔

ایک تو یہ کہ حزب المجاہدین پر تنقید کو سخت نہیں ہونا چاہیے اس لئے کہ یہ تنظیم باہر کی نہیں خالصتاً کشمیر کے اندر کی ہے اس لئے وہ وہاں کے حالات واحساسات کا ہم سب سے زیادہ ادراک رکھتی ہے سید صلاح الدین نے بھی حکمت سے کام لے کر اپنے آپریشنل کمانڈر کے فیصلے کو مانا کیونکہ یہ بہرحال کشمیر کے اندر نہیں رہتے۔ نیز اب مقبوضہ کشمیر کی جماعت اسلامی نے بھی حزب کے اعلانِ جنگ بندی اور مذاکراتی فیصلے کی تائید کی ہے جو بہت اہم اور غور طلب ہے۔

دوسرے یہ کہ جب حریت کانفرنس اور دنیا بھر کی اقوام کا موقف یہی ہے کہ مسئلہ کشمیر مذاکرات کے ذریعے حل کیا جائے تو مذاکرات کی خواہش یا امکان کو کوئی دوسرا مفہوم دینے کی چنداں ضرورت نہیں اگر یہ حزب کی خوش فہمی ہے تو جلد دور ہو جائے گی۔

تیسرے یہ کہ اگر حزب المجاہدین کی بات دیوار کے ساتھ لگ گئی یا لگا دی گئی اور اسے Discradit کر دیا گیا تو کئی پہلوؤں سے سفارتی محاذ پر بھارت کو فوقیت حاصل ہو جائے گی کیوں کہ پھر جہاد کی تحریک اندرونی تحریک کی بجائے بیرونی مداخلت قرار پاسکتی ہے جو عالمی سطح پر بہت سے مسائل کھڑے کر سکتی ہے۔ حکمت اور سیاست اس کا نام ہے کہ سانپ مر جائے مگر لاٹھی نہ ٹوٹے۔

سرپرائز پالیسی

فوج کی تربیت اور طریق کار کا ایک اہم حصہ ''سرپرائز'' ہوتا ہے فوج چونکہ جنگ اور دفاع کے لئے ہوتی ہے اور اس کی ساری پیشہ ورانہ سرگرمیاں حرب وضرب کے حوالے سے ہوتی ہیں اور حرب وضرب بذات خود ایک سرپرائز ہے حدیث نبویؐ میں بھی جنگ کو یہی نام دیا گیا ہے یعنی ''الحربُ خدعۃ''

موجودہ فوجی حکومت اپنے اسلوبِ حکومت میں پیشہ ورانہ تربیت کے پس منظر میں سرپرائز پالیسی پر عمل پیرا دکھائی دیتی ہے، خاص طور پر اس کی سیاسی پالیسی مکمل طور پر سرپرائز کی آئینہ دار ہے۔

گذشتہ برس ۱۲ اکتوبر کو حکومت تو تحلیل کر دی گئی مگر سینٹ قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیاں معطل اور معلق چلی آرہی ہیں۔ ابتدائی دو چار روز تو خیر تعطل کا جواز فراہم کر رہے تھے مگر اب تو دس ماہ ہو چکے ہیں مگر اسمبلیوں کا مقدر ابھی تک غیر واضح اور پراسرار ہے۔ حالانکہ حکومت اپنا قومی ایجنڈا دے چکی ہے، بلدیاتی نظام کا خاکہ پیش کر چکی ہے۔ ضلعی حکومتوں کے تصور کو عملی شکل دینے کی تیاریوں میں مصروف ہے اور بعد ازاں قومی سطح کے انتخابات کا عندیہ اور وعدہ بھی کر چکی ہے مگر با ایں ہمہ اسمبلیوں کے حوالے سے پراسرار اور معماتی رویہ بدستور قائم ہے۔ بعض سیاستدان یا چیف ایگزیکٹو کے ملاقاتی اگر باہر آکر بیان دیتے ہیں کہ حکومت معطل

اسمبلیوں کی بحالی کا ارادہ رکھتی ہے تو ٹھیک دوسرے روز بڑی وضاحت صراحت اور قطعیت کیساتھ حکومتی ترجمان بتاتے ہیں کہ اسمبلیوں کی بحالی کا منصوبہ زیر غور تو کیا خارج از قیاس ہے لیکن اس کے باوجود اسمبلیاں معطل چلی آ رہی ہیں۔ تحلیل نہیں ہوئیں کیا کوئی آئینی رکاوٹ ہے؟ حالانکہ پی سی او کے بعد ایسی کسی رکاوٹ کا کوئی تصور نہیں کیا اسمبلیوں کی موجودہ پوزیشن کل کلاں کسی سیاسی سودا کاری کے کام آ سکتی ہے؟ اگر یہ بات ہے تو ایسا اقدام نہ حکومت کے لئے مفید ہے نہ سیاسی تطہیر کے عزم اور پروگرام سے اس کو کوئی مناسبت ہے اور نہ یہ ملک وقوم کے لئے کوئی ثمر آور بات ہے۔ لگتا ہے یہاں بھی ''سرپرائز'' کار فرما ہے تاکہ سیاستدان یکسو نہ ہونے پائیں کچھ کو آس رہے کچھ پرامید رہیں کچھ گومگو میں رہیں اور کچھ دائیں بائیں نہ جائیں اور موزوں وقت پر اس راز سے پردہ اٹھا کر سب کو ششدر کر کے حکومتی ایجنڈے بروئے کار لایا جائے۔ دوسری بات اہم جو اس سرپرائز پالیسی میں آتی ہے وہ ہے سیاستدانوں سے چیف ایگزیکٹو کی ملاقات، ان انفرادی ملاقاتوں کا ایجنڈا کیا ہے؟ ڈ یہ بھی ابھی تکسات پر مبنی ہے حکومت یا سربراہ حکومت کی طرف سے کوئی متعین ایجنڈا سامنے نہیں آیا اس لئے ان ملاقاتوں کے کوئی واضح اور مثبت اثرات نظر نہیں آ رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بزم یار سے ہر ایک نئی اور اپنے مطلب کی خبر لا رہا ہے، راجہ ظفر الحق بتاتے ہیں کہ حکومت مسلم لیگ کو توڑنا نہیں چاہتی امین فہیم باہر آ کر کہتے ہیں کہ حکومت بے نظیر کے خلاف مقدمات پر نظر ثانی کرنے کو تیار ہے مولانا فضل الرحمٰن فرماتے ہیں کہ حکومت دینی معاملات پر علماء سے محاذ آرائی کا ارادہ نہیں رکھتی اعجاز الحق نوید سناتے ہیں کہ چیف صاحب نے اسمبلیوں کی بحالی پر ہمدردانہ غور کا وعدہ کیا ہے، اجمل خٹک امید دلاتے ہیں کہ یہ ملاقاتیں قومی اتفاق رائے پیدا کرنے کے لئے سنگ میل ثابت ہوں گی یہ تو یکطرفہ بیانات ہیں اصل بات کیا ہے یہ اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکے

گی جب تک حکومت خود راز نہیں کھولتی یہاں بھی سر پرائز پالیسی پوری شان کیساتھ موجود ہے حالانکہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ چیف صاحب کا ان ملاقاتوں سے مقصود یہ ہے کہ وہ چونکہ مستقبل میں سپریم کورٹ کی مینجمنٹ اور اپنی کمٹمنٹ کے نتیجے میں طے کئے بیٹھے ہیں کہ ایک دو سال میں اقتدار سویلین لوگوں کو سونپ دیں گے وہ جاننا چاہتے ہیں کہ مستقبل کا سیٹ اپ کیا ہوگا؟ اور مستقبل کے سیٹ اپ سے پہلے موجودہ حکومت میں سیاستدانوں کا کردار کیا ہوگا؟ لیکن ساتھ ہی حکومت کی طرف سے بیان آجاتا ہے کہ موجودہ سیٹ اپ میں سیاستدانوں کی شمولیت اور شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہ بیان پڑھ کر قوم ایک بار پھر حکومت کی سر پرائز پالیسی سے دوچار ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حیرت و استعجاب کا یہ منظر روز بروز پھیلتا چلا جا رہا ہے اسمبلیاں بحال بھی نہیں ہوں گی اور انہی تحلیل بھی نہیں کیا جا رہا۔ موجودہ سیٹ اپ میں سیاستدانوں کے لئے کوئی گنجائش اور جگہ بھی نہیں اور اوپر نیچے اور دھڑا دھڑ ان سے ملاقاتیں بھی ہو رہی ہیں۔ جب سیاستدانوں سے تعاون لینا ہی نہیں تو وہ از خود تعاون کیوں کر کریں گے۔

رہ گئی بات مستقبل کے تحفظات کی تو وہ بھی اسی صورت میں یقینی بنائے جاسکتے ہیں جب سیاستدانوں کے لئے جگہ اور گنجائش پیدا کی جائے۔ ورنہ اسی انداز سے معاملات چلتے رہے اور ان کی منتخب اسمبلی وجود میں آ گئی تو اس وقت شاید صورت حال مختلف ہو سیاستدان ایک کیمپ میں ہوں گے اور حکومت دوسرے کیمپ میں مستقبل میں نیشنل سیکورٹی کونسل کا مسئلہ درپیش آسکتا ہے ضلعی حکومتوں کے لئے آئینی تحفظات درکار ہوں گے ۱۲ اکتوبر ۹۹ء سے نئی حکومت کے قیام کے درمیانی عرصے میں کئے گئے اقدامات کی Indemnity کا معاملہ ہوگا اور بعض نئی آئینی ترامیم بھی سامنے آسکتی ہیں یہ سارے مسائل یقیناً پیش آئیں گے کہیں ایسا نہ ہو کہ عین وقت پر کھنڈت پڑ

جائے اور کئے کرائے پر پانی پھر جائے۔

ہمارے خیال میں سرپرائز پالیسی کم از کم سیاسی حوالے سے زیادہ دیر تک جاری نہ رکھی جائے، سیاسی معاملات میں کھلا پن زیادہ مفید ہوتا ہے، عوام آج تک خفیہ اقدامات اور حکمت عملیوں کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

ایوب خان کیسے اوپر آ گئے۔ یحییٰ خان نے کس طرح ایوب خاں کو بے بس کر دیا بھٹو صاحب روم سے جہاز میں بیٹھ کر سیدھے ایوانِ صدر کیسے لائے گئے؟ پی این اے اور حکومت کے مذاکرات کی کمند عین لب بام پر کس طرح ٹوٹی؟

جونیجو صاحب پچھلی صف سے اٹھا کر مسند حکومت پر کیونکر براجمان کر دیئے گئے؟ اپنی مرضی کی منتخب اسمبلی اور حکومت آناً فاناً کیوں توڑنی پڑ گئی؟

آئی جے آئی کن ہاتھوں نے تراشا؟ یکے بعد دیگرے حکومتیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار کیوں ہوئیں؟ اور دس روز قبل جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین کے منصب پر فائز ہونے والے شخص سے معاملات کیوں کر بگڑے اور ۱۲ اکتوبر کو ایک نیا منظر اچانک کیوں طلوع پذیر ہوا؟ یہ سارے حوالے قوم کے لیے سرپرائز ہیں اب سرپرائز نہیں Open ness کی پالیسی ہونی چاہیے، سب کچھ سامنے اور سب کے سامنے!

بوالعجبی

یہ بے نظیر دور حکومت کا واقعہ ہے کھانے کی ایک دعوت کے دوران باتوں باتوں میں پارلیمنٹ میں فارن افیئرز کمیٹی کا ذکر آ گیا۔ مرحوم زیڈ اے سلہری نے فرمایا" بے نظیر بھٹو کا سیاسی سطح پر یہ کتنا مضحکہ خیز فیصلہ ہے کہ انہوں نے مولانا فضل الرحمٰن کو اس کمیٹی کا چیئرمین بنایا ہے حالانکہ مولانا انگریزی سے بالکل نابلد ہیں معلوم نہیں وہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کو کیسے پروجیکٹ اور پروموٹ کریں گے؟

اگر تو مرحوم نے یہ رائے محض اس لئے دی کہ وہ بھٹو فیملی اور ان کے انداز حکومت کے ناقد تھے یا انہیں مولانا فضل الرحمٰن سے اختلاف تھا کیوں کہ ان کے والد مولانا مفتی محمود مرحوم علماء کی اس جماعت کے فرد تھے جنہوں نے قیام پاکستان کے حوالے سے مسلم لیگ کے نقطہ نظر کی مخالفت کی تھی تو الگ بات ہے کیوں کہ ہمارے ہاں سیاسی مخالفت کا مطلب "ہمہ نوعی مخالفت" ہوتی ہے اور یہ رویہ عام ہے

لیکن اگر سلہری صاحب واقعی یہ سمجھتے تھے کہ فارن پالیسی بغیر انگریزی جانے اور انگریزی بولے پروجیکٹ نہیں ہوسکتی تو اس طرز فکر کو نرم ترین الفاظ میں "بچگانہ" اور "مضحکہ خیز" کہا جاسکتا ہے

فکری افلاس، تہذیبی غربت اور ذہنی مرعوبیت کی دنیا میں بیسیوں قسمیں پائیں جاتی ہیں اور ان میں ایک "زبان" کے بارے میں حد سے بڑھا ہوا احساسِ

غلامی ہے۔

زبان ایک ذریعہ ابلاغ ہے اور وسیلہ اظہار ہے اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں، نہ مقدس اور نہ معظم، لیکن جب کوئی قوم اور تہذیب غالب آتی ہے

تو وہ دوسرے بہت سے شعبوں کی طرح زبان کے بارے میں بھی اپنی مغلوب اور مرعوب قوموں میں یہ خیال راسخ کر دیتی ہے کہ ان کی زبان بڑی نارسا مفلس، مفلوج، بھدی، نامکمل اور جانگلی ہے اس مغلوب قوم کے وہ افراد و قبائل جو واقعی ...... مٹی کے مادھو ...... اور ...... ربڑ کے موزے ...... ہوتے ہیں وہ دل سے اس فلسفے کے قائل ہی نہیں بلکہ مبلغ بن جاتے ہیں کہ ہاں واقعی ہماری زبان ہے ہی کیا محض ایک تہمت اور ناگوار پلندہ یہ مسئلہ واقعاتی نہیں سراسر نفسیاتی ہوتا ہے

اور یہ رف انگریزی سے مخصوص نہیں مختلف اوقات میں مختلف زبانوں کے بارے میں نقطہ نظر رہا ہے۔ بدقسمتی سے یہ رویہ برصغیر پاک و ہند میں بہت ہی نمایاں اور کراہت کی حد تک غالب ہے

زبان کو علمی وسعت کے لئے اختیار کرنا، سائنسی اصطلاعات کی خاطر نوکِ قلم پر لانا، حُسنِ ابلاغ کی غرض سے استعمال کرنا اور اظہار مدعا کی وجہ سے بروئے کار لانا اور بات ہے اور اسے معیار تہذیب قرار دینا بالکل دوسری بات ہے برصغیر پاک و ہند میں پہلی غرض سے کسی دوسری زبان سے کم استفادہ کیا گیا البتہ اسے معاشرتی معیار اور برائی کے اظہار کے طور پر زیادہ اپنایا گیا۔ خارجہ پالیسی کے حوالے سے اوپر کا تبصرہ اسی ذہنیت کا غماز ہے الجزائر محکوم رہا، چین غلام رہا، پورا عالم عرب استعماری غلبے کا شکار رہا، جاپان پر بیرونی تسلط رہا مگر یہ ممالک اس اتھلے پن میں گرفتار نہیں ہوئے جس کا مظاہرہ ہمارے ہاں ہوا سوال یہ ہے کہ انگریزی برطانوی جزائر، امریکہ اور ایک آدھ دیگر ملکوں کے علاوہ کہاں بولی جاتی ہے؟ انگریزی میں بلاشبہ بڑا سائنسی،

سیاسی ادبی اور علمی لٹریچر تیار ہوا لیکن اس کا یہ مطلب کہاں سے نکل آیا کہ ساری دنیا کو انگریزی کی میزان میں تولا جائے، انگریزی کی عینک سے دیکھا جائے، انگریزی کے فیتے سے ناپا جائے اور انگریزی کی کسوٹی سے جانچا جائے

اگر کسی اصول سے مشتق ایک مادہ سے ماخوذ اور باقاعدہ قیاسی وسماعی لغات سے منسلک زبان دیکھی جائے تو وہ...... عربی زبان ہے حد درجہ فصیح، جامع، اور اصول و قواعد پر استوار، یہی وجہ ہے کہ اہل عرب کو اپنی زبان پر اس قدر ناز تھا کہ وہ اپنے علاوہ ساری دنیا کو عجم کا نام دیتے تھے یعنی ''گونگا'' لیکن یہ بھی نخوتِ جاہلیہ کا ایک اظہار تھا۔

دنیا میں جو بھی معروف ومتداول زبانیں ہیں وہ یقیناً مختلف پہلوؤں سے ایک دوسرے سے ممتاز اور منفرد ہیں کسی ایک زبان کو تمام زبانوں پر ترجیح دینا اور اسے معیار علم وفضل قرار دینا شعور وآگہی کی نہیں غرور وابلیسی کی دلیل ہے۔

دنیا بہت سے ممالک پر مشتمل ہے اور اپنی اپنی خارجہ پالیسی، معاشی حکمت عملی اور تجارت سب کچھ چلا رہے ہیں اور انگریزی کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔ کیا خیال ہے چین جیسا عظیم وجلیل ملک انگریزی کے بغیر ترقی نہیں کر رہا؟ کیا فرانس میں انگریزی بولی جاتی ہے؟ کیا جرمنوں کو انگریزی کے بغیر کوئی نہیں پوچھتا؟۔ کیا روس انگریزی کی وجہ سے سپر پاور بنا تھا؟ کیا جاپان کی ساری اقتصادی ترقی انگریزی بولنے کے سبب ہے؟ ماؤ جیسا عظیم انقلابی رہنما انگریزی سے نابلد تھا کیا اس کی معرکۃ الآراء قیادت وبصیرت میں انگریزی کے بغیر خامی رہ گئی تھی؟ نپولین جیسا عالمی شہرت کا حامل جرنیل انگریزی سیکھے بغیر کیسے فنونِ حرب میں ماہر ہو گیا تھا؟ امام خمینی عربی اور فارسی کے علاوہ کوئی زبان نہیں جانتے تھے وہ پھر کس طرح تاریخ ساز انقلابی لیڈر بن گئے؟ چین کے صدر ژیانگ زی من انگریزی سے بالکل کورے ہیں کیا ان کی خارجہ پالیسی ناکام جا رہی ہے؟ ظاہر ہے کوئی اگر ایسا سوچتا ہے تو اسے دانشور کہلانے کی بجائے

ابتدائی تعلیم کے لئے مکتب سکول میں بیٹھنا چاہیے۔قومیں اپنی تہذیب و تاریخی شناخت اور سیاسی و اقتصادی کردار کے باعث ابھرتی، آگے بڑھتی، عزت پاتی اور جگہ بناتی ہے۔ کسی دوسری تہذیب کی اترن پہننے اور اجنبی بان کی نقل اتارنے سے کوئی نیک نام ہوئی اور نہ بلند مقام ٹھہری ہے۔سوال یہ ہے کہ ہمارے تعلقات، معاملات اور مفادات ان بہت سے ممالک سے ہیں جو انگریزی نہیں بولتے اور ان کی اپنی قومی و دفتری زبانیں ہیں ان سے بات چیت کیسے ہو؟ چو این لائی بڑے انگریزی دان تھے۔مگر مترجم کے بغیر بات نہیں کرتے تھے، کوسکن انگریزی پڑھا ہوا تھا وہ بھی مترجم درمیان میں بٹھاتا تھا انہیں تو کوئی ''پینڈو'' اور ''مولوی'' نہیں کہتا تھا کئی عالمی میڈیا لیڈر ایسے ہیں جو انگریزوں سے زیادہ فصیح انگریزی بولنے پر قادر تھے مگر مجال ہے اپنی زبان محض نمائش کی نذر کی ہو، عزت زبان کی نہیں ہوتی انسان کی ہوتی ہے، مہذب، عالم، خود دار اور وضعدار انسان کی، ہم نے سارا زور صرف اس پر صرف کیا ہے کہ بیچارے غریب لوگ اور دیہاتی عوام ہمارے انگریزی لباس سے مرعوب ہوں ہماری نئی نسل انگریزی بولتے ہوئے ہمارے ٹیڑھے منہ دیکھ کر متاثر ہو، عوام ہمیں کندھے اچکاتے ہوئے دیکھ کر داد دیں، اور بیرونی دنیا بھی ہماری محنت کی شاباش دے۔ یہ سب بے مایہ، بے مغز اور بے مقصد کاوش ہے، عزت صرف اسی کی ہوتی ہے جو اپنے گھر سے کھائے خواہ جوتا دیسی پہنے، جو عزت نفس کا سودا نہ کرے خواہ وہ دھسہ اوڑھے جو بیدار مغز اور غنی دل ہو خواہ لکس صابن کے بجائے چکنی مٹی سے سر دھوئے اور جو سیاسی و اقتصادی وزن اور علمی رویہ رکھتا ہوں خواہ وہ پشتو بولے یا سرائیکی جو قوم اور شخص خود کو کردار و عمل کے زور پر دنیا کی ضرورت بنا دے اس کی بات ہر حال میں سنی جائے گی چاہے دنیا کے وفود کو لغت بغل میں داب کر حاضر ہونا پڑے۔ مترجم ساتھ لانا پڑے، اشاروں سے کام چلانا پڑے یا دائیں بائیں سے پوچھ کر مفہوم سمجھنا پڑے، دنیا

بھر کے علاقائی یہ تردد ضرور کریں گے، اقبالؒ نے انگریزی میں کوئی نظم نہیں کہی، لیکن دنیا کے عظیم شعراء کی صف میں ان کی نشست طے ہو چکی ہے غالب تو خیر سے انگریزی نا آشنا تھے لیکن دنیا کی ادبیات اگر غالب کو نظر انداز کرے گی تو اس کی یہ حرمت واہیات تصور ہوگی۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ زبان کا بھرپور ہونا، جامع، ہونا فصیح ہونا اور با رعب ہونا اپنی جگہ لیکن اس کی حیثیت ذرائع ابلاغ ہی کی رہے گی اور یہی معقول بات ہے ہمارا طرز عمل بتاتا ہے کہ ہم انگریزی مطالعہ کرنے کے لئے نہیں دوسروں کو مغالطہ دینے کے لئے اپناتے ہیں۔ علم بڑھانے کے لئے نہیں رعب جمانے کے لئے پڑھتے ہیں، مہذب بننے کے لئے نہیں بلکہ ''گورا صاحب'' نظر آنے کے لئے اختیار کرتے ہیں کیوں کہ نصف صدی میں یہاں ہر حکمران نے انگریزی بولی لیکن ہر ایک نے قوم کی ''بولی'' ہی لگوائی اردو کو اگر ہم نے قومی زبان قرار دیا ہے تو اسے سرکار و دفتری زبان بنانے پر سب سے زیادہ محنت کرتے، تاکہ ہم کسی اور شعبے میں نہ سہی کم از کم زبان میں تو خود کفیل ہو جاتے

ہمارے بیشتر لیڈر بھی امپورٹڈ ہمارے لباس بھی امپورٹڈ گندم بھی امپورٹڈ، دوائیاں بھی امپورٹڈ تعمیری سامان بھی امپورٹڈ اور روزمرہ کی ضروریات بھی امپورٹڈ اور زبان بھی امپورٹڈ یہ کیا بوالعجمی ہے؟۔

چیف ایگزیکٹو کے ذوق مطالعہ کی نذر

چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے گذشتہ دنوں اخبارات کے ایڈیٹروں اور سینئروں کالم نگاروں سے ملاقات کے دوران ایک صحافی کے استفسار پر بتایا کہ

"میں اخبارات میں صرف سرخیاں پڑھتا ہوں، نیچے متن پڑھنے کی مجھے فرصت نہیں ملتی، آہستہ آہستہ یہ عادت بھی ڈال لوں گا۔"

اگرچہ سرخیوں میں وہ سب کچھ آجاتا ہے جو قاری کو متن کے ذریعے حاصل ہوتا ہے یہ بھی بہت غنیمت ہے کہ کسی حکمران کو تفصیل میں جائے بغیر محض شہ سرخیوں کے حالات کی تصویر نظر آجائے، بڑی خوشی کی بات ہے کہ جنرل صاحب شہ سرخی سے بے رخی نہیں برتتے میں یہ موقع غنیمت جانتے ہوئے اپنے کالم کو چند "شہ سرخیوں" کے لئے وقف کر کے جنرل صاحب کے ذوق مطالعہ کی نذر کر رہا ہوں۔

تاہم یہ شہ سرخیاں کسی اخبار کی پیشانی پر درج نہیں تاریخ کے ماتھے پر تحریر ہیں صدیاں بیت گئیں مگر ان شہ سرخیوں کا نہ رنگ پھیکا پڑا اور نہ تاثر زائل ہوا، اخبارات کی شہ سرخی ایک دن کی عمر پاتی ہے

اور اگلا دن چڑھنے سے پہلے ماضی کا صیغہ اور رفت وگزشت کا معاملہ بن جاتی ہے مگر تاریخ کی شہ سرخی اس وقت تک جریدہ عالم پر ثبت رہتی ہے جب تک حکمران اس سے نصیحت رہنما اس سے عبرت اور عوام اس سے بصیرت حاصل کرتے رہتے ہیں

، یہ صرف چند "شہ سرخیاں" ہیں جو گاہے بگاہے جبیں تاریخ پر ابھرتی رہیں اور رنگ و نور بکھیرتی رہیں یہ دور فاروقیؓ کی یادگار ہیں جنرل صاحب آپ بلاشبہ پاکستان جیسی ایک عظیم مملکت کے ہمہ مقتدر فرمانروا ہیں لیکن حضرت عمرؓ پاکستان کے ساتھ گناہ بڑی ریاست کے امیر تھے ، آپ بڑے جرات مند ہیں مگر عمرؓ کی جراتوں کا احوال روم کے قیصر ایران کسریٰ، مصر کے مقوقس اور غسان کے جبلہ بن ابہم سے دریافت کیجئے آپ میاں نواز شریف کے جانشین ہیں حضرت عمرؓ جناب ابوبکر صدیقؓ کے جانشین تھے

آپ کا پایہ تخت اسلام آباد ہے ان کا دارالخلافہ مدینہ منورہ تھا۔ آپ تین لاکھ مربع میل پر حکمران ہیں۔ وہ بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی حکومت کے سربراہ تھے اور آپ کی بات صرف لوگ سنتے ہیں حضرت عمرؓ کی بات تو دریائے نیل بھی مانتا تھا ' انہوں نے کس طرح سوچا کیا کیا اور کیسے ملک چلایا یہ سب باتیں تاریخ کا ورثہ بھی ہیں اور وقت کا تقاضا بھی ان پر کان دھرئے اور دھیان دیجئے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا معیار انتخاب

آپؓ جب کسی شخص کو کوئی منصب سونپنے اور عہدہ دینے کا ارادہ کرتے تو آپ کیسی سیرت ادا کیسے کردار کو معیار انتخاب بنائے؟ یہ آپ کے ایک ارشاد سے واضح ہوتا ہے، آپ فرمایا کرتے تھے۔

"جب کوئی شخص کسی منصب پر فائز نہ ہو تو وہ قوم کا سردار نظر آئے اور جب اسے قوم کا سردار بنا دیا جائے تو وہ قوم کے عام افراد جیسا نظر آئے۔"

یہ ہے افسری اور وی آئی پی کلچر کے جڑ پر تیشہ چنانچہ خود آپ کی شخصیت "حسن انتخاب" کا شاہکار تھی، موٹا جھوٹا پہننا اور کھانا، بیت اعمال کے اونٹ چرانا، گمشدہ اونٹ کو تلاش کرنا رات کو پہرہ دین گلیوں میں گشت کرنا، ناداروں میں راشن بانٹنا اونچی

مسند پر نہ بیٹھنا عدالت میں پیش ہونا اور خود کو محاسبہ کے لئے صرف ٹریبونل عدالت اور پارلیمنٹ میں نہیں ہر آدمی کے سامنے پیش کرنا یہ آپ کے روزمرہ معاملات تھے۔ شخص تشہیر کے لئے نہیں منصبی تدبیر کے باعث۔

جیسا صاحب اقتدار ویسا اہل کار

مدائن (موجود عراق) زرخیز ترین علاقہ تھا جسے مورخین نے Fertile cresent یعنی "ہلال زرخیز لکھا ہے۔ جب یہ حضرت عمرؓ کے دور میں فتح ہوا تو کمانڈر سعد بن ابی وقاصؓ نے مال غنیمت مدینہ منورہ بھجوایا زر و جواہر اور مال وضال کی ندرت اور کثرت دیکھ کر اہل مدینہ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں حضرت سعدؓ نے ساتھ ہی ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ اس قدر مال غنیمت ملنے کی جو خوشی ہے سو وہ ہے مگر اصل مقام مسرت یہ ہے کہ کسی سپاہی کے ہاتھ ہیرا لگا ہے تو وہ بھی اس نے میرے پاس جمع کرایا اگر کسی کو سوئی ملی ہے تو وہ بھی میرے پاس لایا ہے آپ کو سپاہ اسلام کی فرض شناسی اور دیانتداری مبارک ہو، یہ خط پڑھ کر آپ کے آنسو نکل آئے حضرت علیؓ پاس بیٹھے تھے اور رونے کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا یہ خوشی کے آنسو ہیں اور سعد بن ابی وقاص کا واقعہ حضرت علی کو تھما دیا۔

حضرت علیؓ نے فرمایا "تحسین و تبرکات" کے دراصل آپ مستحق ہیں آپ امین نہ ہوتے تو اہل کار کبھی امانت دار نہ بنتے۔"

گویا اصل مسئلہ حکومت سازی نہیں بلکہ سیرت سازی ہے آئین جہانداری کے لئے جوہری تقاضا احساس ذمہ داری ہے اور دیانت کا سرچشمہ عوام نہیں امام ہوتا ہے۔

مفہوم حکومت

ہمارے ہاں جب حکومت پر بحث چل نکلتی ہے تو زیادہ تر بات طرز حکومت کی

ہوتی ہے وحدانی یا وفاقی ؟ صدارتی یا پارلیمانی ؟ مرکزی یا صوبائی اسی طرح جھگڑا حقوق واختیارات کا اٹھ کھڑا ہوتا ہے صوبوں کے کیا حقوق ہوں گے؟ گورنر اور وزیر اعلیٰ کے درمیان توازن اختیارات کس طرح ہو گا ؟ ڈی سی اور ایس پی کے کیا اختیارات ہوں گے؟ عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ کا دائرہ کار کیا ہوگا؟ وغیرہ

مگر فاروق اعظمؓ حکومت کی صورت سے زیادہ اس کی افادیت کو اہم سمجھتے تھے، طرز حکومت کوئی ہو اگر اس میں عوام کے لئے افادیت کا پہلو نہیں تو وہ حکومت نہیں شامت ہے جس سے لوگ پناہ مانگتے ہیں ایک بار حضرت عمرؓ شام کے سفر سے واپس آ رہے تھے راستے میں ایک، خیمہ دیکھا قریب گئے تو ایک بڑھیا پر نظر پڑی آپ اس کے پاس رک گئے آپؓ نے اس سے پوچھا بی بی کچھ عمرؓ کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے؟ اس نے بڑی بے رخی سے کہا مجھے کچھ علم نہیں اور اس کے بارے میں جاننے کی ضرورت بھی نہیں سنا ہے وہ شام سے چل پڑا ہے۔ آپؓ نے فرمایا اپنے امیر کے اس قدر بے خبری اور بے زاری؟ بڑھیا بولی جب اس نے ہمارا حال نہیں پوچھا تو ہمیں اس کے احوال سے کیا غرض؟ آپؓ نے فرمایا تم نے عمرؓ کو اپنے حال سے آگاہ کرنا تھا اسے اتنی دور کا حال کیسے معلوم ہوتا ؟ اس پر وہ بڑھیا بھا اٹھی اور کہنے لگی اگر عمرؓ اپنی رعایا کے ایک ایک فرد سے باخبر نہیں تو اسے کس نے حکومت کرنے کو کہا ہے وہ فورا الگ ہو جائے۔ حضرت عمرؓ جب بھی یہ واقعہ بیان کرتے آپ کی آنکھیں چھپک اٹھتیں اور فرماتے

”خلافت کا مفہوم تو مجھے شام کی بڑھیا نے بتایا“

جذبہ خدمت

حضرت احنف بن قیسؓ ایک بار عراق آپ کو ملنے آئے گرمی کا موسم تھا دیکھا

کہ امیر المومنین عمرؓ سر پر امامہ لپیٹے بیت المال کے ایک اونٹ کی مالش کر رہے ہیں احنفؒ کا استعجاب دیکھ کر فرمایا

"یہ بیت المال کا اونٹ ہے جس میں یتیموں اور بیواؤں کا حق ہے"

احنف بن قیس بولے "یا امیر کسی خادم اور غلام سے کہا ہوتا وہ مالش کر دیتا"

آپؓ نے فرمایا "بھلا عمر سے بڑھ کر بندوں کا خام اور خدا کا غلام اور کون ہو سکتا ہے۔

اقبالؒ نے کس موقع پر یاد آئے

آں مسلماناں کہ میری کرد اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند

فرقہ وارانہ مزاج

علماء بلا شبہ انبیاء کے وارث ہیں اور رسول اعظم و آخر ﷺ کا تو سارا اورثہ علماء ہی کو منتقل ہوا ہے۔ اس لئے کہ اب کسی پیغمبر نے مبعوث نہیں ہونا، حضور ﷺ کے ہاتھوں جوامت تشکیل ہوئی اس کے اخلاق کی تہذیب اور اس کے عناصر کی ترتیب علماء نے کرنی ہے مگر بد قسمتی سے امت کا تصور تحلیل ہو کر فرقہ واریت کے ڈراؤنے ہیولے میں منتقل ہو گیا اور یہ ذوق برصغیر پاک و ہند میں کچھ زیادہ ہی بڑھا ہوا ہے۔ فرقہ بندی کے اس بے محابا فروغ میں کچھ فرنگی حکومت کی چالیں اور سیاسی مصلحتیں بھی شامل تھیں لیکن اس پودے کی آبیاری میں خود علماء نے بھی پورا پورا حصہ لیا۔ چنانچہ محبت و نفرت، پسند و ناپسند، قربت و غیرت اور دوستی و عداوت کا پیمانہ امت نہیں رہی بلکہ فرقہ بن گیا۔ ہر شخص فرقے کی میزان میں تولا جانے لگا فرقے کی آنکھ سے دیکھا جانے لگا، فرقے کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا اور فرقے کے سانچے میں ڈھالا جانے لگا، جب علماء فرقہ بندی کے جواز کے لئے قرآن و حدیث اور فقہاء کے اقوال کا سہارا لینے لگے اور ایک دوسرے سے بڑھ کر ان فرقوں کی دینی حیثیت اور افادیت پر زور دینے لگے تو عوام کو لا محالہ فرقوں میں تقسیم ہونا تھا اور لازماً کسی نہ کسی فرقے سے جڑنا تھا اور فرقہ جب ہی تفرقے کا نام تو پھر وحدت اور یکجہتی کہاں سے آتی؟

ظاہر ہے جو قوم فرقوں میں بٹ جائے یا بانٹ دی جائے تو اس کے جملہ

اہداف و مقاصد امت کے تصور سے مختلف ہی نہیں متصادم ہو جاتے ہیں امت عقیدہ و عمل کی وحدت سے تشکیل پاتی ہے جب کہ فرقے اپنے مختلف رسوم اور اشعار سے مشخص ہوتے ہیں جب علماء نے فرقہ وارانہ ترجیحات از سر نو متعین کیں تو نفرت و محبت کا ہدف بدل گیا۔ اسلام کے اعتقادی و فکری دشمن سے وہ نفرت نہ رہی جو اپنے فرقے کے مخالف سے پیدا ہو گئی امت کی ذلت پر اتنا ملال نہ رہا جتنا اپنے فرقے کی شکست پر رنج محسوس ہوا امت کے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ جانے سے علماء امت کے پیشوا نہ رہے بلکہ اپنے اپنے دھڑے کے رہنما بن گئے جس طرح ہر دھڑا دوسرے کو نیچا دکھانے پر تل گیا اسی طرح علماء بھی ایک دوسرے کی پسپائی کی آرزو کرنے لگے ظاہر ہے جب علماء اپنے ہی ہم منصبوں سے برسرِ پیکار ہوں گے تو پھر اعزاز اور وقار کہاں رہیگا؟ مگر رفتہ رفتہ لوگ جب اس مذہبی محاذ آرائی کی ضرر رسانیوں کا مشاہدہ کرتے گئے، شعور عصر بھی نسبتاً پختہ ہو گیا، گرد و پیش سے بھی آگہی کا دائرہ وسیع ہو گیا اور مواصلاتی رابطوں نے لوگوں کو نئے زاویوں اور مسائل کی نئی جہتوں سے آشنا کیا تو لوگوں کی فرقہ بندی سے وابستگی کمزور پڑتی گئی اور لوگوں نے محسوس کیا کہ اس وقت اقوام عالم کی صفوں میں اگر پوری امت مل کر کوئی بڑا کردار ادا نہیں کر رہی تو چھوٹے چھوٹے فقہی گروہ بھلا کیا کر سکیں گے؟ علماء چونکہ ان فرقوں کے راہنما تھے وہ بھلا پیچھے کیسے ہٹتے؟ اس طرح عوام اور علماء کے درمیان رشتہ کمزور پڑ گیا، نماز روزہ، زکوۃ، نکاح، طلاق کی حد تک لوگوں نے علماء سے رابطہ برقرار رکھا لیکن وہ معاملات جن کا سیاسی و معاشرتی اصلاح اور بگاڑ سے تعلق تھا اس سلام میں عوام نے علماء کے بجائے دوسرے مراکز ڈھونڈ لیئے یوں علماء معاشرے کے اجتماعی کردار اور منظر سے قریب قریب غائب ہوتے چلے گئے، حق یہ ہے کہ علماء نے جتنا زور اپنے اپنے فرقوں کی توسیع اور استحکام پر لگایا ہے اگر اتنی قوت اور محنت غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں لانے

اور یہ پہلے سے موجودہ مسلمانوں کے اخلاق واطوار سدھارنے میں کھپاتے تو خدا شاہد ہے نہ یہ امت بے امام ہوتی نہ دنیا پرستوں کے ہاتھ معاملات کی زکام ہوتی اور نہ علماء کی ذات اس قدر مورد الزام ہوتی۔

فرقہ وارانہ مزاج نے علماء کو محدود دائرے میں محصور کر دیا اور وہ اعلیٰ سماجی سیاسی اور اجتماعی کردار نظروں سے اوجھل ہو گیا جسے ادا کرنا اصل میں علماء کے شایان شان تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ علماء کی معقول تعداد نے سیاسی وسماجی کردار کے حوالے سے بڑی ذمہ داری کا ثبوت دیا لیکن اس سے کہیں بڑی تعداد نے اس جانب توجہ نہیں دی یوں صلاحیتوں کا ایک قیمتی اور بڑا حصہ امت کی ہدایت کے بجائے گروہی عصبیت میں کھپ گیا ورنہ علماء کے پاس جو مساجد کا ایک وسیع وعریض سلسلہ ہے طلباء اور معتقدین کا بیش بہا اثاثہ ہے اور تحریر وتقریر کا جو سرمایہ ہے وہ دوسروں کے ہاں نہیں اس کا ذمہ دارانہ استعمال امت کو بلاشبہ امامت کا منصب سونپ سکتا تھا مگر ایسا نہیں ہو پایا۔

واقعہ یہ ہے کہ اجتماعی امور میں اجتماعیت کا تصور چل سکتا ہے گروہی عصبیت کا نہیں فرقہ وارانہ مزاج زندگی اور وقت کی پوری ترجیحات کو الٹ کر رکھ دیا جس کے نتیجے میں دینی حلقوں کی ساری بساط الٹ کر رہ گئی۔

جنرل صاحب! نئی طرحیں ڈالیں

سیاست کرنا اور حکومت چلانا اگرچہ دو اور دو چار کی طرح کا حسابی عمل نہیں، سیاست وحکومت میں کئی پیچ وخم اور اسرار مبہم ہوتے ہیں تبھی تو اقبال نے ''خدائی'' کو ''دردسر'' کہا ہے لیکن تاریخ سربستہ رازوں سے نہیں کچھ سچی آوازوں سے عبارت اور معتبر ہے۔

سیاستدانوں سے اگر کہا جائے کہ آپ یہ بلند بانگ دعوے، جھوٹے وعدے، ناممکن العمل نعرے اور نئے نئے ہنگامے کس لئے کرتے ہیں؟ تو ان کا جواب ہوتا ہے سیاست اسی کا نام ہے۔ سیاسی سفرناک کی سیدھ پر نہیں ہوتا اور اس کے قاعدوں میں ریاضی اور الجبرا کے ضابطوں جیسی صراحت اور قطعیت نہیں ہوتی، اس طرح اگر حکمرانوں سے پوچھا جائے کہ آپ گھی ہمیشہ ٹیڑھی انگلیوں سے کیوں نکالتے ہیں؟ دودھ ہمیشہ مینگنیاں ڈال کر کیوں دیتے ہیں؟ اور ناک ہاتھ گھما کر کیوں پکڑتے ہیں؟ تو ان کا بھی یہی جواب ہوتا ہے کہ حکومت کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس کا ہر کام اچنبھا اور ہر اقدام معمہ ہو، تبھی تو چند لوگ حاکم ہوتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں محکوم، اگر یہ راز نہ ہوتو ہر کوئی حکمران نہ بن جائے یہ جواز ناممکن ہے سیاستدان اور حکمرانوں کے لئے بہت خوش کن اور ہم جیسوں کے لئے یہ جواب دندان شکن ہو مگر ہے بہت ناموزوں اور عقل وحکمت کے خلاف۔

سقراط حکیم ودانا ہونے کے ساتھ ساتھ سیاستدان بھی تھا اور یونانی پارلیمنٹ کا ممبر وہ جب اپنے افکار وخیالات کے باعث زیر عتاب آیا، تو اس نے نہ جھوٹ کا سہارا لیا نہ کمزور تاویل سے کام لیا نہ عقل عیار کو رہنما بنایا نہ الفاظ کی جگالی کی اور نہ پہلو بدلنے

اور طرح دینے کی کوشش کی اسے اپنے افکار پر نظر ثانی کرنے کا موقع دیا گیا مگر اس نے صاف کہا کہ میرے دل اور زبان میں کبھی فاصلہ نہیں اور میں دل کی سچی گواہی کے بغیر کوئی بات زبان پر نہیں لایا۔ اس لئے میں اس باب میں کسی مہلت اور رعایت کا طالب نہیں وہ جب نظر بند تھا تو اس کے مداحوں اور شاگردوں نے اسے چھڑانے اور اس کے لئے بھاگ نکلنے کا پروگرام بنایا اور موقع فراہم کیا مگر اس نے اس ساری سکیم کو سختی سے مسترد کر دیا اور کہا "اگر ذہانت قانون توڑنے اور دیانت مصلحت اوڑھنے لگے تو اچھی روایت کبھی قائم نہیں ہوتی" اور ساری دنیا کو معلوم ہے کہ سقراط نے بھرے ایوان میں زہر کا پیالا پی لیا تاریخ نے جب یونان کو دنیا کے سامنے پیش کیا تو سقراط اس کا عنوان جلی قرار پایا نہ مخبری کرنے والے کسی کو یاد ہیں نہ گواہی دینے والے تاریخ میں مذکور ہیں اور نہ سزا سنانے والے کسی کے حافظے میں رہے۔ ٹھیک ہے سقراط کی جان نہیں بچی مگر اس کی آن سلامت رہی کیا ہمارے سیاستدان سقراط سے بڑے سیاستدان ہیں۔ جو سیاسی اسرار و رموز سے آگاہ ہوں؟ اسی طرح حضرت علیؓ حکمران تھے پاکستان سے آٹھ گناہ بڑی مملکت کے فرمانروا جب آپ سیاسی آشوب اور انتظامی ضعف میں گھر گئے تو بعض لوگوں نے کہا یا امیر دوسرے لوگوں کی پالیسیاں زیادہ کامیاب جا رہی ہیں آپ بھی کچھ کیجئے آپ نے برجستہ فرمایا۔

اگر علیؓ کے سامنے دین نہ ہوتا تو علی سے بڑا سیاستدان عرب میں پیدا ہی نہیں ہوا؟ مطلب واضح ہے کہ کامیاب حکمران وہ نہیں جو اپنے عمل کو اصول قرار دے بلکہ صحیح حکمران وہ ہے جو اصول کے مطابق عمل کرے ابن ملجم کی مخبری ہو گئی اور حضرت علیؓ سے اس کے برے ارادوں کا ذکر کیا گیا مگر آپ نے فرمایا کہ اسلام کا نظام قانون بغیر وقوع جرم اور ثبوت کے کسی ہاتھ پر ڈالنے کی اجازت نہیں دیتا خواہ امیر المومنین کی ذات خطرے میں ہو۔"

یہ دو حوالے دینے کا مطلب یہ ہے کہ سیاست و حکومت کی فرسودہ عادات کبھی

اچھی روایت کو جنم نہیں دیتی بلکہ کوئی نئی اور اجلی روایت سیاست وحکومت کو قدر و منزلت عطا کرتی ہے ہر شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھنا، دل میں اندیشوں کو پالنا، مخالفت کے شعبے میں کسی کا گھیراؤ کرنا، مقدمات کی طویل فہرست بنانا، ذہن میں پہلے سے طے شدہ باتوں کی بنیاد پر اقدام کرنا اور ماضی کے فارمولوں پر چلنا ایک عام سی عادت اور پامال روایت ہے۔

پاکستان کی سیاسی وحکومتی تاریخ نصف صدی سے اپنی عمومی عادات اور پامال روایات کی تاریخ ہے جنرل صاحب آپ بارش کا پہلا قطرہ اور نئی طرحوں کا پیش خیمہ بن جایئے شائد اس سے قدرت کو پاکستان پر رحم آ جائے اور سیاست وحکومت نئے مگر خوشگوار تجربے سے آشنا ہو جائے جناب محترم پہلا کام تو یہ کیجئے کہ ممکن حد تک ۱۹۷۳ کے آئین کی پاسداری کیجئے گو کہ آپ نے چیف ایگزیکٹو کے طور پر اس آئین پر حلف نہیں لیا لیکن آرمی چیف کے طور پر آپ نے اس کی حرمت، حفاظت اور اطاعت کا حلف اٹھایا ہوا ہے اگر کہیں آپ محسوس کریں کہ آئین کی فلاں شق کے ہوتے ہوئے ریاست کے مفاد اور وجود کو فی الواقع اور بہت بڑا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے تو صرف اسے ناگزیر حد تک معطل کیجئے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ آپ ریاست اور اپنی حکومت کا فرق واضح طور پر اور پوری دیانت کے ساتھ ملحوظ رکھیئے آپ اپنے حکومتی سیٹ اپ اور ریاست کو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم اور مترادف نہ سمجھئے آئین بہر حال ریاست کو چلانے کے لیے ہوتا ہے اگر ریاست کو گزند پہنچنے کا احتمال ہو تو پھر دستور کو تقدس اور بالا دستی حاصل نہیں مگر حکومت کو ضعف پہنچے تو پہنچنے دیجئے اسی سے ریاست مضبوط اور مستحکم ہو گی اور ظاہر ہے ریاست (پاکستان) کا استحکام آپ کا بھی ہر شہری کی طرح جزو ایمان ہے، یہ روایت آئندہ نسلوں کیلئے ریاست اور آئین کا تحفظ اور تقدس کی یادگار اور زندہ علامت بن جائے گی۔

دوسرا کام یہ کیجئے کہ اپنی پسند اور اپنے تحفظ یا مستقبل کو سامنے رکھ کر کوئی سیاسی

سانچہ اور حکومتی ڈھانچہ تشکیل نہ دیجئے جیسا کہ ایوب خان نے کیا یحییٰ خان نے کوشش کی اور جنرل ضیاء نے تشکیل دیا بالآخر یہ چیز ملک کے حق میں ضرر رساں ثابت ہوتی ہے آپ اس معاملہ میں جس قدر غیر جانبدار خالی الذہن اور بے نیاز ہوں گے اس درجے میں ملک کے وقار و استحکام میں اضافہ ہوگا آپ پامال راہوں کے مقلد راہی نہ بنئے اپنا کام منازل کے سنگ میل تراشنے والوں میں درج کرائیے تا کہ اہل پاکستان دنیا کے سامنے سینہ تان کر کوئی نام اور کردار تو پیش کر سکیں۔

تیسرا کام کیجئے کہ مقدمات صرف لوٹ مار، بدعنوانی، اختیارات سے تجاوز اور ظلم و ستم کے حوالے سے سامنے لائیے، سیاسی مقدمات بنانے کے لٹیروں اور بد عنوانوں کو مظلوم بننے کا موقع فراہم ہوتا ہے آپ کی حکومت اتنی کمزور نہیں کہ بے نظیر کی ایک پریس کانفرنس کلثوم نواز کی ایک تقریر، نسیم ولی خان کے ایک بیان، تہمینہ دولتانہ کی ایک پریس ریلیز اور عابدہ حسین کی ایک کارنر میٹنگ سے لرز اٹھے، ہمارے ہاں سیاسی مقدمات اپنا اعتبار کھو چکے ہیں، تقریر کی بنیاد پر لاؤڈ سپیکر کے استعمال پر اور اخباری بیان جاری کرنے پر مقدمات کا اندارج ایک از کار رفتہ روایت ہے جس کا کوئی نوٹس نہیں لیتا، طیارہ سازش کیس میں جو ملزم بری ہوئے ہیں انہیں رہا کر دینا چاہیے تھا آخر وہ سلیمانی ٹوپی پہن کر کہاں چھپ جاتے ان پر مضبوط مقدمات بنا کر پھر سے گرفتار کیا جاتا تا کہ کوئی مقدمہ سیاسی رنگ اختیار نہ کر سکے، ان ملزموں میں سب چھلنیاں ہیں جن میں سینکڑوں سوراخ ہیں مالی بے ضابطگیوں اختیارات کا ناجائز استعمال، حکومتی سطح پر کرپشن اقرباء نوازی کے کئی داغ ان کے دامن پر ہیں انہیں سامنے لایا جاتا مختصر یہ کہ سیاسی نوعیت کا کوئی بھی مقدمہ ہرگز قائم نہ کیجئے ہاں یہ لوگ اپنے خلاف ہر مقدمے کو سیاسی کہیں گے لیکن آپ اس کی پرواہ نہ کیجئے عارف نکئی، منظور وٹو اور جعفر لغاری کے شور مچانے سے کیا ہوا! اب نئی طرح ڈالنے کی ضرورت ہے۔

درباری دانشوروں کے نام

یہ لطیفہ تو ہر ایک نے سن رکھا ہوگا کہ ایک بادشاہ نے ایک روز دربار میں بینگن ہاتھ میں لے کر کہا یہ مجھے بہت مرغوب ہے، درباروں سے پوچھا تمہارا اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔؟

ایک درباری اٹھا اور عرض گزار ہوا حضور! بینگن کے کیا کہنے، یہ سبزیوں کا بادشاہ ہے پکا کر کھاؤ، تل کر کھاؤ، یا بھون کر، اس کا اپنا ہی مزا ہے، رنگ ایسا کہ نگاہ بھر کر دیکھیں تو آنکھوں میں سما جاتا ہے اور ہاتھ لگائیں تو اتنا نرم اور چکنا کہ ہتھیلی اس پر ٹھہرتی نہیں جالینوس نے تو اسے سو بیماریوں کے لئے شفاء بتایا ہے۔ دوسرے دن بادشاہ کا مزاج بگڑا ہوا تھا، بینگن اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور کہا کہ یہ سبزی ہے یا زہر؟ میرا تو کل سے منہ کا ذائقہ خراب ہے پہلے روز والا درباری اٹھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا سرکار! مجھے معلوم نہیں ورنہ اس کا سر پھوڑ دوں جس نے اسے سبزیوں میں شمار کیا ہے اسے تو جانور بھی منہ نہیں لگاتے، اس کی شکل دیکھو تو مکروہ اور ہاتھ لگاؤ تو گھن آئے جب وہ درباری اپنی ہجو مکمل کر چکا تو بادشاہ کڑک کر بولا تمہیں شرم نہیں آتی کل تو تم اسے امرت دھارا بتا رہے تھے اور سبزیوں کا سردار، اب کیا بک رہے ہو؟ درباری اٹھ کر نیم رکوع کی حالت میں سلام بجالاتے ہوئے کہنے لگا "میرے آقا! میں آپ کا غلام ہوں اس بینگن کا تو نہیں ہوں۔"

یہ قصہ بدنام تو لطیفہ کے طور پر ہے لیکن ہے یہ امر واقعہ ہر دور، ہر دربار اور ہر در

باری پر صادق آنے والا، کسی نے تصدیق کرنی ہو تو کیخسرو اور نوشیرواں کے دور لیکر میاں نواز شریف کے عہدِ حکومت کا ریکارڈ دیکھ لیے یہ ''بینگن'' ہر جگہ نظر آئے گا۔ درباری دانشوروں کا ہمیشہ یہی کام رہا ہے کہ وہ مزاج یار دیکھ کر سر تسلیم خم ہوتے ہیں۔ ملک غلام محمد چنگا بھلا آدمی تھا مگر اس کو ان درباری دانشوروں نے بگاڑ دیا۔ جو اس کے ہر لا یعنی اقدام کو ''قدرت کا انعام'' قرار دیتے رہے یہ انہی کا کمال تھا کہ ایوب خان نے بنیادی جمہوریتوں کا فلسفہ دیا تو برساتی منڈیوں کی طرح دائیں بائیں ہر کونے کھدرے سے ''دانشور'' ٹراتے ہوئے اُمڈ پڑے کہ اگر بنیاد نہ ہو تو عمارت کیسے کھڑی ہو سکتی ہے؟ بنیادی جمہوریت ہی تو حقیقی جمہوریت کی فطری آغوش ہے جس میں پرورش پا کر یہ ملک کے لئے نعمت ثابت ہوتی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے ''سویلین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر'' کا عہدہ سنبھالا تو چاروں دانگ ڈھنڈیا پٹ گئی کہ یہ ''عوامی مارشل لاء'' ہے کسی نے اس مضحکہ خیز ترکیب پر غور کی زحمت ہی نہیں کی، عوامی اور مارشل لاء سبحان اللہ (کیا عجیب صنعت تضاد تھی)

جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگایا تو ایسے دانشور بھی تھے جو پکار اٹھے کہ ''پہلا مارشل لاء تو خود حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لگایا تھا جب تن تنہا فتنہ ارتداد کی سرکوبی کو نکل کھڑے ہوئے اور صحابہ کرامؓ اختلاف کرتے رہ گئے'' مسز بے نظیر بھٹو کو ایسے ہی دانشوروں نے حالیہ انجام سے دوچار کیا ہے کہ بی بی! آکسفورڈ کی ساری ذہانت اور مشرق کی ساری روایت آپ میں جمع ہو گئی ہے آپ تو پارس ہیں پتھر کو سونا بنا دینے والی آج وہ اپنے نصیبوں کو دوش اور دانشوروں کو کوس رہی ہیں رہ گئے جناب میاں نواز شریف ایک سیدھے سادھے بے فکر سے آدمی تھے مگر یاروں نے انہوں ''عہد جدید کا مفکر'' بنا دیا اور وہ بھی اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ واقعی میں پروفیسر مشکور حسین یاد پاس

گورنمنٹ کالج میں نہیں بلکہ افلاطون کے پاس یونان میں پڑھتا رہا جب وہ وزیر اعظم تھے اور کارگل کا ایشو اٹھا تو درباری دانشوروں نے اسے ”معرکہ بدر و حنین“ کے مماثل قرار دے دیا اور جب میاں صاحب معاہدہ واشنگٹن کر کے آئے تو انہی لوگوں نے ”صلح حدیبیہ“ کے مندرجات Quote کرنے شروع کر دیئے یا للعجب اس زمانے کے کالم، تجزیے اور اداریے پڑھ کر بنیکن والا قصہ یاد آجاتا ہے، بھلا دربار اور دانش کا آپس میں کیا رابطہ اور رشتہ ہے؟ دربار غرور حسن میں گرفتار اور دانش غیرت عشق کی علمبردار، دونوں میں یکجائی کیسے ممکن ہے؟ دربار کو نوکر مطلوب ہوتے ہیں، دانشور نہیں، جسے نوکر بننا گوارا ہوا سے کوچہ دانش چھوڑ دینا چاہیے، دانش دیانت کا نام ہے جب کہ درباداری سراسر منافقت دانش زہر پی لیتی ہے مگر عہد کم ظرف میں جی نہیں سکتی، اور دانش بازار کی چیز نہیں جو دکانوں پر دستیاب ہو بلکہ یہ نور ہے جو دل کے نہاں خانوں میں پھوٹتا ہے۔ مرغزار کالونی لاہور کے میرے ایک کرم فرما ڈاکٹر محمد عبداللہ جو سیاسی ذوق کیساتھ ساتھ اچھا شعری ذوق بھی رکھتے ہیں انہوں نے ”درباری دانشوروں کے نام“ سے کچھ شعر موزوں کئے ہیں۔ جو بہت برمحل اور برجستہ ہیں قارئین کی ضیافت طبع کے لئے حاضر ہیں۔

وہ کرے الٹا یا سیدھا آپ گن گاتے رہیں
جو بھی وہ کہہ دے اسی پر صاد فرماتے رہیں
فہم کے قابل نہ بیشک بات ہو اس کی مگر
جامہ مفہوم پر بھی اس کو پہناتے رہیں
باندھ سکتے ہیں بخوبی آپ تعریفوں کے پل
آسمان کے آپ تارے توڑ کر لاتے رہیں
روزناموں ہفت روزوں کا بے مصرف اور کیا؟

نت نئے ان میں قصیدے آپ چھپواتے رہیں

جس کے چہرے پر لکھی ہو بزدلی کی داستاں

فاتح دوراں کا اس کو تاج پہناتے رہیں

جرم بن کر رہ گئی ہو زندگی جس دور میں

آپ ایسے عہد کی برکات گنواتے رہیں

بے ضمیری کے اگر طعنے ملیں، ملتے رہیں

کیا ضروری ہے کہ اس پر آپ شرماتے رہیں

داد کے قابل ہے ویسے استقامت آپ کی

جھوٹ کا طومار باندھیں اور اتراتے رہیں

سادہ لوح شاعر کی باتوں کا برا مت مانیے

یہ سمجھتا ہی نہیں گو لاکھ سمجھاتے رہیں

جنرل صاحب آپ بھی دائیں بائیں دیکھ لیجیے، کہیں درباری دانشور کان پر "قلم" رکھ کر نہ کھڑے ہوں ہر دور میں صرف اسلوبِ بیان بدلتا ہے قصیدے کا عنوان وہی رہتا ہے۔

ٹی وی یا ٹی بی؟

جب سے موجودہ حکومت نے کاروبار مملکت سنبھالا ہے کسی اور شعبے میں کارکردگی دکھائی ہو یا نہ اور لوگوں نے کوئی نئی تبدیلی محسوس کی ہو یا نہ ''مگر الیکٹرانک میڈیا پر ایک گونہ ''رنگین شباب'' آ گیا ہے بلکہ صحیح تر لفظوں میں ''چھا'' گیا ہے ایک ''وکھری ٹائپ'' کا کلچر روز افزوں ہے آج کل کے ٹی وی پروگرام دیکھ کر یہ تاثر قائم اور نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی تامل محسوس نہیں ہوتا کہ موجودہ حکومت ملک کا سیاسی کلچر بدلے نہ بدلے اور معاشی ڈھانچہ سنوارے نہ سنوارے قوم کا سماجی رویہ ضرور بگاڑ دے گی، سابقہ حکومتوں کا ریکارڈ بھی اگرچہ چنداں قابل رشک نہیں رہا مگر ایک باریک سا چلمن ضرور تھا جسے موجودہ حکومت نے اسے بلا تکلف گرا دیا، اور نظارہ عام کی دعوت دے دی، بدمستی کا ایک سیلاب ہے جو پردہ سیمیں پر چڑھائی کرتا آ رہا ہے سابقہ حکومت نے جن پاپ سنگرز پر پابندی عائد کر رکھی تھی وہ سب کے سب اپنے مکروہ چہروں خوفناک بالوں اور بد ہیئت کپڑوں کے ساتھ صبح و شام مظاہرہ فن فرماتے نظر آتے ہیں ہر گلوکارہ کے ساتھ مشٹنڈوں اور مچھندروں کا ایک غول محوِ رقص ہوتا ہے اور رقص کا تو خیر نام ہے اسے ایک بے ہنگم اچھل کود اور بیہودہ غل غپاڑہ کہنا زیادہ مناسب ہے کچھ عرصہ پہلے پی ٹی وی ورلڈ ایوارڈ کی تقریب ہوئی جس نے پوری رات ٹی وی پر قبضہ رکھا اور کھربوں کے مقروض قوم نے جس تانا شاہی عیاشی اور رنگیلا شاہی خرمستی کا

تماشا برپا کیا، یہ پاکھنڈ ماتم اور مذمت دونوں کے قابل ہے۔

دراصل قدرت جب کسی قوم کو روگی اور نفسیاتی مریض بنا دیتی ہے تو اس کا پہلا اظہار یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم ہر چیز کا استعمال الٹے اور غلط طریقے سے شروع کر دیتی ہے اور یہ بدمذاقی کسی ایک شعبے میں نہیں زندگی کے تمام گوشوں کا لازمہ بن جاتی ہے۔ کیا سیاست اور معیشت اور کیا معاشرت اور اخلاق سبھی اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا کے تین بنیادی مقاصد بتائے جاتے ہیں، پہلا معلوماتِ عامہ، دوسرا تعلیم و تربیت اور تیسرا تفریح ان تین مقاصد سے بھلا کسی مہذب شریف اور باذوق آدمی کو کیا اختلاف ہو سکتا ہے اگر ہمارا ٹی وی ان تین مقاصد کی روشنی میں اپنے پروگرام تشکیل کرے اور ترتیب دے تو کسی کے لیے نہ اعتراض کی گنجائش ہے اور نہ احتجاج کی ضرورت مگر ٹی وی کا باوا آدم ہی نرالا ہے اس کی سکرین پر انفرمیشن کی جگہ یا تو مس انفرمیشن ہوتی ہے یا پھر ڈس انفرمیشن یعنی مکمل جھوٹ یا پھر نامکمل سچ، ایجوکیشن کی بجائے فلسٹریشن، ڈپریشن اور فرسٹریشن پھیلا رہا ہے۔ رہ گئی انٹرٹینمنٹ یعنی تفریح اور ضیافتِ طبع، تو اس کا حال سب کے سامنے ہے، تفریح ذہنی و اخلاقی تخریب کا نام رہ گیا ہے اور ضیافت کے پردے میں کثافت کو رواج دیا جا رہا ہے ٹیلی وژن کی انفرمیشن کریڈیبلٹی کا عالم تو یہ ہے کہ ادھر خبرنامہ لگا اور ادھر ناظرین سوئچ آف کر دیتے ہیں رہ گئی ایجوکیشن تو اس کا دائرہ دینیات، سائنس، ٹیکنالوجی، اور شعر و ادب کی بجائے بیوٹی پارلر پروگرام، بوتیک انفرمیشن اور غیر ملکی کھانوں کی ترکیب بتانے تک محدود رہ گیا ہے۔

لے دے کے، اربابِ حل و عقد کے پاس تفریح کا بہانہ رہ جاتا ہے جس پر وہ سارا زور صرف کرتے ہیں اور کسریں نکالتے ہیں بلکہ پوری قوم سے اپنی آسودہ خواہشوں اور مجروح آرزوؤں کا بدلہ لیتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی شریف ان کے ذریعہ شوبز پالیسی پر تنقید کر دے تو ان کی ٹکسال کا گھڑا گھڑایا فقرہ سننے کو ملتا ہے "ملا لوگ عوام

کو چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے بھی محروم کر دینا چاہتے ہیں۔ گویا لوگ اخلاق، شرافت، تہذیب، حیاء، حجاب، رکھ رکھاؤ، عفت عصمت اور غیرت وغیرہ صرف مولوی کا مسئلہ رہ گیا ہے باقی لوگوں کو ان چیزوں سے کوئی سروکار نہیں حالانکہ یہ مفروضہ غلط ہے آج بھی پاکستان کے کروڑوں گھروں میں اخلاق کی خوشبو، شرافت کی مہک تہذیب کا رچاؤ، حیاء کی دولت، حجاب کا رویہ، رکھ رکھاؤ کا سلیقہ، عصمت کی قدر قیمت اور غیرت کی روایت ہے، یہ صرف چند ارباب بست وکشاد کا مسئلہ ہے کہ وہ زبردستی ایک نامانوس تہذیب ایک بیہودہ فیشن اور ایک نئے کلچر کا زہر عوام کے حلق میں انڈیل رہے ہیں اور لوگوں کو خواہی نخواہی اس کا قائل اور عادی بنا رہے ہیں۔

جو کچھ ٹی وی پر نظر آتا ہے یہ ہمارے شہروں اور دیہاتوں کا منظر نہیں صرف نگار خانوں کا عکس ہے۔ ٹی وی کا انداز، بولی ٹھولی، لٹک مٹک اور چہل بازی ہمارے گھروں میں ہرگز رائج نہیں آخر کس گھر میں بیٹی باپ کو اور بیٹا اپنی ماں کو ''یار'' کہہ کر بلاتا ہے؟ مگر ٹی وی پر یہ سننے کو ملتا ہے جسموں کا اس انداز سے تھرکنا اور آنکھوں کا مٹکنا نگار خانے کے سوا کہاں دکھائی دیتا ہے؟ ہر وقت عشق کا بخار اور معاشقوں کا خمار، نارمل زندگی میں کہاں نظر آتا ہے؟ کیا ڈرامہ بس اسی کا نام ہے کہ ہر لڑکی کو معاشقہ سوجھے اور لڑکا اغوا کا منصوبہ باندھے؟

چند عفونت زدہ گھر، چند بگڑے ہوئے لوگ اور چند الجھے ہوئے خاندان اس بیان کا شکار ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سرکاری وسائل کے زور پر اس میراث مکروہ کو ہر گھر کا اثاثہ بنا دیا جائے۔ ہر ذہن کا زاویہ بنا دیا جائے اور ہر سوچ کا محوری نقطہ بنا دیا جائے۔ ہمارا ٹی وی اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ وہ ہر نوجوان کو ''رانجھا'' اور ہر لڑکی کو ''ہیر'' بنا دے اور کوئی آڑے آئے تو اسے ''کیدو'' کا نام دے کر رسوا اور بدنام کر دے ابھی ہمارے ملک میں ایسے ''باحوصلہ'' افراد نہ ہونے کے برابر ہیں جو اپنی

بیٹیوں کو بیوٹی پارلر سے تیار کر کے اور خوشبو میں نہلا کر اور ننگی بانہوں کے ساتھ لوگوں کے سامنے لاتے اور داد پانے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ٹی وی چاہتا ہے کہ ایسے "حوصلہ مندوں" کی تعداد بہت بڑھے تاکہ کوئی ناک بھوں چڑھانے والا نہ رہے سچی بات یہ ہے کہ ہم جس شوق کے اندھے غار میں گر رہے ہیں خدا نہ کرے اگر ایک بار گر گئے تو قسمت میں تاریکی اور معاشرت میں درندگی کے سوا کچھ نہیں رہے گا۔ کوئی سلیم العقل فنون لطیفہ کا منکر نہیں مگر ہر صالح فطرت شخص نمائش کثیفہ کا ضرور دشمن ہے۔ کیا باقی محاذ ہم نے سر کر لئے ہیں صرف "فنون لطیفہ" کا محاذ فتح کرنے کو رہ گیا ہے؟ تاریخ میں تو قوموں کے ایام زوال میں طاؤس و رباب داخل ہوتے ہیں ہم نے تو ابھی عروج کا سفر شروع ہی نہیں کیا اور زوال کے اسباب فراہم کرنے میں لگ گئے ہیں خدارا ٹی وی کو اخلاقی ٹی بی بنانے سے گریز کیا جائے اور پہلے سیاسی و معاشی طور پر منتظر قوم کو سماجی انتشار سے بچایا جائے۔

نمائشی کلچر

معلوم ذرائع کی حد تک یہ بیماری سب سے زیادہ ہمارے معاشرے میں ہے کہ اس پر نمائش کا لیپ بہت چڑھا ہوا ہے اور ہماری ساری ذہنی نفسیاتی اور سماجی آسائش اسی نمائش پر منحصر ہے۔ حکمران صرف وہی اقدامات کرتے ہیں جن سے ان کی واہ واہ ہو، ڈھول بجیں، تالیاں پیٹیں اور زندہ باد کے نعرے گونجیں حکومت ہر وہ اہم قومی منصوبہ زیرالتواء رکھتی ہے جو دیرپا اور دوررس تو ہو مگر ان کی حکومت اور سیاست کے لئے فوری نتیجے اور تحسین کا باعث نہ بنتا ہو، الیکشن کا وقت آجائے تو سردخانے میں پڑے سارے منصوبے اچانک سامنے آجاتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ خدمت، مقبولیت اور حائت کا تاثر ابھرے اربوں روپے سے معرض وجود میں آنے والے منصوبے سے لیکر گندے نالے پر بننے والے پل کا افتتاح ملک کا حکمران اعلیٰ خود کرنا چاہتا ہے اور اس وقت اس کی آنکھوں کی چمک، چہرے کی تمتماہٹ، گالوں پر سرخ ڈورے اور لبوں پر بشاشت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے جب وہ ہاتھ میں قینچی اٹھا کر فیتہ کاٹ اور اپنے نام کی نصب شدہ تختی کا نقاب اٹھا رہا ہوتا ہے، موٹروے سے لیکر بھائی پھیرو کے بائی پاس کا افتتاح بھی سب سے بڑا مقتدر خود کرتا ہے تاکہ تالیوں کی گونج، لوگوں کی دھمال، ڈھول کی تھاپ، کارکنوں کا بھنگڑا اور ہاروں کا انبار اس کے ذوق نمائش کی تسکین کر سکے۔

حکمران یہ سمجھتے ہیں کہ کسی عمارت کی پیشانی پر ان کا کہا ہوا نام انہیں امر کرنے کے لئے کافی ہے، ان کے نام کا لہراتا بینر چار دانگ عالم میں ان کی شہرت کا پھریرا لہرانے کے لئے بہت ہے، اور ان کی تقریر کے دوران ابھرنے والے نعرے اور گونجنے والی تالیاں گویا تاریخ کے گراموفون میں ریکارڈ ہو گئی ہیں حالانکہ اس سے بڑھ کر طفلگی اور مضحکہ خیزی اور کوئی نہیں ان باتوں کی حقیقت پانی کی لہروں پر بننے والے نقش سے زیادہ نہیں یہ تالیاں مکھن کی ٹکیاں ہوتی ہیں جو وقت کی دھوپ نکلتے ہی پگھل جاتی ہیں یہ نعرے تراشے ہوتے ہیں جو حالات کے پانی میں ذرا سی دیر میں گھل جاتے ہیں اور یہ تختوں پر لکھے نام ریت کی لکیریں ہوتی ہیں جو ہوا کے ایک جھونکے سے مٹ جاتی ہیں۔ اگر یہ نعرے، یہ طغرے، یہ سپاسنامے، یہ قصیدے، یہ نغمے، یہ بھنگڑے، یہ باجے، یا جلسے اور یہ تمغے تاریخ کی بارگاہ میں معتبر اور پائیدار ہوتے تو غلام محمد، سکندر مرزا، ایوب خان اور یحییٰ خان فراموش کے طاقچے اور عبرت کے چوکھٹے میں سجے ہوئے نظر نہ آتے ہیں بلکہ جبینِ وقت پر جھومر بن کر چمک رہے ہوتے ہیں یہ تو ہے ہمارے ہر دور کے حکمرانوں کا معاملہ، ہم سب کا حال بھی اس سے مختلف نہیں ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہم خود سے نہ پہچانے جائیں بلکہ لاحقے سابقے ہمیں معتبر بنائیں اور تو اور ہم اپنے مرحوم عزیزوں کی قل خوانی بھی اس شان سے کرتے ہیں کہ لوگوں کو اپنی انگلیاں دانتوں میں دبانے پر مجبور کر دیتے ہیں تا کہ کسی طرح تو ہماری دھاک بیٹھے، آنجہانی دیوان سنگھ مفتون نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل کتاب "ناقابل فراموش" میں کہیں لکھا ہے کہ میں جب جیل میں تھا تو کسی قیدی کو صبح پھانسی چڑھنا تھی، آخری ملاقات کے لئے جب اس کے ورثاء و اقارب آئے تو وہ ان سے کہہ رہا تھا کہ میرے جنازے کے ساتھ بانس باندھے جائیں اور میرے جنازے کا علاقہ بھر میں اعلان کیا جائے حالانکہ یہ سب کچھ ہو بھی جاتا تو اس مردے کو کیا خبر یا اس کا کیا فائدہ؟ کچھ ایسی

کیفیات ونفسیات سے ہم سب دوچار ہیں یہ ذہنی نابالغی اور فکری پختگی کی علامت ہے۔ حجام کے دام چلا کر ہم سیٹھ بننا چاہتے ہیں۔ یہ شیر بنگال، شیر پنجاب، قائد اعظم ثانی، قائد عوام، محافظ جمہوریت، خطیب پاکستان، عالمی مبلغ اسلام، پیرِ طریقت، نابغہ عصر، مفتی اعظم، یہ سارے القاب وخطابات اسی نفسیات کے آئینہ دار ہیں ہم خود ہی اپنے لئے یہ القاب تجویز کرتے ہیں انہیں مشتہر کرتے اور لوگوں کے منہ میں ڈالتے ہیں ورنہ کسی کو ہمارے ساتھ اتنی بڑی دم لگانے کی کیا پڑی ہے؟

ایک صاحب مجھے ملے اور انہوں نے مجھے اپنا پتہ اپنے دست مبارک سے لکھ کر دیا اور اپنے نام کے ساتھ بقلم خود علامہ پیر..... تحریر کر کے عنائت فرمایا اور میں دل ہی دل میں ان کے حوصلے کی داد دے کر رہ گیا۔ ایک وزٹنگ کارڈ اب بھی میرے پاس موجود ہے اور ظاہر ہے وزٹنگ کارڈ کا مطلب لینا نام، ایڈریس اور فون نمبر ہوتا ہے تا کہ کوئی ملے تو دے دیا جائے ہر جگہ کاغذ قلم تو ہمراہ نہیں ہوتا مگر وہ وزٹنگ کارڈ دیکھ کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ جب ان صاحب کے اسم گرامی کے ساتھ شیخ الحدیث والفقہ پیر طریقت...... کے القاب مندرج نظر آتے ہیں یہ عجوبے بہت سے مواقع پر نظر آتے ہیں۔

مغرب والے بہت برے ہیں لیکن کم ازکم وہ اس طرح کی پھلجھڑیاں نہیں چھوڑتے۔

اپنی نگرانی میں آٹھ رنگہ اشتہار چھپوانا، اس پر اپنی مرضی کے مطابق جلی حروف میں نام لکھوانا اور اپنے نام کے ساتھ دل دہلا، ہوش اڑا اور حشر اٹھا دینے والے القاب وخطابات تجویز کرنا اور پھر جلسہ گاہ میں اپنے آدمی بھیج کر فقید المثال اور پر جوش استقبال کروانا اور سٹیج سیکرٹری کو چٹ بھیج کر اپنا نام مجوزہ القاب کے ساتھ پکارنے کی تاکید کرنا یہ معمولات بہت حد تک عام ہیں۔

حالانکہ شہرت اچھی ہوتو بڑے بڑے ہجوم میں بھی آدمی پہچانا جاتا ہے، نام معتبر ہوتو القاب کا محتاج نہیں رہتا، علم پختہ ہوتو ایک ہی دلیل مخاطب کا ذہن متوجہ کر لیتی ہے خطابت میں حسن ہوتو پہلا ہی جملہ چونکا دیتا ہے شخصیت پرکشش ہوتو کھدر میں اور بھی نکھر جاتی ہے چہرہ حسین ہوتو پتھروں کے ڈھیر میں پڑے ہوئے ہیرے کی طرح نظر آجاتا ہے کوئی گل لالہ ہوتو فطرت اس کی خود ہی حیا بندی کرتی ہے۔ قطرہ شبنم گھاس جیسی بے مایہ چیز پر بھی پڑا ہوتو ہر آنکھ سے خراج پالیتا ہے۔

دنیا کا کوئی میک اپ تازہ اور صحت مند خون کی لالی کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اگر مصنوعی القاب سے کوئی معتبر بنتا ہے تو یزید آج ''امیر المومنین'' ضرور کہلاتا آخر اس نے بھی تو منبر پر اپنے نام کے خطبے پڑھوائے تھے۔ اگر جعلی عکس سے نام بڑا بنتا تو آج دنیا دو پیسے گز کے کھدر پہنے، میلی چادر اور ڑھنید ھاگوں کے فریم والی عینک لگانے اور تنور پر بیٹھ کر کلچا اور چھولے کھانے والے حسرت موہانی کو ''رئیس الاحرار'' نہ کہتی بلکہ یہ لقب کسی انگریز کے ٹوڈی سے منسوب ہوتا، جنہوں نے بڑا بننے اور دلوں میں جگہ پانے کی ہر کوشش کی مگر رائیگاں رہی۔

ہمارے سماجی رویے بھی اسی نمائشی کلچر کے آئینہ دار ہیں دور پرے کا کوئی رشتہ دار ایس پی یا ڈی سی ہوگا تو اس سے اپنا رشتہ جتائے بغیر ہمارا تعارف مکمل نہیں ہوتا اپنا عہدہ بتائے بغیر ہمارا ہاضمہ درست نہیں رہتا اور اپنا شجرہ نسب گلے میں لٹکائے بغیر ہمارا گزارا نہیں ہوتا حالانکہ ہر دور، ہر خاندان اور ہر شہر و دیہات میں سپوت اور کپوت ملتے ہیں سپوت وہ جو غریب ماں باپ کا بیٹا ہو اور کسب کمال کر کے خود بھی بڑا بنے اور خاندان کا نام بھی اونچا کرے اور کپوت وہ جو نامور والدین کا بیٹا ہو مگر اپنے کرتوتوں کے خود بھی رسوا ہو اور بڑوں کا نام بھی رسوا کرے۔

شکسپئر ایک معمولی قصاب کا بیٹا تھا آج اس کا حلقہ احباب پوری دنیا پر محیط

ہے اقبال ایک معمولی مگر شریف شخص کے گھر پیدا ہوا مگر آج اس کا فضل وکمال اس کی اگلی اور پچھلی سات پشتوں کے لئے معتبر حوالہ بن چکا ہے۔ ہم اگر طے کر لیں کہ رنگ گورا کرنے والی کریم لگا کر ”انگریز“ نظر آنے کی کوشش نہیں کریں گے، موٹی ناٹ والی ٹائی باندھ کر ”امریکی“ لگنے کی زحمت نہیں کریں گے۔ عباء وقباء کے زور پر پیر طریقت نہیں بنیں گے جبہ ودستار کے رعب سے ”علامۃ الدہر“ نہیں کہلائیں گے۔ اپنے نام کے بینر مال روڈ پر لگا کر ”لیڈر“ کہلوانے کا شوق نہیں پالیں گے۔ شجرہ نسب کے زور پر معزز نہیں ہوں گے اور کلف لگا کر عمامہ پہن کر ”چوہدری“ ہونے کا اشتہار نہیں بنیں گے بلکہ کارکردگی سے انگریزوں سے آگے بڑھیں گے۔ کھدر پہن کر امریکیوں کو چیلنج کریں گے، صحیح طریقے پر چل کر دوسروں کو صحیح راستہ بتائیں گے علم حاصل کر کے عمل کا وقار ملحوظ رکھیں گے۔ بینر لہرا کر نہیں کردار دکھا کر لوگوں کی محبت حاصل کریں گے اور چوہدری بننے کی نہیں آدمی بننے کی جدوجہد کریں گے تو اس مٹی میں بڑا نم ہے اور یہ بہت زرخیز ہے۔ منزل پر وہی پہنچتے ہیں جو منازل کے سنگ میل خود تراشتے ہیں پامال راہوں پر چلنے والے تاریخ کی گزرگاہ میں پامال ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اچھے سیاستدان کہاں سے آئیں؟

چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف اور حکومتی ترجمان نے اس آرزو کا اظہار قدرے تلخی آمیز اور نصیحت آمیز لہجے میں کیا ہے کہ اب برے سیاستدانوں کا کوئی مستقبل نہیں اور اب اچھے سیاستدان آنے چاہئیں بادی النظر میں دونوں باتیں بہت دل آویز اور ولولہ خیز ہیں لیکن ان کے آگے کوہ ہمالیہ جتنا بلند سوالیہ نشان موجود ہے اور اس چوٹی کا سر کرنا اصل مسئلہ ہے۔

اچھے سیاستدان دو راستوں سے آتے ہیں ایک حسن عمل اور دوسرا انتخابی عمل جب کہ ہمارے یہاں حسن عمل "سیاست کا مدار اور معیار نہیں اور انتخابی عمل شفاف اور پائیدار نہیں ان دو راستوں کے علاوہ کسی اور فیکٹری کا نام پتہ ابھی معلوم نہیں جہاں اچھے سیاستدان تیار ہوتے اور کوئی ٹکسال دستیاب نہیں جس میں اچھے سیاستدان ڈھلتے ہوں۔

اچھے سیاستدان کی آرزو عوام کی تو پچاس برسوں سے ہے البتہ تین فوجی حکمرانوں نے گاہے بگاہے اس کا اظہار کیا ہے یہی آرزو جنرل ایوب خان کی تھی اسی خواہش کا اظہار یحییٰ خان نے کیا اور اسی توقع کو جنرل ضیاء الحق نے پروان چڑھایا، ان تینوں ادوار میں کون سے سیاستدان قوم کو نصیب ہوئے یہ سب کے سامنے ہے۔

ایوب خان نے جو اچھے سیاستدان اور حکمران قوم کو مہیا کیے وہ کوئی سربستہ راز نہیں۔ ملک امیر محمد خان، عبدالمنعم، ملک محمد قاسم، خان حبیب اللہ خان، عبدالوحید، احمد سعید

کرمانی، شیخ مسعود صادق، فضل القادر چوہدری، یسین وصو، محمد حیات ٹمن، خواجہ شہاب الدین، اور اسی طرح کے دوسرے لوگ قدم پر مسلط رہے، یحییٰ خان کے دور میں شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو سیاستدان بنے۔

جنرل ضیاء الحق کے اگائے ہوئے سیاستدانوں کا خمیازہ قوم ابھی تک بھگت رہی ہے مزید بھگتے گی۔

جناب نواز شریف جنرل ضیاء الحق کے ہنر کا شاہکار سمجھتے جاتے ہیں، باقی لوگ بھی اسی مزاج کے ہیں، ضیاء صاحب کے دور میں جام غلام قادر، محمد خان جونیجو، ارباب جانگیر، غلام دستگیر خان، چوہدری شجاعت حسین، شیخ رشید، الٰہی بخش سومرو، ظفر اللہ جمالی، الطاف حسین جیسے لوگ سیاسی صف میں نمایاں ہوئے، بیہودہ وڈیروں، صنعتکاروں اور پتھاریداروں کے نام لکھنے کی ضرورت نہیں جو آکاس بیل کی طرح شجر سیاست سے لپٹ گئے اور اسے اجاڑ کر دم لیا، نہ پھول، نہ پھل، نہ پتہ اور نہ شگوفہ ہر چیز کو چاٹ لیا۔

جنرل پرویز مشرف بھی اس آرزو میں بستہ نظر آرہے ہیں۔ آرزو مبارک، مگر عزم کیسے نتیجہ خیز ہو؟ اصل سوال یہ ہے کہ نصف صدی سے اس کا جواب نہیں مل رہا۔

ہمارے نزدیک یہ مفروضہ غلط ہے کہ ملک میں قحط الرجال ہے پاکستان کی سر زمین زرخیز نہیں قوم کی کوکھ بانجھ ہو چکی ہے اور انسانوں کی بھیڑ میں افراد کار دستیاب نہیں یہ بات ہم نہیں مانتے اصل میں کسی حکمران نے گہرائی میں جا کر نہ مسئلے کا جائزہ لیا اور نہ اس حامل ڈھونڈا اور وہ اپنے ہی خواہشات و تحفظات کے خول میں جکڑا رہا، آخر یہ کیا بات ہوئی کہ یہاں اچھے صنعتکار، محنتی کسان، جفاکش، مزدور، تخلیقی ہنرور، نکتہ سنج شاعر، خوبصورت ادیب، سحر البیان خطیب، ذہین طلبہ، بالغ نظر وکلاء، جان فروش مجاہد، حوصلہ مند سپاہی، حکمت کار جرنیل فدا کار رکن اور سماجی خدمت گار تو ایک سے ایک بڑھ کر ہوں مگر یہی قوم اچھے سیاستدان پیدا نہ کرے، یہ کیسے ممکن ہے؟

ہو یہ رہا ہے کہ ہر فیلڈ میں کوئی نہ کوئی قاعدہ اور ضابطہ کارفرما ہے مگر میدان سیاست Free for all بنا ہوا ہے یہاں داخلے خارجے کا کوئی نظام نہیں اور نہ علم وعمل کا کوئی معیار ہے اگر فیلڈ مارشل ایوب خان اپنے اقتدار کو طول دینے کی فکر میں غلطاں نہ ہوتے تو وہ سیاست سے گند صاف کرنے کی پوزیشن میں تھے، اگر یحییٰ خاں کو مستقبل کا صدر بنے کا لپکا نہ پڑتا تو وہ اپنے آپ اور ملک کو برے انجام سے بچا سکتے تھے، اگر جنرل صاحب کے ذہن میں ''امیر المومنین'' کا ضبط نہ سماتا تو وہ قوم کی توقعات کو پورا کر سکتے اور صاف ستھری قیادت کو سامنے لا سکتے تھے۔ جب حکمرانوں کا اپنا دل میلا، ذہن دھندلا اور عزم گدلا ہو جب ان کا واحد ذریعہ معلومات ایس ایچ او اے سی، ڈی سی اور چیف سیکرٹری ہو، جب ان کا دربار جے پکارنے والوں کا مرکز ہو اور جب وہ اپنی مرضی کو قوم اور خدا کی مرضی کا ترجمان اور مترادف سمجھ لیں تو ایسے ماحول میں اچھی سیاست نہ روایت بنے گی اور نہ جڑ پکڑے گی، غیر فوجی حکمرانوں نے بھی یہی وتیرہ اپنایا، مگر انہیں دوش اس لئے نہیں دیا جا سکتا کہ وہ تو چاہتے ہی ایسا انداز سیاست اور اسلوب حکومت ہیں ان سے خیر کی کیا توقع؟ مگر فوجی حکمران تو خلاء پر کرنے کے لئے آتے ہیں انہیں کم از کم مزید رخنے پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

ہم بہ صد خلوص دل کہتے ہیں کہ جنرل صاحب آپ کی آواز مکے اور مدینے لیکن بسم اللہ کیجئے، بنیادی طور پر تین کام کرنے والے ہیں وہ آپ کر گزریئے آپ اپنی آرزو کو اپنے ہی دور میں برگ و بار لاتے دیکھ لیں گے۔ اچھی سیاست اور عمدہ سیاستدانوں کیلئے ضروری ہے کہ

جاگیرداری کی جڑ کاٹ اور کمر توڑ دیجئے محض فنی طور پر نہیں بلکہ سماجی ونفسیاتی طور پر جاگیریں، وڈیروں کا اٹوٹ اور مستقل حلقہ انتخاب ہیں یہ حلقے نہ ٹوٹے تو گردن کے طوق نہیں اتریں گے۔ دولت کو سیاست میں جو بنیادی قدرت کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اس کا قلع قمع انتہائی ضروری ہے۔ حلقوں کا پھیلاؤ، وڈیروں کی غربت

، مسائل کا انبار اور بنیادی ضروریات کا فقدان عوام کو ووٹروں ، جاگیر داروں ، صنعتکاروں، سرمایہ داروں، اور دولت مندوں کی طرف مائل کرنے کا بہت بڑا موجب ہے ایک عام ورکر، پڑھا لکھا، اور سنجیدہ ومتین سیاسی کارکن اس دوڑ میں ہمیشہ اس لئے پیچھے رہ جاتا ہے کہ وہ گھر کا خرچہ چلائے یا ڈیرہ داری کرے۔ ویگن کا کرایہ بھرے یا گاڑیوں کے فلیٹ اپنے ہمراہ رکھے؟ اپنی گلی اور نالی ٹھیک کرائے یا محلے کے لوگوں کے لئے سڑکیں بنائے؟ یہ سارے کام پیسے والے انتخابی مہم کے دوران کرتے ہیں کیوں کہ وہ کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔

(۲) لسانی، علاقائی، مسلکی اور نسلی بنیادوں پر سیاست کو شجر ممنوع بنا دیا جائے، برادری ازم اس ملک کی سیاست کے لئے ناسور بن چکا ہے، اس لئے ذرائع ابلاغ سے لے کر انتظامی احکام تک تمام وسائل بروئے کار لائے جائیں۔ آئین میں ظاہر ہے اس بنیاد پر سیاست کی کوئی گنجائش نہیں۔

الیکشن کمیشن کو اول تو اس قدر بااختیار بنا دیا جائے کہ پوری حکومتی مشینری اس کے تابع ہو حتیٰ کہ جنرل صاحب آپ بھی! ورنہ وہ اتنا بااختیار ضرور ہو جتنا بھارت کا الیکشن کمیشن ہے اور یہ ہمیشہ کے لئے ہو، کسی کے لئے کوئی رعایت، کمیشن کے قواعد میں کوئی نرمی، کوئی نئی بھرتی، کوئی تبادلہ، کوئی ترقی، کوئی تنزلی، کسی حکومت کے لئے الیکشن کے دوران ممکن نہ رہے۔ حتیٰ کہ کوئی سیاسی حکومت کا سربراہ بھی اس دوران سرکاری وسائل پر مہم چلانے کا مجاز نہ ہو اس دوران وہ صرف دستخط کرنے کا مجاز ہو ورنہ اس سے سرکاری گاڑی جہاز اور دیگر تمام سہولیات واپس لے لی جائیں اور وہ جو خرچ کرے اپنی جیب یا جماعت کے فنڈ سے کرے کسی علاقے کا کوئی افسر کسی وزیر اعظم، گورنر، وزیر اور سیکرٹری کا پابند نہ ہو بلکہ صرف الیکشن کمیشن کا پابند ہو۔

ان اصطلاحات سے شائد اچھے لوگوں کے لئے راہ کھلے اور ممکن ہے جنرل پرویز مشرف کی آرزو بر آئے۔

باتیں جنرل اسلم بیگ کی

کھچاؤ تناؤ اور گراؤ پچھاڑو کے اس دور میں اگر چار آدمی مل بیٹھیں تو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے اور یہ مل بیٹھنے والے کبھی کبھار نہیں بلکہ بار بار اور کئی برس سے پوری پابندی کے ساتھ ایک جگہ بیٹھتے ہوں تو غنیمت ہی نہیں بہت بڑی نعمت ہے کونسل آف نیشنل افیئر ز کی یہ ہفتہ وار نشست ہر جمعہ کی شام پانچ بجے ایک مقامی ہوٹل میں ہوتی ہے اور بغیر کسی ناغے اور وقفے سے مسلسل تین سال سے جاری ہے جسمیں دانشور، اساتذہ، صحافی اور کالم نگار شریک ہوتے ہیں اور کوشش ہوتی ہے کہ کوئی نہ کوئی اہم سیاسی و علمی اور دینی وادبی شخصیت بطور مہمان تشریف لائے تاکہ اس سے استفادہ اور حالات کا مدوجزر اور پس منظر معلوم ہو سکے چنانچہ سی این اے کے اس ویکلی فورم پر اب تک بہت سے عمائدین اور اکابرین آ چکے ہیں ان میں سردار فاروق لغاری، قاضی حسین احمد، عمران خان، شاہد حامد (تب گورنر) جنرل اے کے نیازی، جنرل حمید گل، گل محمد جوگیزئی (سابق گورنر بلوچستان) ذوالفقار کھوسہ (تب گورنر) پروفیسر طاہر القادری، غلام مصطفیٰ کھر، حنیف رامے، منظور وٹو، مخدوم شہاب الدین، اعتزاز احسن، راؤ سکندر، خالد کھرل، مخدوم شاہ محمود قریشی، اشفاق احمد اور اعجاز الحق اور دوسرے مقتدر حضرات شامل ہیں۔ گذشتہ جمعہ سابق آرمی چیف جنرل اسلم بیگ مہمان خصوصی تھے، جنرل صاحب محض آرمی چیف نہیں رہے بلکہ وہ ملکی تاریخ کے انتہائی پراسرار دور کے عینی گواہ اور تہہ در تہہ معاملات کے قریبی شاہد ہیں۔

گیارہ برس بعد جب شہری سیاست اور جماعتی حکومت کا آغاز ہوا تو اس وقت گویا پاکستانی سیاست ایک نیا جنم لے اور انوکھا سفر شروع کر رہی تھی ان لمحوں کو بیگ صاحب نے بڑی آگاہی اور ژرف نگاہی سے دیکھا، اور سویلین حکومت سے ''تمغہ جمہوریت'' پایا، اب جنرل صاحب ماشاء اللہ بذات خود ایک ''سیاسی پارٹی'' کے اکلوتے رہنما ہیں۔

دو گھنٹے کی اس طویل نشست میں بہت سی گفتنی اور ناگفتنی باتیں ہوئیں جنہیں چند سطروں کے ذریعے احاطہ میں لانا تو ظاہر ہے ممکن نہیں تاہم جس طرح کہتے ہیں کہ ''اگر در خانہ کس است، یک حرف بس است'' کچھ اشارے ان کی شخصیت اور ہماری سیاست کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں دورہ کلنٹن کے حوالے جنرل صاحب کا کہنا تھا کہ کسی بھی بحث میں پڑے بغیر ارباب حکومت و سیاست کیلئے وقت کی تقسیم بہت اہم اور معنی خیز ہے کہ کلنٹن بھارت میں پانچ دن اور پاکستان میں پانچ گھنٹے رہے۔ ان کے لئے بھارت کی کیا اہمیت اور پاکستان کی کیا حیثیت ہے؟ اس سے امریکی ترجیحات کا اندازہ کر لینا چاہیے، جب ان سے پوچھا گیا کہ کہیں یہ فوجی حکومت کے سبب تو نہیں؟ ان کا جواب تھا ہرگز نہیں جو پیا کو سوہے وہی سہاگن، مطلب ہو تو فوجی اور شہری حکومت کے سارے امتیازات مٹا اور حجابات اٹھا دیئے جاتے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ یہ تاثر دیا گیا ہے کہ جنرل پرویز کی حکومت نے امریکی کا چار نکاتی ایجنڈا منظور نہیں کیا۔ ان کے خیال میں یہ ایجنڈا سر دست منظور کیا بھی نہیں جا سکتا، سی ٹی بی ٹی پر اس وقت دستخط کرنا بھڑوں کے چھتے میں ڈھیلا مارنے کے مترادف ہے اس لئے کہ مجموعی تاثر اس معاہدے کے خلاف ہے۔ پیپلز پارٹی کا عام ورکر اسے انہیں مانتا اگرچہ بے نظیر بھٹو دستخطوں کے حق میں ہے مسلم لیگ ان دستخطوں کو منتخب پارلیمنٹ سے مشروط کرتی ہے جب کہ تمام دینی جماعتوں جن کے پاس سٹریٹ پاور ہے۔ وہ

اس معاہدے کے سخت خلاف اور اس راہ میں زبردست مزاحم ہیں دوسرا مسئلہ کشمیر ہے جو ظاہر ہے نہ تو ایک آدھ ملاقاتوں میں حل ہونے والا ہے اور نہ اس کا حل اتنا آسان اور سادہ ہے تیسری بات دہشت گردی ہے پاکستان امریکہ کے Perception سے قطعاً متفق نہیں خود امریکہ کو دہشت گردی اور جہاد میں فرق کرنا چاہیے ورنہ معاملہ خلط ملط ہو جائے گا خود مختاری کی تحریک کو دنیا کے کسی فورم نے دہشت گردی قرار نہیں دیا۔ رہ گیا اسامہ بن لادن کا معاملہ تو پاکستان کا اول تو یہ مسئلہ نہیں یہ افغانستان کا معاملہ ہے امریکہ کو اس سے بات کرنی چاہیے دوسرے یہ کہ پاکستان اس بارے میں کسی ایسی حرکت کا متحمل نہیں ہو سکتا جس سے پاکستان کا شمال مغربی بارہ سو کلومیٹر کا بارڈر غیر محفوظ اور ناموافق ہوتا ہو جب کہ سولہ سو کلومیٹر کا بھارت سے ملا ہوا بارڈر پہلے ہی حساس بن چکا ہے پاکستان بہر حال اس ایشو پر افغانستان کو Follow کرے گا۔ افغان حکومت جس طرح چاہے اسامہ کا مسئلہ حل کرے پاکستان کو بھی وہی حل پسند ہے، امریکی ایجنڈے کا چوتھا نکتہ جمہوریت کی بحالی کا ٹائم فریم ہے جنرل بیگ نے کہا کہ ٹائم فریم تو تقریباً سامنے آچکا صرف تاریخ متعین نہیں کی گئی، ان کے خیال میں قومی سطح کے انتخابات نومبر ۲۰۰۱ء میں ہوں گے۔

محدود جنگ کے بارے میں تجربہ کار جرنیل کا کہنا تھا کہ اس کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں کیوں کہ بھارت اس سلسلے میں بہت خسارے میں رہے گا روائتی اور محدود جنگ میں پیدل فوج کا نمایاں کردار ہوتا ہے اور اس وقت بھارت اس سے تہی دامن ہے کیوں کہ اس کی پیدل فوج کا ایک بڑا حصہ کشمیر میں الجھا ہوا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس بات میں پاکستان کو برتری حاصل ہے اپنے دیرینہ فارمولے کو دہراتے ہوئے جنرل بیگ نے کہا کہ میں وہ پہلا آدمی ہوں جو بیانگ دہل فوج کے آئینی سیاسی کردار کا داعی اور حامی ہوں اور میری دلیل یہ ہے کہ یہ امر واقعہ ہے حالیہ اقدام

بھی اس دلیل کو اور پختہ بناتا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے ہاں یہ ہوتا آیا کہ جب فوج نے اپنی خواہش سے یا کسی آزمائش میں اقتدار سنبھالا ہے تو اسے بہر حال ''احساس جرم'' ہوتا ہے کہ اس نے درست نہیں کیا جس کے نتیجے میں اس کا اقتدار طول پکڑ جاتا ہے کہ وہ واپس جائے گی تو ممکن ہے سول حکومت کے غضب اور انتقام کا نشانہ بنے چنانچہ وہ جذبات کے ٹھنڈا، سیاستدانوں کے بے بس اور نئی سیاسی کھیپ کے تیار ہونے کا انتظار کرتی ہے تا کہ کوئی اسے عدالت میں گھسیٹتا پھرے اور اس کے لئے اسے بہت سا وقت درکار ہوتا ہے اور فوج کا کوئی دستوری رول ہو تو وہ بوقت ضرورت آئے گی اور جلدی معاملات کو سلجھا کر چلی جائے گی اس لئے اس کے دماغ میں کوئی کھٹکا اور سر پر کوئی بوجھ نہیں لگا۔

بہت سی باتوں کے ساتھ دو چیزیں انہوں نے ایسی کہیں جنہیں باور کرنا حاضرین کے لئے مشکل ہو گیا ایک تو یہ کہ میاں نواز شریف کی حکومت اس لئے ہٹائی گئی کہ وہ شریعت بل پاس کروانا چاہتے تھے اور دینی جماعتوں کے ساتھ اپنی قربت بڑھا رہے تھے۔ یہ بات بدیہی طور پر خلاف واقعہ ہے اس لئے کہ ان صدیوں کے فاصلے پر تھی خصوصا واجپائی کی پاکستان آمد کے موقع پر جو معاملات رونما ہوئے سپاہ صحابہ ان کی سخت مخالف بن چکی تھی ان کے حلیف مولانا نیازی اور تحریک جعفریہ سخت نا قد بن چکے تھے، کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر اسرار احمد جو ان کے حق میں حسن ظن رکھتے اور کلمہ خیر کہتے تھے وہ برملا تنقید کر رہے تھے، کارگل ایشو پر لشکر طیبہ ان سے نالاں تھا، لے دے کے جمعیت اہلحدیث ان کی ہمنوا تھی ان کی دوسری بات بھی بہت دور دراز اور غیر متعلق نظر آئی کہ موجودہ فوجی حکومت امریکہ کی ایماء پر آئی ہے اگر ایسا ہوتا تو کلنٹن کا رویہ وہ نہ ہوتا جو دنیا نے اور اہل پاکستان نے دیکھا۔

ایوان کے انتخابات...... اعتدال پسندوں کی فتح

ایرانی انقلاب تمام تر خارجی دباؤ اور داخلی مشکلات کے باوجود اپنی کامیابی اور استحکام کے اکیسویں سال میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حکومت چلانے کا فن صرف آکسفورڈ کے ڈگری ہولڈرز اور کیمبرج کے فارغ التحصیل لوگوں کو ہی نہیں آتا اگر وژن درست، ٹیم مخلص، ہدف واضح اور عزم محکم ہو تو چٹائی پر بیٹھ کر پڑھنے اور عربی فارسی جاننے والے لوگ بھی بڑے حکیمانہ اور مدبرانہ انداز میں حکومتکر سکتے ہیں اس کے لئے چہرے پر امریکی ماسک چڑھانے، زبان کو انگریزی کا تڑکا لگانے، ذہنوں میں مغربی بت بٹھانے اور یورپ سے پینگیں بڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں، ایران کے انقلاب اور ایرانیوں کے اسلوب حکومت سے مختلف دائروں میں اختلاف کی گنجائش ہے مگر یہ بات طے ہے اور ایرانیوں نے اسلوب حکومت سے مختلف دائروں میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ مگر یہ بات طے ہے اور ایرانوین نے ہر فورم پر یہ حقیقت منوالی ہے کہ اب ایران کے قومی وسیاسی فیصلے لندن اور واشنگٹن میں نہیں ہوتے بلکہ خالصتاً تہران میں ہوتے ہیں اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے، امریکہ ایران سے روٹھ رہا مگر ایران والوں نے اسے منانے کی کوشش نہیں، جہاد افغانستان کے دور میں روس برہم رہا مگر ایران نے سرخم نہیں کیا اور پورا یورپ منہ پھلا رہا ہے مگر انقلابی حکومت نے اپنا سر اٹھائے رکھا شدت تشنگی کے باوجود غیرت میکشی پر صرف نہیں آنے دیا کہ انداز قابل داد بھی ہے لائق توجہ بھی ہے اور باعث تقلید بھی!

ایران نے پہلے روز سے عوام پر اپنا اعتماد برقرار رکھا، اور عوام کی رائے جاننے کا اہتمام بھی کیا اور اس کا احترام بھی، حالت امن اور حالت جنگ دونوں میں یہ رویہ قائم رہا، صدارت اور مجلس (پارلیمنٹ) کے انتخابات اپنے شیڈول کیمطابق ہوتے رہے حتیٰ کہ ایران عراق کے طویل دور جنگ اور ہنگامی حالات میں بھی انتخابات کا تسلسل نہیں ٹوٹا ورنہ یہ بہانہ بڑے بڑے جمہوری ملکوں اور لیڈروں کے لئے بہت سازگار ہوتا ہے کہ وہ انتخابی عمل سے پہلوتہی کر کے اپنی حکومت جاری رکھیں۔

۱۸ فروری ۲۰۰۰ء کو ایران میں پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے وہاں صدر اور پارلیمنٹ کے انتخابات براہ راست بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہوتے ہیں اور سولہ سال سے اوپر کے تمام مرد وزن ووٹ دینے کے اہل ہیں اس بارہ ۲۹۰ نشستوں تقریبا چھ ہزار افراد نے الیکشن لڑا، انقلاب کے بعد ایک کونسل امیدواروں کی چھان بین کرتی ہے اور ایک طے شدہ اور معقول معیار پر اترنے والے لوگ ہی الیکشن لڑنے کے اہل ہوتے ہیں۔

اس طرح بہت سی انتخابی اصطلاحات انقلاب کے بعد رائج کی گئی لیکن اس کے ذریعے من پسند افراد کو آگے لانے اور ناپسند لوگوں کو پیچھے دھکیلنے کی کوئی روایت اور شہادت سامنے نہیں آئی، سب سے پہلے انتخابات میں نئی صدر جیلا لبرل، ماڈرن، اور فرانس کا تعلیم یافتہ شخص صدر مملکت منتخب ہوا جب کہ اس وقت کی پارلیمنٹ کے سپیکر اور اسلامک ری پبلکن پارٹی کے سربراہ اور حلقہ علماء کے نامور اور مستند نمائندے ڈاکٹر محمد حسین بہشتی بنی صدر کے مقابلے میں صدارتی الیکشن ہار گئے تھے۔ حالیہ الیکشن میں بین الاقوامی ذرائع نے قدامت پرستوں اور اصلاح پسندوں کی اصلاح خوب اچھالی اور اس کا مقصد ایران کے اندر زیرزمین لہروں کو سطح پر لا کر کنفیوژن پیدا کرتا تھا مگر میرے نزدیک یہ مغرب کی سادگی ہے یا چالاکی یا پھر خود فریبی اور حماقت ہے ایران میں جتنے

والے، اعتدال پسندوں کی اعتدال پسندی کا ہرگز وہ معنی و مفہوم نہیں جو مغرب لے رہا ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ ایران کے اندر داخلی سطح پر سوچ اور فکر کی دو لہریں ہیں مگر خارجی اور بین الاقوامی اعتبار سے اعتدال پسند انقلاب اور ایران کے اسلامی معاشرے کے اتنے ہی حامی اور علمبردار ہیں جتنے بقول مغرب قدامت پرست ہیں، نئی صدر کے بعد اگرچہ اقتدار کلی طور پر علماء کے ہاتھ میں آ گیا دولی فقیہ کا منصب امام خمینی کے پاس رہا، صدر علی خامنہ ای بن گئے اور سپیکر ہاشمی اسنجانی لیکن کابینہ میں غالب اکثریت حرف عام میں اعتدال پسندوں کی تھی، ڈاکٹر علماء اکبر ولائتی ایک مدت تک وزیر خارجہ رہے اور موجودہ صدر ڈاکٹر خامی خامنہ ای اور مشجانی کے دور صدارت میں وزیر ثقافت و ارشاد اسلامی کے عہدے پر رہے۔

فکر اور حکمت عملی کی دو لہریں بلاشبہ ایران میں موجود ہیں ایک جید اور سکہ بند علماء کی جو مکتبی انداز میں زیادہ سوچتے ہیں اور کتابی اصولوں پر انحصار کرتے ہیں اور نسبتاً پرجوش اور روایت پرست ہیں اور دوسری لہر یہ ہے کہ مکتب و کتاب اپنی جگہ لیکن وقت سے بڑا معلم مرشد اور قاضی اور کوئی نہیں۔ اور قوم کو زمانہ اور وقت کے دھارے سے کٹ کر نہیں رہنا چاہیے ورنہ وقت تو اپنی رفتار کے ساتھ چلتا رہے گا البتہ قوم ایک جگہ رک جائے گی اس سے ایران کے تنہا اور انقلاب کے پسپا ہونے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔ اعتدال پسند زمینی حقائق کو نسبتاً زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ خاتمی کے دور میں ایک بات سے چمٹ کر رہ جانے کے رجحان کم ہوا اور بہت ہی تھوڑے عرصے میں بعض فیصلوں پر نظر ثانی کی گئی۔ مثلاً ایک وقت میں افغانستان کی طالبان حکومت سے اس قدر تناؤ بڑھا کہ افغانستان کی سرحدوں تک ایرانی فوج پہنچ گئی اور انقلاب کی تاریخ کی سب سے بڑی جنگی مشقیں شروع ہو گئیں۔

لیکن جونہی مذہبی حالات میں ذرا سا تغیر واقع ہوا تو طالبان حکومت سے رابطہ

کرنے میں ایران نے کوئی جھجک محسوس نہیں کی پاکستان میں مذہبی حوالے سے ہونے والی دہشت گردی نے ایران اور پاکستان کے درمیان قدرے رنجش پیدا کردی۔ لیکن جونہی پاکستانی حکومت نے صورتحال واضح کی تو دوبارہ گرمجوشی کی روشن چل پڑی اسی طرح مغرب کے بارے میں ایران کا رویہ قدرے لچکدار بنا ہے۔ سعودی عرب سے تعلقات نازمل سطح پر لانے کی کوشش جاری ہے۔ اگرچہ رمسنجانی اپنے دورصدارت میں سعودی عرب کا دورہ کر چکے ہیں اب ذرا پیش رفت تیز ہو رہی ہے شاہ فہد نے ایران کے روحانی اور اعلیٰ ترین رہنما سید علی خامنہ ای کو باقاعدہ اپنے ملک کے دورے کی دعوت دی ہے۔ غیرملکیوں بالخصوص غیر مسلموں اور یورپیوں کے بارے میں ایران کا رویہ جو پہلے ذرا سخت تھا اب نرم ہو گیا ہے اب بہت سے فارنرز تہران میں آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔

یورپ کا پریس جس انداز میں اعتدال پسندوں کی کامیابی کا نقشہ کھینچتا ہے۔ میرے خیال میں یہ یکطرفہ ہے انقلاب کے بعد ایران میں کبھی بھی عورتوں کو گھر میں بند نہیں رکھا گیا مردوں سے زیادہ عورتیں، مارکیٹوں اور بازاروں میں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ جس طرح سکارف کی پہلے پابندی تھی اب بھی ہے۔ ٹی وی نشریات کا جو انداز پہلے تھا وہ اب بھی ہے بیہودہ فیشن شو اگ تر تنگ، اور رقص وسرور پہلے بھی نہیں تھا اب بھی نہیں ہے ڈاکٹر خاتمی اچانک زمین سے نمودار نہیں ہوئے نہ دفعتہً آسمان اترے ہیں دس بارہ سال مرکزی کابینہ میں رہے ہیں اور شروع ان سے انقلاب کے حامی ہیں اور تحریک کے دور سے لیکر حکومت کے قیام کے تمام مراحل میں شریک رہے ہیں نہ وہ ایرانیوں کے لئے نئے ہیں اور نہ ایرانی ان کے لئے اجنبی۔

میری معلومات کیمطابق جسے قدامت پرست اور اصلاح پسند طبقے کا نام دیا جا رہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بنی صدر کی معزولی اور فرار کے بعد علماء کا یہ ذہن بنا کہ

مغربی تعلیم یافتہ لوگ انقلاب کے سامنے میں زیادہ قابل اعتماد نہیں ان کی فکر پر مغرب کا اثر غالب اور ان کے اسلوب پر مغرب کا رنگ چڑھا ہوا ہے جب کہ علماء کی ساری ذہنی و فکر ساخت پرداخت اور سیاسی و سماجی تربیت اسلامی، مشرقی اور ایرانی انداز کی ہے اس لئے یہ طبقہ علماء انقلاب کے فروغ، استحکام اور انقلابی اقدامات کی کامیابی کے حوالے سے بہت پختہ اور مخلص ہے انہی علماء میں بعض کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس طرح کی تفریق ملک و ملت کیلئے مفید نہیں کیوں کہ انقلابی تحریک میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لوگ علماء کے دوش بدوش رہتے ماریں کھائیں۔ جیلیں بھگتیں اور جانیں دیں چند لوگون کے باعث پورے، طبقے کی چھانٹ دینا اور قومی دھارے سے الگ کرنا، مصلحت اور حقیقت دونوں کے خلاف ہے، جدید طبقے کو مرکزی انقلابی دھارے اور حکومتی سیٹ اپ میں پورا پورا مقام ملنا چاہیے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں البتہ خاتمی صدر بننے پر اس سوچ کو مہمیز ملی ہے لیکن جہاں تک انقلاب پر اسلامی رنگ کا تعلق ہے حکومت کے اسلامی اصولوں پر قائم رہنے اور ملکی نظم و نسق اسلامی قوانین کے مطابق چلانے کا معاملہ ہے اور امریکہ کو شیطان بزرگ اور یوری ثقافت کو ناپاک اور ابلیسی ثقافت سمجھنے کا مسئلہ ہے اس میں خامنہ ای اور خاتمی کی سوچ میں کوئی فرق نہیں، اصولی بات تو یقیناً یہی ہے تاہم انسانی معاشرہ خواہ کتنا ہی مثالی اور پاکیزہ ہو انسان ہی تیار ہے اس میں شخص ٹکراؤ، غلبے کی خواہش، پسند و ناپسند حامیوں کی تعداد بڑھانے، اور اپنے ارد گرد حصار قائم کرنے کا جذبہ نہ کبھی مٹا ہے اور نہ مٹ سکتا ہے یہ انسانی خاصہ اور بشری تقاضا ہے۔

اعتدال پسند کے لئے جو لبرل یا ماڈریٹ لفظ بولا جاتا ہے اس پر ایران کی موجودہ قیادت کو قیاس نہیں کرنا چاہیے لبرل اور ماڈریٹ کا مطلب ہے جو سیاسی طور پر مغرب کی جمہوری اقتدار کا من وعن مقلد ہو جہاں خدا کے بجائے انسانی مقتدر

اعلیٰ ہے اور مغرب کی ثقافت کا دلدارہ ہو جس میں عریانی، فحاشی شراب نوشی، بے راہ روی مرد وزن کا آزادانہ اختلاط اور دوسری قباحتیں نمایاں ہیں ظاہر ہے ایران کی قیادت کے ان دو دھاروں میں اس طرح کی کسی بات کا گزرنا قابل فہم اور نا قابل یقین ہے۔

اگر اعدال پسندی سے مراد یہ ہے کہ مذہب کیجو الے سے دوسرے فرقوں پر قدغن نہ ہو ہر فرقے کو اس کے فقہی اصولوں کے مطابق عمل کرنے کی آزادی ہو۔ عورتوں پر بلا جواز پابندیاں نہ لگائی جائیں۔ ہر غیر مسلم کو قابل نفرت اور گردن زدنی نہ سمجھا جائے، ہر دوسرے ملک سے خواہ مخواہ کی پھڈے بازی نہ ہو، اور دینی اقدار و علوم کے نام پر ہر دوستی قدر اور ذریعہ علم کو ناپاک اور مشکو سمجھنے کا رواج ختم ہو اور یہ اعتدال پسندی بڑی مبارک ہے اور وقت کی ضرورت اس اعتبار سے تو اسلام دنیا کا سب سے بڑا اعتدال پسند دین اور اس کے حقیقی وارث و مبلغ اس اعتدال پسندی کی روشن اور تابناک تصویر ہیں۔

واپسی کا راستہ

لقمان حکیم سے کسی نے پوچھا'' آپ نے یہ بے بہا بصیرت اور بے پناہ حکمت کہاں سے پائی ہے؟'' انہوں نے اس تجسّس آمیز سوال کے جواب میں کہا ''اندھوں سے'' پوچھنے والے نے مزید تعجب انگیز لہجے میں سوال کیا۔'' وہ کیسے؟'' لقمان نے کہا'' وہ اس طرح کہ اندھا جب تک اپنی لاٹھی سے راستہ ٹٹول نہیں لیتا آگے قدم نہیں بڑھاتا'' یہ تو ہے کوئی اقدام اور فیصلہ کرنے کی صورت میں دانشمندانہ طرزِ عمل اور عربی زبان کی ایک کہاوت ہے'' قدم الخروج قبل الولوج'' یعنی قدم اٹھانے سے پہلے واپسی کا سوچ لینا چاہیئے' یہ دونوں باتیں سامنے رکھ کر جب ہم اپنی سرکاری وسیاسی صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے حکمران بدقسمتی سے ان دونوں صفحات سے عاری نظر آتے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی کا طرزِ عمل اس پر شاہد عادل ہے، ہمارے ہاں جو حکمران آیا اس نے نہ تو آتے ہوئے سوچا کہ حریمِ اقتدار میں کیوں اور کس لئے داخل ہو رہا ہوں اور نہ آنے کے بعد اس پر دھیان دیا کہ اقتدار کی راہداری سے رخصت کیسے ہونا ہے۔؟

سویلین حکمرانوں کا مسئلہ یہ رہا کہ وہ قلانچیں بھرتے اور زقندیں لگاتے ہوئے اور ہر شرط مانتے ہوئے حلف اٹھانے اور عہدہ سنبھالنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ بات اگر دعوے سے کہی جائے تو کسی جانب سے تردید نہیں ہو گی کہ محمد خان جونیجو ہوں

یا بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف یہ سبھی بہت سی شرائط مان کر وزارتِ عظمیٰ تک پہنچے مگر اس کے بعد من مانی شروع کر دی اور نتیجہ سب کے سامنے ہے، پھر باہر آ کر چیختے ہیں کہ ہمیں ''فری ہینڈ'' نہیں ملا، سوال یہ ہے کہ اس پر پہلے سوچ لینا چاہیے تھا، بعد کی آہ و فغاں بعد از مرگ واویلا کے زمرے میں آتی ہے جس پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ کیا محمد خان جونیجو کو معلوم نہیں تھا کہ جنرل ضیاء الحق چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ساتھ اقتدار کی پارٹنر شپ کا کیا مطلب ہے؟ کیا بے نظیر بھٹو اتنی سادہ لوح ہیں کہ غلام اسحاق خان کو صدر بناتے ہوئے انہیں کسی بات کا اندازہ نہ ہو سکا؟ ساری دنیا جانتی ہے کہ انہوں نے مشکل وقت کے اتحادی نوابزادہ نصر اللہ خان کو چھوڑ کر غلام اسحاق خان کو صدر بنایا تھا اور خان صاحب پر پی پی کے ساتھ ساتھ آئی جے آئی کا بھی اتفاق تھا۔ دو متحارب گروپوں کا ایک شخص پر اتفاق آخر اپنے اندر کوئی نہ کوئی معنی رکھتا ہے؟ اور اسی طرح میاں نواز شریف کو ساری صورتحال کا علم ہے کہ وہ کیسے پروموٹ ہوئے؟ کن حلقوں نے انہیں بڑھاوا دیا؟ آئی جے آئی کیسے بنا؟ محمد خان جونیجو اچانک عوامی اتحاد چھوڑ کر آئی جے آئی سے کیسے آ کر ملے؟ اور جتوئی صاحب سے کیا معاملات طے ہوئے تھے؟ یہ سب باتیں اب برسرِ عام آ چکی ہیں۔ اس کے باوجود ان حضرات کا واویلا ناقابل فہم ہے یا پھر لوگوں کی مفت میں ہمدردیاں حاصل کرنا مقصود ہے۔

سویلین حکمرانوں کا فرض ہے کہ وہ آگے بڑھنے سے پہلے واپس آنے کا راستہ طے کر کے جایا کریں اور وہ دو ہی راستے ہیں یا تو خود قانون اور ضابطے کے مطابق حکومت کریں اور پھر انتخابات میں شکست ہو جائے تو تسلیم کر کے باعزت طور پر ایوانِ اقتدار سے باہر آ جائیں اور دوسرا راستہ وہی ہے جس سے یہ حکمران بار بار واپس بھیجے گئے ہیں۔ چلو مان لیا بہانہ ہی سہی آخر ایوب خان کو بلایا تو سکندر مرزا نے تھا، وہ کوئی زبردستی کابینہ میں تو نہیں گھس بیٹھے تھے؟ اور جزوی و عارضی سہی مارشل لاء

لگانے کا حکم تو خود جناب مرزا نے دیا تھا۔ پھر چیخ پکار کیسی؟ کچھ ایسا ہی معاملہ بھٹو صاحب کا رہا اپنے صدر کو اپاہج بنا دیا اور انتخابی دھاندلی تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا اور پورا ملک اٹھ کھڑا ہوا ظاہر ہے نتیجہ وہی نکلنا تھا جو بالآخر نکلا، کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہر حکمران آتا بھی کھلے طریقے سے اور جاتا بھی جائز راستے سے، لیکن آنے میں تو ہر ایک کو جلدی ہوتی ہے مگر جلد جانے کو کوئی راضی نہیں ہوتا لیکن بادلِ نخواستہ جلد جانا پڑ جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ فوجی حکومتوں کا رہا۔ انہوں نے بھی واپسی کا کوئی اچھا اور خوشگوار راستہ نہیں اپنایا۔ حالانکہ فوج میں تو حکمتِ عملی کے طور پر پسپائی اور واپسی ایک مسلمہ اور طے شدہ طریقِ کار اور ضابطہ ہے، معلوم نہیں فوجی حکمران اس باب میں کیوں ٹھوکر کھا جاتے ہیں؟

پہلی بار ایوب خان آئے مگر دس سال تک ان کا نہ دل بھرا اور نہ انہوں نے واپسی کا سوچا اور نتیجہ ایک بڑی اور ملکی سطح کی تحریک کی صورت میں نکلا اور ایوب خان نے بڑے ناخوشگوار انداز میں منصبِ صدارت چھوڑا اور خود اپنے ہی آئین میں کوئی طریقہ ایسا تجویز نہ کیا کہ وہ اگر رخصت ہوں تو اقتدار کون سنبھالے گا؟ اور اگر کوئی طریقِ کار تھا تو خود ہی اس سے انحراف کر کے حکومت فوج کے سربراہ کو سونپ دی، گویا آئین اس بارے میں تو کوئی رہنمائی نہیں دیتا تھا یا ناقابلِ عمل تھا یا اس کا حدود اربعہ اتنا تھا کہ جب تک ایوب خان رہیں گے وہ چل سکے گا اس کے بعد اس کے اندر چلنے کی سکت اور صلاحیت ہی نہ تھی۔ یحییٰ خان نے بھی جلدی میں اقتدار تو سنبھال لیا مگر ان کا آنا ملک و قوم کیلئے بڑی اذیت اور ہزیمت کا باعث ثابت ہوا یوں وہ خود بھی رسوا ہو کر کوچۂ اقتدار سے نکلے اور قوم کو بھی رسوا کر گئے۔ ۱۹۷۷ء میں ایک بار پھر ناگزیر حالات میں جنرل ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالا، گیارہ برس کے بعد وہ جان اور جہان سے تو رخصت ہوئے مگر حکومتی ایوان سے رخصت ہونے کا کوئی راستہ کھلا نہ

رکھا۔ مرحوم لیاقت علی خان سے لے کر میاں نواز شریف تک کوئی بھی حکمران نارمل اور آنریبل طریقے اور راستے سے رخصت نہیں ہوا۔ یہ مسئلہ موجودہ حکومت کے لیے خاصا توجہ طلب اور یہ نکتہ قابل غور ہے۔ آخری پچاس سالوں میں بار بار ایسا کیوں ہوا؟ بھارت ہمارا دشمن سہی، ہمارے لئے قابل نفرت سہی، مگر وہاں تو کبھی ایسا نہیں ہوا، جب یہ سارا خطہ ایک، اس کا مزاج ایک، سیاسی رنگ ڈھنگ ایک، حکومتی نفسیات ایک، فوجی ڈھانچہ ایک، افتادِ طبع ایک مگر رویہ مختلف کیوں ہے؟ وہاں کوئی ہارا ہے تو اس نے ہار مان لی، کسی پر عدم اعتماد ہوا ہے تو وہ اسی کو "چھا" مار کر نہیں بیٹھ گیا، سیاسی اختلافات سنگین ہوئے ہیں تو کسی نے آرمی چیف اور فوج کو نہیں پکارا اور حکومتی کاروبار متاثر ہوا ہے تو وسط مدتی انتخابات سے کسی نے گریز نہیں کیا۔ مگر ہمارے ہاں ان میں سے کوئی بات دیکھنے میں نہیں آئی۔ ہمارے ہاں کسی کو شکست ہوئی تو اس نے ملک کی شکست وریخت کے باوجود اپنی شکست نہیں مانی اور کوئی اختلاف ابھرا ہے تو پہلی درخواست آرمی چیف کے پاس پہنچی ہے، جب صورتِ احوال یہ ہو تو واپسی کا باعزت راستہ کیسے کھلا رہے گا؟ موجودہ حکومت کو چاہیے کہ وہ عوام کو سرپرائز دے اور قوم کو پہلی بار ایک خوشگوار تجربے سے ہمکنار کرے اور معاملات سنبھلتے ہی خود کو اس طرح ایک طرف کر لے کہ گویا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں تھا، تاکہ ان کی یہ نئی اختیار کردہ راہ آگے چل کر ایسی شاہراہ بن جائے جہاں سے ہمیشہ قافلۂ سیاست و حکومت امن و سلامتی کے ساتھ گزرتا ہے اور ملک جھٹکوں سے بچتا رہے۔

”من الظلمت الی النور“

یہ امرِ واقعہ ہے کہ اگر ایک طرف مغربی تہذیب کی چکا چوند کروڑوں انسانوں کی آنکھیں خیرہ کر رہی ہے اور ان میں مرد اور عورتیں شامل ہیں تو دوسری طرف اسی رفتار سے لوگ اس سحر اور طلسم سے نکل رہے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جنہوں نے اس تہذیب کو دور سے دیکھا ہے ان کے لیے یہ مینا خانہ حیرت ہے لیکن جو لوگ اس کا حصہ بنے، اس کے ظاہر و باطن سے آگاہ ہوئے اور اس نیلم پری کے ہم آغوش ہوئے انہیں یہ جھوٹے نگوں کی میناکاری نظر آئی، کاغذی پھول کتنے ہی خوش رنگ اور دیدہ زیب کیوں نہ ہوں، طراوت اور خوشبو سے محروم ہوتے ہیں، یہی حال تہذیبِ مغرب کا ہے، چہرہ روشن اور اندرون تاریک تر، جن لوگوں نے تہذیبِ مغرب کو برت کر اور چکھ کر دیکھا ہے انہیں یہ اندرائن نما چیز نظر آئی جو خوش رنگ اور ملائم تو ہے مگر تلخ تر، اتھلے ظرف، کچے دماغ اور سیمابی طبیعت کی بات اور ہے ورنہ جو سعید الفطرت اور سلیم الفکر لوگ ہیں خواہ مرد ہوں یا عورتیں، انہیں اس طلسمِ ہوش رُبا کی حقیقت جلد معلوم ہو جاتی ہے، جس کے نتیجے میں وہ زُود یا بدیر اس بساطِ عیش و نشاط سے اکتا جاتے اور اُٹھ آتے ہیں، اس لیے کہ جسم کی آسودگی ہزار مطلوب سہی مگر روح کی ویرانی کسی کو منظور نہیں ہوتی۔ جیل اور گھر میں یہی فرق ہوتا ہے جیل میں سونے کے نوالے اور شراب کے پیالے وہ آسودگی نہیں دیتے جو گھر میں باسی روٹی اور لسّی کے کٹورے سے حاصل ہوتی ہے، قید و بند میں جسم فربہ بھی ہوتا رہے مگر روح لاغر رہتی ہے، اس لئے کھایا پایا جی کو نہیں لگتا، جس طرح نگاہیں اُداس ہوں تو ہر منظرِ بہار ویرانہ

لگتا ہے اسی طرح روح بیقرار ہو تو انسان ہر چیز سے بیزار ہو جاتا ہے، پرندوں کو انسان کی طرح بولنا آتا یا کوئی انسان ان کی زبان سمجھتا تو وہ دو جملوں میں بتا دیتے کہ سونے کے تاروں کا پنجرہ وہ لطف نہیں دیتا جو تنکوں اور تیلیوں کا آشیانہ راحت عطا کرتا ہے، تہذیب مغرب بلاشبہ سونے کا جال ہے مگر انسان اس میں بے چین اور بے حال ہے، یہ داستان اس کی طرف لپکنے والوں سے نہیں اس کی دہلیز سے پلٹنے والوں سے پوچھی جائے، آسودگانِ ساحل کو کیا معلوم کہ بیچ منجدھار کیا ہوتا ہے؟ پچاس منزلہ عمارتیں اگر انسان کو اس کی منزلِ آدمیت سے گرا دیں تو ان کا کیا فائدہ؟ شراب کے لبالب کٹورے اگر روح کی پیاس بڑھا دیں تو کیا حاصل؟ تن کی زیبائش اگر من کی آسائش چھین لے تو کیا نتیجہ؟ اور میک اپ کی تہیں اگر چہرے کی معصومیت، لالی اور جاذبیت کھرچ ڈالیں تو کس کام کی؟ یہی کچھ تہذیب مغرب نے انسان کے ساتھ کیا ہے، علامہ محمد اسد (لیوپولڈ ویس) سے لے کر یوسف اسلام (کیٹ سٹیونز) تک، شیخ عبدالواحد یحییٰ (رینے گینوں) سے لیکر پروفیسر عبداللہ (بینل ہیوٹ) تک کی قبولِ اسلام کی ایمان افروز داستانیں اس حقیقت کو واضح کر رہی ہیں، امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، پولینڈ، کینیڈا، سوئٹزرلینڈ اور سویڈن وغیرہ کے ہزاروں کی تعداد میں مرد مسلمان ہو چکے ہیں ان میں اساتذہ، وکلاء، دانشور، صحافی، پادری، اداکار، گلوکار اور کھلاڑی شامل ہیں۔ اسی طرح بے شمار خواتین جن کے لیے مغربی تہذیب بہت ہی پرکشش ہے۔ اس غار اور ملال سے نکل آئی ہیں۔ ان میں محترمہ سمیّہ (ایرین) سے لے کر محترمہ خدیجہ (مارلینا گارسیا) تک بڑے معتبر اور محترم نام ہیں، جو مغرب کی خارزار وادیوں سے نکل کر پر بہار روشوں پر چلی ہیں۔ قبولِ اسلام کے یہ واقعات بہت دلچسپ، علم افروز، حیرت انگیز، عبرت آموز اور ولولہ خیز ہیں۔ تمام تر ترغیبات کے باوجود اپنے مذہب اور تہذیب کو چھوڑنا بہت بڑا مجاہدہ ہے۔ لیکن کوئی تو بات ہوتی ہے جو انسان کے دل و دماغ میں بھونچال برپا کر دیتی اور اسے نئے افق سے آشنا کر

دیتی ہے۔ یہ واقعات پڑھنے کے لائق اور فکر و یقین کشید کرنے کے قابل ہیں، اقتباسات پیش کرنے سے وہ لطف غارت ہو جاتا ہے جو اصل کتاب میں اس انقلابِ روح وقلب کے مسلسل واقعات پڑھ کر نصیب ہوتا ہے۔ حال ہی میں محترمہ نگہت عائشہ کی ایک انتہائی قابلِ قدر کتاب سامنے آئی ہے، جس میں ساٹھ کے قریب نومسلم خواتین کی قبولِ اسلام کی کہانی خود ان کی زبانی پیش کی گئی ہے اور گیارہ خواتین کے سوانحی مضامین دوسروں کی زبان سے اس کتاب میں درج ہیں۔

''نومسلم خواتین کی ایمان افروز آپ بیتیاں'' یہ کتاب ''ندوۃ المعارف'' نے شایانِ شان انداز میں شائع کی ہے، ایسی کتابوں کو ہر مسلمان گھرانے میں ہونا چاہیے تاکہ ہماری مائیں، بہنیں، بیٹیاں اور رشتہ دار خواتین جو ریڈیو، ٹی وی اور اخباری صحافت کی پیش کردہ مغربی تہذیب کے حسن اور دلفریبی سے مسحور اور مرعوب نظر آتی ہیں، انہیں اصل حقائق تک رسائی حاصل ہو کہ یورپ جو حقوقِ نسواں اور عظمتِ عورت کا سب سے بڑا علمبردار ہے اس نے عورت جیسی نازک، حساس اور پرِ وقار صنف کے ساتھ کیا ظلم کیا ہے اور اسے اہانت و ذلت کے کس عمیق و تاریک غار میں لا پھینکا ہے؟ جب کہ اسلام عورت کو کس مقام و منصب پر بٹھاتا اور اسے کیا مقام دیتا ہے۔ ''ندوۃ المعارف'' کے جناب شبیر احمد میواتی ایک صالح فکر اور جواں عزم مسلمان ہیں، علم و مطالعہ ان کا اوڑھنا بچھونا اور ایسے تخلیقی اور بامقصد لٹریچر کی اشاعت ان کا ذوق اور عشق ہے وہ اس کتاب کو پیش کر کے ہر صاحبِ نظر، اہلِ درد اور سچے مسلمان کی محبت اور تبریک کے مستحق ہیں، فحش، لایعنی، افسانوی اور طلسماتی لٹریچر کے انبار اور طوفان میں ایسی کتابوں کا آنا کسی نعمت سے کم نہیں اور یہ وہ جہاد ہے جس کا اجر اللہ کے ہاں بہر حال محفوظ ہے۔ تقریباً چار سو صفحات کی یہ کتاب ایک ایمانی و علمی سوغات ہے۔ جس کی قدر افزائی ضروری ہے۔ ''ندوۃ المعارف'' اگرچہ نیا ادارہ ہے لیکن اس کا حسنِ آغاز اچھی پیشرفت کی خبر دے رہا ہے۔

دوغلا پن

سیاستدان دل میں کُڑھتے بھی ضرور ہیں اور گاہے بگاہے عوام کی بے وفائی اور کارکنوں کی بے رخی کا گلہ بھی زبان پر لاتے ہیں کہ وقت آنے پر لوگ ہمارے لئے جدوجہد نہیں کرتے، اور ہمیں چھڑانے اور بچانے کے لیے سڑکوں پر آنے اور مار کھانے سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن انہوں نے خود کبھی نہیں سوچا کہ وہ خود کس قدر دوہرے معیار کے اسیر اور دوغلے پن کے مریض ہیں، ہمارے سیاستدان نیت کے صاف اور دل کے کھرے ہوتے تو عوام روح تک اترنے کو تیار ہو جاتے، جن کی خلوت وجلوت میں کوسوں کا فاصلہ ہو، جن کے اندر اور باہر میں رات اور دن کا فرق ہو اور جن کے ظاہر اور باطن میں گہری خلیج حائل ہو۔ بھلا ان کے لیے لوگ باہر کیوں نکلیں؟

ہمارے پیشہ ور سیاستدانوں نے عوام کو ہمیشہ اقتدار کا زینہ اور مقتدر حلقوں سے بھاؤ تاؤ کرنے کا ذریعہ سمجھا۔ عوام ان کے لیے صرف سیاسی جہنم کا ایندھن اور انتخابی بندھن ہیں ورنہ سیاستدانوں کا بس چلے تو عوام کو کالے پانیوں کی سزا سنا دیں۔ کبھی کبھی ہمیں خیال آتا ہے کہ پیشہ ور سیاستدان بیچارے عوام کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے، گرمی ہو یا سردی، دوروں پر رہتے ہیں۔ بخار کی حالت میں بھی سفر کرتے ہیں۔ جیلوں میں جاتے ہیں، رات رات بھر جاگتے ہیں اور اپنا آرام قربان کرتے ہیں لیکن مسز بے نظیر بھٹو کے ایک حالیہ انٹرویو سے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ وہ دل سے نہیں کرتے بلکہ سیاسی ضرورت کے طور پر کرتے ہیں۔ جدوجہد اور کوئی سورنگ رچائے بغیر انہیں اقتدار مل جائے تو وہ پلٹ کر بھی عوام سے نہ پوچھیں کہ بھیا کیسی ہو؟

آسٹریلیا کے ایک بڑے انگریزی اخبار ''دی ایج'' کی الزبتھ کرائس سے ایک انٹرویو میں بے نظیر بھٹو نے ایک سوال کے جواب میں کہا۔

''چوائس ملنے پر میں اپنے ''ٹریڈ مارک دوپٹے'' سے جان چھڑانا پسند کروں گی، دوپٹہ اوڑھنا میری سیاسی ضرورت ہے۔اور پاکستان میں سیاست کرنے کے لیے میں یہ قیمت ادا کر رہی ہوں۔انہوں نے کہا دوپٹہ ایک ایسی چیز ہے جسے استری کر کے پیک کر دینا چاہیے۔تاہم وہ پاکستان میں قدامت پرست ووٹرز کو مطمئن کرنے کے لیے اسے اوڑھتی ہیں۔''

یہ باتیں پڑھ کر کوئی بہت ہی کوڑھ مغز اور موٹے دماغ کا ہو گا جو ایسے سیاستدانوں کے آنکھوں سے ابلتے آنسوؤں، لرزتے ہونٹوں، درد میں ڈوبے جملوں، دلفریب نعروں، خوش کن باتوں، بلند بانگ دعووں، جھوٹی قسموں، اور رنگ برنگے وعدوں پر اعتبار کرے گا، اپنے ہر انداز کی وضاحت تو خود محترمہ نے فرما دی ہے، گویا عوام کا ورد ہو یا جمہوریت کا وظیفہ، غربت کا ماتم ہو یا مسائل کا رونا، ہاتھ میں تسبیح ہو یا سر پر دوپٹہ، واسکٹ ہو یا شیروانی، مزاروں پر چڑھاوے ہوں یا درباروں پر حاضری، ٹوٹی چارپائی پر بیٹھنا ہو یا کسی غریب ہاری کو گلے لگانا، کسی مقتول کے حق میں مظاہرہ ہو یا مظلوم کے لیے دلاسا، کسی بیوہ کو تسلی ہو یا مریض کی مزاج پرسی یہ سب سیاسی ضرورتیں ہیں۔جب اندر کی بات باہر آ ہی گئی ہے تو ہمیں یہ یقین کر لینے میں کوئی حرج نظر نہیں آتا کہ ان لوگوں کا باجماعت نماز کا تصویر کھنچوانا، تبلیغی جماعت کے سالانہ اجتماع میں جانا، مسجدوں کو پر شکوہ بنانا، اور سال میں دو چار بار عمرے پر جانا بھی ان کی سیاست کا حصہ ہوتا ہے اور یہ ''غلطی'' یا ''غلط فہمی'' میں کیا گیا نیک کام بھی ان سے ہضم نہیں ہوتا اور اندر کا چور باہر اگل دیتے ہیں، حالانکہ ۸۶ء میں جب بے نظیر بھٹو وطن واپس آئیں اور سر پر دوپٹہ اور ہاتھ میں تسبیح لے کر لوٹیں تو ہمیں ان کے بارے میں حسنِ ظن پیدا ہو گیا تھا، کہ وہ پے در پے صدمات کے دوچار ہونے کے باعث

مغربیت چھوڑ کر اسلامیت کی طرف لوٹ آئی ہیں یا کم از کم اپنی سوانح عمری ''دختر مشرق'' کے عنوان سے مرتب کر کے مغربی تہذیب کو خیر باد کہہ دیا ہے اور مشرقی اقدار کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔ لیکن یہ گمان ابھی ایقان کے درجے میں نہیں آیا تھا کہ انہوں نے خود ہی اس کا بُطلان کر دیا ہے، ویسے یہ ہمارے سیکولر سیاستدانوں کا بڑا المیہ ہے کہ وہ جب مغرب میں قدم رکھتے ہیں یا مغربی پریس کا سامنا کرتے ہیں تو شرم کے مارے پانی سے بھی پتلے ہو جاتے ہیں اور اقراری مجرم کی طرح اعترافات کا انبار لگا دیتے ہیں۔ کوئی پوچھے نہ پوچھے اپنے ہر کام اور انداز کی بلاوجہ وضاحت اور معذرت پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں، یہ بات نا قابلِ فہم سی ہے کہ مغرب کی عورت اگر اپنی ننگی پنڈلیوں پر نہیں شرماتی تو ہماری ''دختر مشرق'' کو دوپٹہ اوڑھنے پر ندامت کیوں گھیر لیتی ہے؟ ان لوگوں کا حال مور جیسا ہے جسے قدرت نے بہت خوبصورت بنایا ہے، رنگوں کی بہار سے سجایا ہے، اور چلتا پھرتا چمنستان ٹھہرایا ہے، مگر اس کی نظر جونہی اپنے پاؤں پر پڑتی ہے تو وہ اداس ہو جاتا ہے اور اپنی ساری رنگینی و رعنائی بھول کر پاؤں کی نسبتاً بدصورتی پر غم میں ڈوب جاتا ہے، یہ کفرانِ نعمت نہیں تو اور کیا ہے؟

دوپٹہ سیاسی ضرورت نہیں اسلامی اور مشرقی ثقافت ہے، اور اس پر اظہارِ ندامت یا اس سے اعلانِ برأت چہ معنی دارد؟

نہ جانے ہمارے سیاستدان کب پر اعتماد اور فتراکِ مغرب سے آزاد ہوں گے؟ رہنا مشرق میں، سیاسی کاروبار مشرق میں، ووٹ بنک مشرق میں، حلقۂ انتخاب مشرق میں اور شوقِ حکومت مشرق میں، مگر فکر مغرب کی دامن گیر ہے کہ کہیں اس کی نظر سے نہ گر جائیں اور وہ قدامت پرستی کا ٹھپہ نہ لگا دے، یہ ذہنی غلامی نہیں تو اور کیا ہے؟ ایسے میں عوام کی بے وفائی اور بے رخی کا شکوہ کرنا جراحتِ دل پر نمک پاشی ہے،

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں

لیڈر ایسے بھی بنائے جاتے ہیں

لیڈر بعض اوقات بنتے ہیں اور بسا اوقات بنائے جاتے ہیں، لیڈر یا تو اپنی صلاحیت اور محنت سے بنتا ہے یا پھر پبلک کی حمایت اور ہمدردی سے، لیکن جہاں تک لیڈر بنانے کا تعلق ہے اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو حکومتی ایجنسیاں کسی کو گوشۂ عافیت و گمنامی سے نکال کر یا پچھلی صفوں سے اٹھا کر لیڈر بناتی ہیں اور دوسرے حکومتی بے تدبیریاں اور غیر ضروری "پھرتیاں" کسی کو لیڈر بناتی ہیں، چند دن پہلے تک بیگم کلثوم نواز کا نہ تو اپنا دعویٰ لیڈری کا تھا نہ مسلم لیگ انہیں لیڈر سمجھتی تھی اور نہ خود میاں نواز شریف نے اپنی جگہ مسلم لیگ کی قیادت انہیں سونپی تھی۔ مگر جو خاتون گزشتہ نو ماہ میں لیڈر نہ بن سکیں۔ ہماری انتظامیہ کی روائتی پالیسی اور پولیس کی بے جا پھرتی نے اس خاتون کو نو گھنٹوں میں لیڈر بنا دیا۔ محترمہ یوم تکبیر منانے چاغی تک گئیں، حکومت نے ان کا راستہ نہیں روکا، حکومت کی اس روش سے کیا زمین شق ہوگئی تھی یا آسمان گر پڑا تھا؟ ہرگز نہیں۔ اگر بیگم کلثوم کاروانِ تحفظِ پاکستان لے کر پشاور تک چلی بھی جاتیں تو کیا زلزلہ آ جاتا یا راوی، چناب، جہلم اور اٹک اُچھل پڑتے؟ ایسا بالکل نہ ہوتا۔ نہ ان کے جانے سے چاغی کے پہاڑوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی اور نہ آنے سے دریا اپنا بہاؤ بدل دیتے لیکن ہماری مخصوص سانچے میں ڈھلی ہوئی انتظامیہ اور انوکھی نفسیات میں پلی ہوئی پولیس نے ساری ملکی فضا اور سیاست کا رخ موڑ دیا، صدیاں گزر گئیں لوگوں کو حکومت کرتے اور ملکی انتظام چلاتے، ان صدیوں میں بڑے بڑے ستونوں والی قومیں ثمود و عاد دنیا سے نیست و نابود ہو گئیں، مصریوں، رومیوں، یونانیوں اور

ایرانیوں کی گرانڈیل تہذیبیں اپنا وقت پورا کر کے نقارۂ کوچ بجا گئیں۔ فرعونوں کے اہرام مصر بوسیدہ ہو گئے۔ غرناطہ کے محل گرد آلود ہو گئے۔ گھوڑوں اور اونٹوں کی جگہ آواز سے تیز رفتار طیاروں نے سنبھال لی، زرعی عہد سے نکل معاشرہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے دور میں داخل ہو گیا، خاقان و فغفور کا سلسلۂ ملوک سلطانی جمہور میں تبدیل ہو گیا، امریکہ اور آسٹریلیا جیسے نئے براعظم دریافت ہو گئے، غروب آفتاب سے ناآشنا سلطنتیں سمٹ سکڑ کر جزیروں میں پناہ گزیں ہو گئیں اور تاریخی شہرت رکھنے والے دریاؤں نے اپنے راستے بدل لئے مگر ہر دور کی حکومت اور حکمران لگتا ہے کسی ایسی برف پوش وادی میں قیام پذیر ہیں جہاں نہ موسم بدلتا ہے نہ آب و ہوا تبدیل ہوتی ہے اور نہ تغیر احوال کی کوئی خبر پہنچتی ہے، صدیوں سے ہر حکومت اور حکمران کا ایک ہی فلسفہ، ایک ہی رویہ اور ایک ہی فارمولا ہے، یعنی طاقت۔ حالانکہ قدرت نے جس مقدار میں طاقت پیدا کی ہے اتنی ہی مقدار میں حکمت بھی تخلیق کی ہے، لیکن حکمت کے لئے محض حکمران ہونا کافی نہیں بلکہ اولوالالباب اور اولوالابصار ہونا ضروری ہے، بلاشبہ طاقت سے بہت سے کام نکلتے ہیں لیکن یہ بھی تاریخی سماجی مشاہدہ ہے کہ بہت سے کام صرف حکمت سے نکالے جاتے ہیں وہ دیرپا بھی ہوتے ہیں، دُوررس بھی ہوتے ہیں اور نتائج پرور بھی، صُلح حدیبیہ کتنا بڑا تاریخی واقعہ ہے کہ قرآنِ حکیم جیسی قدیم ولازوال کتاب اُسے "فتح مبین" کا نام دیتی ہے، یہ سر بسر حکیمانہ اقدام تھا، غزوۂ خندق مدینہ منورہ کی نوزائیدہ ریاست پر یکبارگی مسلط کر دیا گیا، محاصرہ اس قدر طول کھینچ گیا کہ اندیشے اور وسوسے کے سائے بن کر فضائے مدینہ پر منڈلانے لگے، لیکن مدینے کی ریاست کے والی نے ایک حکیمانہ تدبیر سے جنگ کو ٹال دیا، دشمنوں کو واپس جانے پر مجبور کر دیا اور شہرِ مدینہ کو اپنے باسیوں کے لیے محفوظ کر لیا اور فتح مکہ، یہ تو اسلام کے آفاق بداماں ہونے کیلئے "فتح الباب" کی حیثیت رکھتی ہے، مگر الٰہی بصیرت اور حکمت کے حامل و امین سالارِ لشکر نے جنگ سے پہلے فتح پالی اُور حملے سے پہلے داخلے کی راہ

ڈھونڈ لی، مسلمان حکمرانوں کے لیے پیغمبرِ اسلامؐ کے یہ تین فیصلے ایک مکمل رہنما اور تاریخ اسلام کے یہ تین روشن سنگِ میل ہیں، لیکن جہاں حکمت کی جگہ طاقت استعمال کی جائے گی ممکن ہے اس سے دبدبہ تو قائم ہو جائے مگر ہو گا وہ بلبلہ، جس کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ ہم اگر جان کی امان پائیں تو کیا پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ پاکستان کے چیف ایگزیکٹو سے لے کر تھانہ ماڈل ٹاؤن کے ایس ایچ او تک اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ جو ایکشن بیگم کلثوم نواز کے خلاف لیا گیا اس سے حکومت کو کتنا فائدہ پہنچا اور بین الاقوامی سطح پر کتنا مضحکہ اڑا؟ مسلم لیگ کی تقریباً ساری قیادت بیگم صاحبہ کو Isolate کر چکی تھی مگر اس ایک واقعے نے انہیں مسلم لیگ کی سیاسی فکر کا مرکزی نقطہ اور مسلم لیگ کے ووٹر کی آنکھ کا تارا بنا دیا ہے، کوئی آنکھیں موند اور کان لپیٹ لے تو اس کی مرضی ورنہ عوامی سوچ یہی ہے، انگریز کے لیے تو یہ روا تھا کہ ملک کے بتیس ضلعوں کو اس نے چونسٹھ انتظامی افسروں یعنی ایک گورے ڈی سی اور ایک گورے ایس پی کے ذریعے چلاتا تھا اور وہ بدیسی عوام کے لیے طاقت کا حربہ استعمال کر کے ہی اپنا نظام قائم رکھ سکتا تھا اب تو صورتحال میں جوہری تبدیلی واقع ہو چکی ہے، اب شمشیر کی جگہ تدبیر، طاقت کی جگہ حکمت، مجادلہ کی جگہ مکالمہ، اور حراست کی جگہ سیاست نے سنبھال لی ہے، کیا اس تبدیلی کی اطلاع ہم تک نہیں پہنچی ہے؟ کل کلاں بے نظیر اور نواز شریف دوبارہ لیڈر بن کر سامنے آ جائیں اور جنرل صاحب قوم کو طعنے دے رہے ہوں کہ ہم نے تو کرپٹ سیاستدانوں کو باہر نکالنے کی بڑی کوشش کی مگر عوام کو برے بھلے کی تمیز ہی نہیں، کیا ان کا یہ شکوہ بجا ہو گا؟ بالکل نہیں، موجودہ روش اور رویے سے تو نہ چاہتے ہوئے بھی انسان اور لیڈر بن جاتا ہے، کوئی کسی کو لیڈر بنانے پر تل جائے تو لیڈر بننے والے کا کیا قصور؟

نمک پاشی اور دروغ بانی

یہ ریڈیو پاکستان ہے، جی ہاں، ریڈیو پاکستان جو عوام کی آواز ہے اور پاکستان کی آواز ہے، یخ بستہ اور آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روموں سے لے کر نائی اور قصائی کی دکانوں پر برابر گونجنے اور سنے جانے والا ریڈیو پاکستان، سرکار کے اونچے ایوانوں اور کاشتکار کے کھیت کھلیانوں تک رسائی رکھنے والا، ٹی وی اپنی تمام تر رنگینیوں اور رعنائیوں کے باوجود محدود نشریات کا حامل، کیوں کہ یہ ہر ایک کی دسترس سے باہر، الیکٹرک پاور کا محتاج اور نسبتاً بھاری بھر کم ہے، جب کہ ریڈیو پجارو سوار سے لے کر سائیکل سوار تک ہر ایک کے پاس ہے اور اسے بآسانی چلایا اور سنا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ ایک سرکاری نشریاتی ادارہ ہے جس کی ایک ایک خبر کی چھان پھٹک اور لفظ و حرف کی نوک پلک سنوارنے کے لئے ضرورت سے زیادہ افراد موجود ہیں مگر ۲۰ رجون کو ایک ایسی خبر نشر کی گئی جس میں نمک پاشی اور دروغ بانی کا وافر سامان تھا، خبر ملاحظہ ہو:

"کشمیر اور شمالی علاقہ جات کے وفاقی وزیر جناب عباس سرفراز نے لالک جان شہید (نشانِ حیدر) کے گاؤں کا دورہ کیا، گاؤں کے سب لوگوں سے فرداً فرداً ملاقات کی شہید کے والدین سے ملے اور گاؤں کے لوگوں سے چیف ایگزیکٹو کے غربت مٹاؤ پروگرام پر تبادلۂ خیال کیا اور یقین دلایا کہ گاؤں میں پائی جانے والی

غربت وعسرت کی تاریکیوں کو روشنیوں میں تبدیل کر دیں گے۔"

کراچی کے ایک انگریزی جریدے نے اس جھوٹ کا پول کھول دیا، اصل ماجرا یہ ہے کہ وفاقی وزیر نے دورے کا پروگرام بنایا شہید کے بوڑھے والد نے حسبِ استطاعت کھانے کا بندوبست کیا مگر یہ سب کچھ اکارت چلا گیا کہ اچانک اطلاع آئی کہ دورہ منسوخ کر دیا گیا ہے اور دوسرے دن کا پروگرام رکھا گیا مگر دوسرے روز بھی گاؤں کے لوگ اور شہید کے اہل خانہ انتظار ہی کرتے رہ گئے اور دوسرے روز کا خورد ونوش کا سارا انتظام دھرے کا دھرا رہ گیا، وفاقی وزیر اس علاقے میں گئے تو سہی مگر بیس کلومیٹر دور ایک ضلعی ہیڈکوارٹر پر لینڈ فرمایا کیوں کہ آگے کی سڑک ناہموار تھی، حالانکہ شہید کے گاؤں میں عارضی ہیلی پیڈ بنایا گیا اور وہاں کے تحصیلدار نے ایک غریب کسان کے گنے کے کھیت کو اجاڑ کر سرکاری خوشنودی اور راحت کے لیے سارا اہتمام کیا جب کاشتکار نے معمولی سی ہچکچاہٹ اور مزاحمت ظاہر کی تو "دِہ خدا" نے یہ کہہ کر اسے جھڑک دیا کہ مزید کچھ بولے تو مداخلت بکارسرکار کے الزام میں جیل پہنچا دیے جاؤ گے، شہید کے والدین کو گاؤں والوں کے سامنے الگ اذیت اور خفت کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ سارا قصہ جان کر ذہن میں خیال ابھرتا ہے کہ ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو گئے ہیں یا اب بھی زرعی، قبائلی اور جاگیری دور میں سانس لے رہے ہیں کہ نہ وزیروں کے نخرے کم پڑے ہیں نہ تحصیلداروں کے مزاج بدلے ہیں اور نہ رعایا کی تحقیر و توہین کا سلسلہ ختم ہوا ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ "مام ڈیڈ گروپ" کے نمائندے کو آخر وزیر بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے جو آج بھی پنگھوڑے میں ہلکورے لینے کا عادی ہے جب کہ وہ ایسے ملک کا وزیر ہے جس کی آبادی اسی فیصد ان علاقوں میں آباد ہے جس کے راہ گزار پتھریلے، جس کے راستے ناہموار، جس کی بستیاں گرد آلود، جس

کی آبادیاں صحرائی و کوہستانی، جس کی پگڈنڈیاں پیچ در پیچ اور جس کے باسی غریب و خستہ حال ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا وفاقی وزیر نے پاؤں میں مہندی لگا رکھی تھی کہ وہ پیدل گاؤں تک نہیں جا سکتے تھے؟ کیا ان کو "چک" پڑی ہوئی تھی کہ وہ ناہموار راستہ پر کار کے ہچکولے برداشت نہیں کر سکتے تھے؟ کیا وہ وزیر صرف اس لئے بنے ہیں کہ محض اُڑن کھٹولوں میں سیر کرتے پھریں۔؟

دوسری بات یہ ہے کہ لالک جان کارگل کے محاذ پر شہید ہوا کہ کیا کارگل کی چوٹیاں اس کے گاؤں کے راستہ کے مقابلے میں بہت ہموار تھیں کہ وہ تو وہاں پہنچ گیا مگر وزیر صاحب اس کے گاؤں تک نہیں پہنچ سکتے تھے؟ کیا ایسے لاڈلے، نازک اندام، البیلے، گود کھیلتے اور چیونگم چباتے وزیر بنانے ضروری ہیں؟ ایسے وزیر جو اس شہید کے گاؤں جانے سے عاری ہیں جوان وزیروں کے اس ملک کی حرمت اور حفاظت کے لیے جان پر کھیل گیا۔ لالک جان خون میں نہا گیا مگر وزیر صاحب اپنے پاؤں اور کپڑوں پر گرد پڑنے سے گھبرا گئے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہمارا یہ کلچر کب بدلے گا اور ہم کب تک یہ سودا اپنے سروں میں سمائے رہیں گے کہ وزیر کے دم قدم سے اس ملک کی عزت ہے جب کہ خاکِ وطن شہیدوں کے خون سے آبرومند اور ان کے جذبوں سے سرفراز و سربلند ہے، یہ وزیر تو دھوپ چھاؤں ہیں جو آتی جاتی رہتی ہے، ان وزراء کا کیا آج ایوان میں ہیں تو کل زندان میں ہوتے ہیں جبکہ شہداء تو رحمتِ حق کے داماں اور فردوس و جنان میں ہمیشہ کے لیے آسودہ رہیں گے، ہمیں تو اس تقریب کا نظارہ بھی کھٹکا تھا جو پی ٹی وی پر براہِ راست دکھائی گئی تھی جس میں صدرِ مملکت نے شہداء کو تمغے دیئے تھے ہمارے نزدیک تو صدر کو فرش پر اور شہداء کو چبوترے پر کھڑے ہونا چاہیے تھا تمغے شہید کی حرمت نہیں بڑھاتے، بلکہ شہید تمغوں کو عزت بخشتا ہے، اسی طرح صدر کے بارے میں سیکرٹری دفاع کو یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ "صدر فلاں شہید کو

اس کی قومی خدمت کے عوض تحفہ عطا فرمائیں گے" بلکہ جملہ یوں ہونا چاہیے تھا کہ "صدر مملکت فلاں شہید کی لازوال اور بے مثال قربانی کے اعتراف میں ان کے حضور خراجِ عقیدت کے طور پر ایک علامتی تحفہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں گے" چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ جب وزیر نے گاؤں کا دورہ کیا اور نہ وہاں کسی سے ملاقات کی تو ریڈیو پاکستان کے نمائندے کو کہاں سے الہام ہو گیا کہ انہوں نے ہر ایک سے فرداً فرداً ملاقات کی اور جنرل مشرف کے غربت مٹاؤ پر پروگرام پر تبادلۂ خیال کیا اور گاؤں کے اندھیروں کو روشنی میں بدلنے کا وعدہ کیا؟ کیا نیشنل نیوز بلیٹن کی یہی کریڈیبلٹی ہے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ بہت سی خبریں اس طرح خانہ ساز اور کذب طراز ہوتی ہیں اور جملے سے لے کر شوشے اور کومے تک ہر چیز گھڑی گھڑائی میز پر موجود ہوتی ہے اور بوقت ضرورت چلا دی جاتی ہے، یہ مختلف ملکوں کے سربراہوں کے نام تہنیتی پیغام، تعزیتی خبریں اور مذاکرات کے بعد جاری کیے جانے والے اعلامیے، لگتا ہے مدتوں پہلے تیار پڑے ہوتے ہیں، بس گرد جھاڑ کر پیش کرنے کا تکلف کر لیا جاتا ہے۔ ہماری ہر حکومت کو بالعموم اور فوجی حکومت کو بالخصوص کسی شہید، اسکے والدین، خاندان، اس کے گاؤں اور اس کے ہر نقشِ قدم کے بارے میں بہت حساس اور محتاط ہونا چاہیے، اس لیے کہ شہید پوری قوم کی آبرو کا صدقہ اور قدسیوں کا بہت لاڈلا ہوتا ہے، اس کے زخم جنت کے پھولوں سے زیادہ خوشبودار اور شاداب ہوتے ہیں، اس کا گرد آلود چہرہ شمس و قمر سے زیادہ روشن و تاباں ہوتا ہے اور اس کے کفن کی ہر شکن میں ہزار حوروں سے بڑھ کر بناؤ ہوتا ہے۔

لیے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گل
شہیدِ ناز کی تربت کہاں ہے؟

یہ تبسم، یہ تکلم تیری عادت ہی نہ ہو

کہتے ہیں کہ ایک بار مولانا مودودیؒ کی فیلڈ مارشل محمد ایوب خان سے ملاقات ہوئی، فیلڈ مارشل نے بڑے گرمجوشانہ انداز میں مولانا کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ،

''میں آپ کی کتابیں اور تحریریں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں''

اس پر مولانا مرحوم نے بڑے برجستہ انداز میں کہا:

''لیکن میری کسی تحریر کا آپ پر کوئی اثر تو نظر نہیں آتا۔''

اس پر ظاہر ہے فیلڈ مارشل کھسیانے ہو گئے ہوں گے، یہ واقعہ ہمیں اس لئے یاد آیا کہ ہمارے ملک کے بزرگ قلمکار اور تجزیہ نگار محترم ارشاد احمد حقانی نے اپنے ایک کالم (مطبوعہ ۵رجولائی) میں اپنے مخصوص انداز میں ایک تاثر رقم کیا ہے، انہی کے الفاظ میں:

''کل جب میں اسلام آباد سے واپس آ رہا تھا تو جہاز میں میرے برابر والی نشست پر طیارہ سازش کیس کے شریک ملزم رانا مقبول احمد تشریف فرما تھے ان سے قریباً پون گھنٹہ گپ شپ رہی جو ان کی خواہش کے مطابق سختی سے آف دی ریکارڈ تھی لیکن انہوں نے اپنی دو باتیں لکھنے کی اجازت دی جن میں سے ایک یہ تھی کہ میاں نواز شریف اب پچھتاتے ہیں کہ میں نے ارشاد احمد حقانی کے مشوروں پر پہلے عمل کیوں نہ کیا جب یہ مشورے دیئے جا رہے تھے اگر میں ان پر عمل کرتا تو شائد مجھ سے وہ

غلطیاں نہ ہوتیں، دوسری بات انہوں نے یہ بتائی کہ صبح جب اخبارات آتے ہیں، تو سب سے پہلے آپ کا کالم لفظ بہ لفظ پڑھا جاتا ہے اور اس پر گفتگو ہوتی ہے'' محترم کالم نگار یہ بات لکھنے کے بعد از خود فرماتے ہیں:

''میں حیران ہوں کہ اگر میاں صاحب کی سوچ وہ ہے جو رانا مقبول احمد نے بیان کی تو بارہ اکتوبر کے بعد کے دورے سے میرے مشوروں کو مافی ہی کی طرح نظر انداز کرنے کی روش کیوں اپنا رکھی ہے۔''

اگرچہ جو بات ہم لکھنے چلے تھے وہی بات قدرے اپنے انداز میں حقانی صاحب نے لکھ دی ہے تاہم قارئین کا تجسّس اور تشنگی دور کرنے کے لیے عرض ہے کہ ہمارے بزرگ کالم نگار مدتوں اس وادی میں سیاحت کرنے کے باوجود اور دنیا جہان کے رنگا رنگ لوگوں سے ملنے کے باوصف غالباً اپنی فطری سادگی کو ''پرکاری'' میں تبدیل نہیں کر سکے اور گاہے گاہے اپنے کالموں کو بطورِ حوالہ پیش کرتے، ان کے دُور رس اثرات اور حکمرانوں کی فکر اور سوچ پر اور مختلف اہم سیاسی و حکومتی فیصلوں پر ان کی چھاپ کا ذکر کرتے رہتے ہیں، حالانکہ اپنے ہی بیان کردہ تاثر میں عالمِ بالا کی سخن فہمی اور قدر شناسی کا پردہ چاک کر دیا ہے، غالباً یہ بڑے لوگوں کی ایک ''لیڈرانہ'' عادت ہوتی ہے کہ وہ جس سے بھی ملتے ہیں خود کو بزرگانہ مقام پر رکھ کر بڑے سرپرستانہ انداز میں چند توصیفی و تعریفی کلمات ادا کر دیتے ہیں اور ہم بسا اوقات اسے سند سمجھ کر ضبطِ تحریر میں لے آتے ہیں۔ غالباً ساحر لدھیانوی کو بھی اپنے محبوب کی بظاہر ادائے دلربایانہ سے اسی طرح کی غلط فہمی لاحق رہی لیکن کچھ عرصے بعد ان پر کھلا کہ

میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم وہ تکلم تیری عادت ہی نہ ہو

یہ مسئلہ صرف نواز شریف کا نہیں ہر حکمران کا ہے، حکمران ایک ایسے آئینہ

خانہ میں مقیم ہوتا ہے جہاں اسے ہر طرف اپنی ہی تصویر نظر آتی ہے اور وہ تصویر ہر اعتبار سے پیکرِ جمال اور مرقع حسن ہوتی ہے، اسے بلند اقبالی کی دعائیں دینے والے، اسے ثانی یوسف قرار دینے والے، اس کے فیصلوں کو عدلِ نوشیروان کا عکس کہنے والے، اس کی دانائی کا شجرہ سقراط اور افلاطون سے جوڑنے والے، اس کی حکمت عملی کو لقمان حکیم کی حکمت کا پرتو باور کرنے والے، اس کی چال کو قیامت سے تشبیہ دینے والے، اس کے تکلم کو آبشار کا ترنّم گردانئے والے اور اس کے گیت گانے، قصیدے لکھنے اور اس کی منقبت پڑھنے والے لوگ گرد وپیش میں اتنی تعداد میں ہوتے ہیں کہ کوئی حکمران خواہ کتنا بدصورت ہو وہ خود کو چندے آفتاب ماہتاب سمجھنے لگ جاتا ہے، اس کا ہر فیصلہ خواہ کتنا ہی خلافِ عقل وعدل کیوں نہ ہو وہ خود کو نوشیرواں کا جانشین محسوس کرنے لگتا ہے، وہ کتنا ہی کودن اور گاؤدی ہو وہ سقراط کو کل کا بچہ اور افلاطون کو طفلِ مکتب کہنے لگ جاتا ہے اور اس کی زبان میں لکنت ہو مگر وہ اپنے آپ کو سحبان اور برک کا ہم پلہ قرار دینے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتا۔ داناؤں نے سچ کہا ہے کہ بہت سے فتنے ضرور حسن سے اٹھتے ہیں لیکن اصل قیامت حسنِ نظر اٹھاتا ہے۔ مزاری اور درباری ہر حکمران کو یہ باور کرا چکے ہیں کہ حکومت اور حکمت، حسن اور نزاکت، دولت اور عزت اور طاقت اور حقانیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یعنی جو حاکم ہے وہ دانا اور حکیم بھی ہوتا ہے۔ جو حسین ہو نازک مزاجی اس کا حق ہے، جو اہلِ دولت ہے صاحبِ عزت بھی اسے ہونا چاہیے اور جو طاقتور ہے حق پر بھی وہی ہے، اور جو ان اصول و کلیات کا قائل نہیں وہ مخبوط الحواس اور غبی ہے، خواہ وہ عالم اور دانشور کیوں نہ ہو تبھی تو وہ نہ ممبر بن سکتا ہے نہ حاکم اور ہمیشہ فکرِ روزگار سے پریشان رہتا ہے۔

محترم حقانی صاحب نہ جانے کب سے حکمرانوں کو مشورے پہ مشورے دے رہے ہیں۔ ضیاء الحق مرحوم نے بھی کان لپیٹے رکھے، بے نظیر بھی سنی ان سنی کرتی

رہیں اور میاں نواز شریف بھی ابھی تک اپنی روش پر قائم ہیں، غالباً ہمارے تجزیہ نگار یہ طے کیے ہوئے ہیں کہ اگر وہ اپنی خو نہیں بدلتے تو ہم اپنی وضع کیوں بدلیں؟ رہ گیا حاصل ماحصل وہ سب کے سامنے ہے۔ کوئی ہم سے پوچھے تو ہمارا طالبعلمانہ مشورہ یہ ہے کہ "نیکی کر دریا میں ڈال" والا مشہور محاورہ اہلِ قلم اور اربابِ دانش کے لیے بطورِ خاص وضع ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حکمرانوں کو کوئی مشورہ اسی نیت سے دیا جائے کہ یہ ایک نیکی ہے اور اسے دریا میں ڈالا جا رہا ہے، نہ اس کا کوئی سامع ہے اور نہ مخاطب، بس آخرت کے لیے توشۂ عمل اور ذخیرۂ اجر ہے، اور بس، کالم کی تحسین پر اس کی تاثیر کا یقین نہیں کر لینا چاہیے۔

کس قدر قحطِ وفا ہے مری دنیا میں ندیمؔ
جو ذرا ہنس کے ملے اس کو مسیحا سمجھوں

میاں صاحب کا امتحان

غالبؔ نے آزمائش کی گھڑیوں اور آسائش کے لمحوں کی کیفیات کو اپنے
مخصوص اور مشہورِ زمانہ فلسفیانہ انداز میں اس طرح پیش کیا ہے۔

؎ درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو مانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

یعنی انسان کی جبلّت وفطرت، اس کی ذہنی ونفسیاتی ساخت، اس کی ذہانت
وبصیرت اور رائے کی اصابت اس وقت مرحلۂ امتحان میں ہوتی ہے جب وہ گرفتارِ بلا
ہو، ورنہ آسائش وراحت کے لمحوں میں تو سارے مضامین غیب سے خود بخود خیال میں
اتر آتے ہیں اور تمام عقدے طلسماتی انداز میں کھلتے جاتے ہیں، جسطرح حسن اور
نزاکت لازم وملزوم ہیں اسی طرح اچھی قسمت اور بے پناہ ذہانت کا چولی دامن کا
ساتھ ہوتا ہے، اور یہی رسمِ دنیا اور دستورِ زمانہ ہے، حالانکہ خواجگی ملنے کے اسباب اور
ہوتے ہیں اور بندہ پروروں کے آداب مختلف، مگر اہلِ دنیا اپنے آپ باور کر لیتے ہیں
کہ جب حکومت مل گئی ہے تو حکمت کسی اور سے سیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟

اس وقت میاں نواز شریف عہدِ ابتلاء میں ہیں، اگر اس ابتلاء نے انہیں
گوشِ نصیحت، ہوش اور دیدۂ عبرت نگاہ عطا کر دی ہے تو اب یقیناً سوچتے ہوں گے کہ
اقتدار سے زیادہ ناپائیدار، حاضر باشوں کی مصاحبی سے بڑھ کر فضول اور نکمی، منہ کی

تعریف سے زیادہ رذیل و کثیف چیز اور کوئی نہیں، واقعہ یہ ہے کہ یہ سب بھلے وقتوں کے کرشمے ہوتے ہیں کہ جنبشِ لب کو ہر ایک شاہ کلید کہتا ہے، اور ابرو کا اشارہ دستِ قضا ہوتا ہے، لیکن برا وقت آجائے تو

جب بن کے بگڑتی ہے قسمت
اپنے بھی پرائے ہوتے ہیں

میاں صاحب جب اقتدار میں تھے تو آہن ہاتھ میں آتے ہی آب ہو جاتا تھا مگر اب صورتحال مختلف ہے، ان کے دوست ناصح بن چکے ہیں، سایہ گریزاں ہے اور ناک کے بال جان کے لیے وبال بن چکے ہیں، کل تک اقتدار کے پکوڑے کھانے والے آج کوڑے کھانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ ہمارے ہاں کا دیرینہ دستورِ سیاست وحکومت ہے کہ لاٹھیاں کھانے والے اور ہوتے ہیں اور ٹافیاں چوسنے والے اور، وزیراعظم ہاؤس کے سموسے کسی اور کا مقدر ہوتے ہیں اور پولیس کے گھونسے کسی اور کا نصیب، دربدر اور ہوتے ہیں اور گورنر اور بنتے ہیں، زندانوں میں کارکن جاتے ہیں اور ایوانوں میں لیڈر پہنچتے ہیں، چوکوں کی مار کٹائی کسی اور کے حصے میں آتی ہے اور وزارت کی رس ملائی کسی اور کو ملتی ہے، آج وہ لوگ واعظ بنے ہوئے ہیں جو کل تک مصاحب بن کر اتراتے تھے، آج وہ لیڈر دامن چھڑا رہے ہیں جو کل تک چیچڑی اور جونک کی طرح نواز شریف سے چمٹے ہوئے تھے، میاں صاحب کے بارے میں سنا ہے کہ وہ گائیکی اور موسیقی کا اچھا ذوق رکھتے ہیں اور ان کی بیگم کے بقول وہ بعض غزلوں اور گیتوں کے بول گنگنانے کے شوقین ہیں، آج کل میاں نواز شریف اگر کوئی شعر کثرت سے گنگناتے ہوں گے تو وہ غالب کا یہ شعر ہو سکتا ہے

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا

میاں صاحب کے پورے دورِ اقتدار میں ایک میاں خورشید محمود قصوری تھے جنہوں نے شریعت بل پر اعلانیہ اظہار اختلاف کیا اور سر عام استعفیٰ پیش کیا ورنہ ارکان اور وزراء کی بہت بڑی اکثریت "جان ودل" سے ان کی حامی و ہمنوا رہی اور چند ایک چلمن کے پیچھے رہے نہ سامنے آئے اور نہ صاف چھپے، آج وہ بھی "حق گوئی و بے باکی" کا مظاہرہ کر کے "آئین جوانمرداں" رقم فرما رہے ہیں جو صرف اور صرف نواز شریف کے طفیل پہلی اور آخری بار صوبائی یا قومی اسمبلی کے ممبر بنے۔ یہ سارا پس منظر نواز شریف کے لیے معرضِ امتحان ہے، میاں صاحب کو قدرت نے دوبارا اونچے ایوان تک پہنچایا مگر بدقسمتی سے اور سیاسی ونظریاتی تربیت کے فقدان کے باعث وہ مردم شناسی اور اصول آشنائی کے جوہر سے نابلد رہے جس کا خمیازہ آج انہیں اور قوم کو بھگتنا پڑ رہا ہے، وہ بیسویں صدی اور مغلِ اعظم کے عہد میں امتیاز نہ برت سکے، وہ تان سین، ابوالفضل، فیضی، بیربل اور ملا دو پیازہ قسم کے لوگوں کے نرغے میں رہے، حالانکہ انہیں علم ہونا چاہیے تھا کہ یہ دور سلطانی جمہور کا دور ہے، اس میں دربار داری، قصیدہ گوئی، منقبت نگاری اور شخصی وفاداری نہیں چلتی۔ انسان کا ذہنی وفکری ارتقاء سیاست وحکومت کو اصول و ضابط، اداروں اور جمہوری روایات کے موڑ پر لے آیا ہے، اب شاہی عہد کی اصطلاحات وروایات بے معنی ہوگئی ہیں۔ جنبشِ لب، اشارۂ ابرو، نوکِ زبان، غمزۂ چشم، مزاج یار جیسی اصطلاحات اب رفت و گزشت ہو چکی ہیں، اب ملک کا ایک دستور ہوتا ہے، اس کی مقننہ ہوتی ہے، پارلیمانی پارٹی ہوتی ہے، کابینہ ہوتی ہے، پبلک اکاؤنٹس کمیٹی ہوتی ہے، آڈیٹر جنرل کا آئینی ادارہ ہوتا ہے، پارلیمنٹ میں وقفۂ سوالات ہوتا ہے، ایک آزاد پریس ہوتا ہے، بین الاقوامی ذرائع ابلاغ ہوتے ہیں، اور لوگ اب شاہ کی رعایا نہیں، ووٹر ہوتے ہیں، اور اقتدار کی مدت محدود اور طے ہے یعنی پانچ سال، اب نہ وراثت چلتی ہے، نہ وصیت اور

نامزدگی، مگر میاں صاحب معلوم نہیں کس افسانوی فضا اور طلسماتی ماحول میں محصور رہے، کہ ان پیش پا افتادہ، واضح اور قریب کی حقیقتوں سے بے خبر رہے، ان کے لیے یہ عرصۂ امتحان ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ صحیح تر لفظوں میں شروع ہوا ہے، میاں صاحب نے آج تک اُڑتی دیکھی تھیں پھنستی نہیں، اب شائد انہیں اس بات کا ادراک ہو کہ ہر رات شبِ برات نہیں ہوتی کہ ہمیشہ حلوہ کھانے کو ملے، اب صورتِ حال یہ ہے کہ حکومت، قوم اور مسلم لیگ ایک مخمصے میں گرفت رہے، حکومت اس طرح کہ غالب وقابض ہونے کے باوجود اسے احساس ہے کہ اندر اور باہر کی نظریں چبھنے کے انداز میں اسے دیکھ رہی ہیں کہ کہاں اکیسویں صدی اور کہاں ملٹری رُول؟ وہ اس مخمصے سے نکلنا چاہتی ہے۔ قوم کا مخمصہ یہ ہے کہ ہمارے پچاس سال اکھاڑ پچھاڑ، سیاسی نفرتوں، ذاتی انتقاموں، اور غیر جمہوری رویوں میں صرف ہو گئے کہیں یہ عرصہ بھی تو اسی کی نذر نہیں ہو جائے گا؟ اور مسلم لیگ کا مسئلہ یہ بنا ہوا ہے کہ وہ میاں صاحب کو چھوڑتی ہے تو بے وفائی کا طعنہ ملتا ہے اور نہیں چھوڑتی تو ملک محاذ آرائی سے دوچار ہوتا ہے وہ کرے تو کیا کرے؟ میاں نواز شریف کو چاہیے کہ وہ شاہی کے بجائے سیاسی رویہ اپنائیں وہ اپنے طرزِ عمل سے ملٹری گورنمنٹ کی مدت کو طول نہ دیں اور سیاسی عمل کو تاخیر میں نہ ڈالیں ملک اور قوم کو اپنی انا، مہم جوئی، اور جذبۂ انتقام کی دلدل میں نہ پھنسائیں اور مسلم لیگ یعنی اپنی جماعت کو شیر خوار بچہ سمجھ کر ہر وقت اپنی آغوش میں نہ رکھیں اور اسے اپنے پاؤں پر چلنے دیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ فوج اپنے اصل محاذ سے زیادہ دیر تک دور رہے، ملک جمہوری عمل سے محروم رہے، مسلم لیگ پھر سے عوامی حمایت کھو بیٹھے اور خود میاں صاحب باقی عمر کفِ افسوس ملنے میں صرف کر دیں، لمحۂ موجود میاں صاحب کیلئے عرصۂ امتحان ہے۔

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

امریکہ مغرب کو اپنے ساتھ ملا کر مشرق اور بالخصوص عالمِ اسلام کے آخری مورچے پر حملہ آور ہو چکا ہے، اس سے پہلے وہ بزعمِ خویش دنیا کے تمام سیاسی، معاشی اور فوجی محاذ فتح کر چکا ہے۔ اب معاشرتی اور سماجی جنگ جیتنا چاہتا ہے اور اس آخری فصیل اور حصار کو توڑنا چاہتا ہے جو کسی بھی اخلاقی اقدار پر یقین رکھنے والی قوم اور پاکیزہ سماجی نظام کی پاسدار تہذیب کا دماغی مورچہ ہے۔ یعنی معاشرتی تانابانا، امریکہ نے اس جنگ میں اقوامِ متحدہ کو اپنا بازوئے شمشیر زن بنا کر حملے کا آغاز کر دیا ہے، خواتین کی ترقی اور بہبود کے عنوان سے چند سال قبل قاہرہ اور بیجنگ میں کانفرنسیں ہو چکی ہیں، جن کی سفارشات نے یہ عندیہ دے دیا تھا کہ اب آگے چل کر دنیا پوری طرح "مادر پدر آزاد" ہو جائے گی، اب کی بار "مساوات" "امن اور ترقی...... ۲۱ ویں صدی میں" جیسے خوبصورت عنوان کے تحت اقوامِ متحدہ کے ۵۴ ویں اجلاس میں ایک خصوصی اہتمام کیا گیا ہے جو ۵ تا ۹ رجون کو منعقد ہو رہا ہے۔ اس سیشن میں قاہرہ اور بیجنگ کانفرنس کی سفارشات حتمی منظوری کے لیے پیش ہوں گی۔ گزشتہ کانفرنسوں کی سفارشات کا لُبِ لباب اور خلاصہ یہ ہے:

۱۔ خاندانی وسماجی نظام کا خاتمہ اور انہدام

۲۔ جنسی بے راہروی کو جرم، عیب یا گناہ سمجھنے کی بجائے اسے قانونی تحفظ دینا۔

بیجنگ کانفرنس کی دستاویز میں خاندان کا جو تصور پیش کیا گیا وہ یہ تھا،

"اگر ایک لڑکا اور ایک لڑکی، یا دو لڑکے یا دو لڑکیاں ایک چار دیواری میں مل

کر رہے ہیں تو گویا ایک خاندان وجود میں آ گیا، ان کے درمیان جنسی تعلقات ایک خاندان کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔''

موجودہ اجلاس کا ایجنڈا اگرچہ ڈھائی سو نکات پر مشتمل ہے مگر ان کا سارا حاصل پانچ امور ہیں،

۱۔ جنس پرستی ایک جنسی رویہ ہے، اس پر کسی قانونی، مذہبی اور اخلاقی قدغن کا کوئی جواز نہیں۔

۲۔ بیوی کسی اعتبار سے اپنے شوہر کے جنسی حقوق ادا کرنے کی پابند نہیں اگر اسے مجبور کیا جائے تو وہ زنا بالجبر اور فوجداری جرم تصور ہوگا۔

۳۔ مرد اور عورت کو وراثت اور طلاق میں برابر کا حصہ اور حق حاصل ہے۔

۴۔ جسم فروشی کو باقاعدہ ''مزدوری'' کا درجہ دیا جائے اور اسے دیگر دوسری مزدوریوں کی طرح قانونی تحفظات اور مراعات حاصل ہوں۔

۵۔ عورت گھر کے کاج، بچوں کی پرورش اور دیگر خانگی امور کی قطعاً پابند نہیں بلکہ اس کے لئے تمام کاموں کا معاوضہ ہو ورنہ یہ اس کی بھی ذمہ دار نہیں۔

لوگوں کے جاہلانہ رویے اپنی جگہ ورنہ اسلام عورت کے معاملہ میں بہت غیور اور حساس ہے، وہ عورت کو نہ تو جوتی کی نوک سمجھتا ہے، نہ اثاث البیت قسم کی کوئی چیز، وہ عورت کو احترام تقدس اور تحفظ دیتا ہے، اس کے مالی حقوق کی باقاعدہ صراحت کرتا ہے، اسے خلع کا حق دیتا ہے، تجارت اور کاروبار کی اجازت دیتا ہے، زندگی کی ہر مثبت سرگرمی میں حصہ دار بناتا ہے، اور اسے چار انتہائی مقدس اور محترم عنوانات عطا کرتا ہے۔ ماں، بہن، بیٹی اور بیوی، اور ان سب کے حقوق و مفادات کا اخلاقی و قانونی دونوں طرح سے تعین کرتا ہے، لیکن یہ جو سفارشات سامنے آ رہی ہیں ان سے عورت کے احترام اور تحفظ کا کوئی پہلو نہیں نکلتا بلکہ ایک ایسی سوسائٹی کا تصور سامنے آ رہا ہے کہ انسان ایک بار پھر جنگل کے دور میں لوٹ جائے جہاں کوئی رشتہ، کوئی حد،

کوئی حصار اور ضابطہ نہیں ہوتا تھا، ہر ایک کا اپنا رخ، اپنی پسند، اپنی مرضی اور اپنا فیصلہ، یہ باتیں دنیا کو گلوبل ویلیج بنانے اور قریب تر لانے والی نہیں بلکہ یہ تو ہر ایک کو خودسر، تنہا اور متنفر کرنے والی ہیں، انسانی دنیا کی پہلی مسلّمہ اکائی خاندان ہے اور موجودہ کانفرنس اس کے سارے عناصر ترکیبی کو پارہ پارہ کرنے کی ایک کوشش ہے، یعنی ایسا ماحول پیدا کرنا جہاں بیٹی باپ سے الجھتی نظر آئے، بہن بھائی سے برسر پیکار ہو، بیوی شوہر سے بیزار ہو اور بیٹا ماں سے دست و گریباں دکھائی دے، ظاہر ہے جہاں احترام اور تقدس کے سارے رشتے پامال ہو جائیں وہاں خاندان کے تحفظ کا کیا امکان رہ جاتا ہے؟

یوں محسوس ہوتا ہے کہ امریکہ دنیا کو انسانی آبادی کی بجائے تجارتی منڈی میں بدل دینا چاہتا ہے جہاں کی ہر چیز خرید و فروخت کیلئے پیش کی جاتی ہے، نہ عزت، نہ حرمت، نہ اپنائیت، نہ محبت اور نہ احساسِ مروّت محسوس یوں ہوتا ہے کہ امریکہ اور مغرب دنیا بھر سے اپنے گناہ کا انتقام لینا چاہتا ہے جو اس سے کسی اندھے شوق کے باعث سرزد ہوا اور اب وہ کرب و اضطرار کے دہکتے جہنم میں جل رہا ہے، اور وہ چاہتا ہے کہ پوری دنیا ان انگاروں پر لوٹے تا کہ اس کا احساسِ اذیت کچھ تو کم ہو، اس کی بیٹیاں جب ایک بار ماں باپ کی دہلیز سے باہر نکلیں تو پھر پلٹ کر نہیں آئیں ان کی جوانیاں کسی کی بانہوں میں جھولتے اور جنسی دکھ جھیلتے گزرتی ہیں اور بڑھاپا اولڈ ہاؤسز میں بسر ہو جاتا ہے اور یوں پوری زندگی حیرت و حسرت کے گرداب میں پھنس کر رہ جاتی ہے، مغرب کی عورت کچھ عرصہ غیروں کا دل بہلانے اور کچھ مدت غیر مطلوب بچوں کا بوجھ اٹھانے میں لگی رہی اور اس کی باقی عمر آہوں میں بتانے میں صرف ہو جاتی ہے، کس قدر خوفناک انجام ہے ایسی آزادی کا جس کی لذّت تو چند روزہ ہے اور اذیّت تادمِ زیست۔

؎ اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے

سیانوں نے سچ کہا ہے کہ طاقتور کے لینے اور دینے کے الگ باٹ اور ناپنے اور تولنے کے اپنے پیمانے اور ترازو ہوتے ہیں، اس سلسلے میں زبردست کو نہ خدا کا خوف ہوتا ہے اور نہ مخلوق کی شرم، اُس کا صرف ایک ہی اصول ہوتا ہے طاقت اور ہٹ دھرمی، کوئی لاکھ چیختا چلاتا رہے اس کا ایک ہی جواب ہوتا ہے "کرلو جو کرنا ہے۔"

اس نفسیات کا مظاہرہ حال ہی میں روسی پارلیمنٹ "ڈوما" سے امریکی صدر بل کلنٹن نے یہ تقریر کر کے کیا ہے۔

"موجودہ دور میں میزائل ڈیفنس پروگرام کا قیام بہت ضروری ہو گیا ہے کیوں کہ ایٹمی قوت کے حامل بدمعاش ممالک، دہشت گردوں اور مجرموں کی منظّم تنظیموں کی طرف سے امریکہ اور روس دونوں کو خطرات لاحق ہیں، دونوں ممالک کو دفاعی صلاحیت اور ہتھیاروں کے کنٹرول کے سلسلے میں باہمی تعاون کو مزید بڑھانا چاہیے۔"

امریکی صدر کی تقریر کے اس اقتباس کا ایک ایک حرف اور لفظ بتا رہا ہے کہ امریکہ طاقت کے زعم میں مخمور و مسحور ہو چکا ہے، اسے اپنے آپ کو مہذب اور دوسروں کو وحشی کہنے میں کوئی شرم لاحق نہیں، وہ اپنے ہر زوردار دھماکے کو امن عالم کا ضامن اور دوسروں کی ذرا سی آہٹ کو دنیا کے لئے خطرے کا گھڑیال سمجھتا ہے اور امریکہ دنیا اور تاریخ کے قدیم ترین اور مسلمہ اصول کے مطابق "جیو اور جینے دو" کے بجائے اپنے

"خدائی فرمان" کے بموجب "میری مرضی سے جیو اور مجھے اپنی مرضی کے مطابق جینے دو" پر عمل پیرا ہے، اور یہ سوچے بغیر کہ سکندر، سیزر اور چنگیز و ہلاکو کا زمانہ جا چکا اور اب تلوار سے گھائل کرنے کی بجائے دلیل اور گفتار سے قائل کرنے کا دور ہے، مگر سچ ہے کہ طاقت ہمیشہ ایک ہی عہد کی نفسیاتی فضا میں سانس لینے کی عادی ہوتی ہے۔ اس کے لیے گرما و سرما اور بہار و خزاں کا موسم نہیں ہوتا۔ واضح رہے کہ امریکہ کا میزائل ڈیفنس پروگرام ساٹھ ارب ڈالر مالیت کا ہے، یعنی ہمارے حساب سے پینتیس کھرب روپے، بالفاظ دیگر پاکستان کے سالانہ پانچ قومی بجٹوں کے برابر، سوال یہ ہے کہ وہ کون سی "بدمعاش ایٹمی طاقتیں" ہیں جن سے امریکہ کو خطرہ لاحق ہے؟ ساری دنیا کو معلوم ہے کہ ان کی کل تعداد سات ہے، ان میں سے پانچ پرانی اور دو نوزائیدہ ہیں یعنی پاکستان اور بھارت، ان دو کے علاوہ پانچ ایٹمی طاقتوں میں سرفہرست امریکہ اور روس ہیں، باقی تین میں چین، برطانیہ اور فرانس شامل ہیں۔

کلنٹن نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا ہے کہ امریکی میزائل ڈیفنس پروگرام سے روس کو کوئی خطرہ نہیں، یعنی یہ دو طاقتیں تو ہو گئیں امن کی پیامبر، اور باہمی دوست، باقی پانچ میں سے برطانیہ اور فرانس امریکہ کی His Master Voice بنے ہوئے ہیں۔ اس تنقیح و تشریح کے بعد چین، بھارت اور پاکستان رہ جاتے ہیں جن سے امریکہ کو خطرہ اور امن عالم کو دھڑکا لگا ہوا ہے، امریکی صدر کے اس فلسفے کو سمجھنے کے لیے اگر بقراط اور افلاطون بھی اپنی قبروں سے نکل کر آ جائیں اور اپنے یونان کا سارا منطقی و فکری اثاثہ اپنے کندھوں پر لاد کر آ جائیں تو پھر بھی اُن کے پلے کچھ نہیں پڑے گا، اس لئے کہ امریکہ اور روس کو امن کا علمبردار ثابت کرنے کے لیے فلسفے کے نئے "کلیے" اخلاق کے نئے ضابطے، فکر کے نئے سانچے اور فیصلہ کرنے کے نئے پیمانے تخلیق کرنے پڑیں گے، ورنہ آج تک کے رائج سارے اصول و قواعد اس بات کو سمجھنے اور

ماننے سے قاصر ہیں، کیوں کہ ماضی کے تمام ادوار اور تاریخی کے جملہ اعداد و شمار اس کی نفی کرتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر:۔

۱۔ امریکہ کو غالباً چوالیس میں ایٹمی صلاحیت حاصل ہوئی اور اس نے پینتالیس میں بلا جھجک ہیروشیما اور ناگاساکی پر اس کا استعمال کر دیا اور ایسا ہولناک استعمال کہ آج بھی اس فعل سے نگاہِ انسانیت شرم سے خمیدہ، جبینِ انسانیت اس داغ سے آلودہ، روحِ انسانیت کرب سے مضطرب اور ایک پوری صدی اس سے متعفن ہے۔

۲۔ عراق آج تک امریکی حملوں سے کراہ اور اس کی وحشیانہ کارروائیوں سے بلک رہا ہے۔

۳۔ لیبیا پر باقاعدہ دہشت گردی کے انداز میں حملہ کیا گیا اور ایک آزاد ملک کے اقتدارِ اعلیٰ کو روئی کا گالہ سمجھ کر دھنکا گیا۔

۴۔ ابھی کل کی بات ہے کہ افغانستان پر میزائل داغے گئے، اور بیک وقت پاکستان اور افغانستان کی آزادی و خودمختاری کی توہین کی گئی۔

۵۔ اُسامہ بن لادن کے ہیڈ کوارٹر کے شبہے میں سوڈان پر حملہ کیا گیا اور ایک دواساز فیکٹری کو زمین بوس کر دیا گیا۔

یہ صرف دیگ کے چند دانے ہیں، ورنہ امریکہ بدمعاشی جریدۂ عالم کی پیشانی پر بڑے جلی حروف میں درج ہے، رہ گیا روس تو اس کی ساری تاریخ ہی توسیع و استعمار کی ہے، ہنگری، چیکوسلواکیہ، پولینڈ، بلغاریہ، رومانیہ، افغانستان اور وسط ایشیائی اسلامی ریاستیں روسی حملوں کی یادگار اور وحشیانہ حملوں سے تار تار دکھائی دیتی ہیں، افغانستان جو اکیس برس کے بعد بھی آتش و آہن کی لپیٹ میں ہے، اس خوف اور خون کی پہلی لکیر بھی روس نے کھینچی جب اُس کی امداد سے نور محمد ترکی نے صدر داؤد کو قتل کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا، وہ دن اور آج کا دن، افغانستان کبابِ سیخ بنا ہوا

ہے، جسے کسی پہلو قرار نہیں۔

جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

چین بلاشبہ ایٹمی طاقت ہے مگر اس نے آج تک کوئی فیصلہ بم اور گولے سے نہیں کیا۔ خواہ ہانگ کانگ کی واپسی ہو یا مکاؤ کی، تائیوان سے بھی اس کا جنگ کا کوئی ارادہ نہیں، وہ انتظار ہی کو اپنا ایٹمی ہتھیار سمجھتا ہے اور اس نے صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہی پایا ہے۔

لے دے کر بھارت اور پاکستان رہ جاتے ہیں، اگر تو امریکہ اور روس کو پاکستان کی ایٹمی طاقت سے خطرہ ہے تو یہ بالکل اس بھیڑیئے والی بات ہے جو بھیڑ کے بچے کو کسی بہانے کھانا تو چاہتا تھا مگر عذر ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ اور بالآخر اس نے اس کے باپ دادا کو مطعون ٹھہرا کر اسے اپنا لقمہ بنالیا ورنہ کہاں پاکستان اور کہاں امریکہ؟ کوہِ ہمالیہ اور برف کے تودے میں کیا نسبت ہوسکتی ہے؟ پاکستان بیچارے کا ٹوٹل بجٹ کھرب روپے کا ہے جبکہ امریکہ کا صرف میزائل ڈیفنس پروگرام ساٹھ ارب ڈالر کا ہے، امریکہ کا محض ایک خبر وہی اور ضمنی دفاعی بجٹ پاکستان کے کل قومی بجٹ سے پانچ گنا زیادہ ہے پھر بھی خطرے کا شور، چور مچائے شور والی بات ہے۔ پیچھے ایک ملک بھارت رہ جاتا ہے جس کی بدمعاشی سے شائد امریکہ خطرہ محسوس کرتا ہو، یہ اب امریکہ جانے یا اس کا اور روس کا لاڈلا اور لے پالک بھارت جانے۔ ان دونوں کو اس سے کیا خطرہ ہے؟ اس کی وضاحت وہ خود کریں لیکن یہ مسلّمہ امر ہے کہ بھارت سے پاکستان کو بہر حال خطرہ ہے، اس لئے کہ وہ بیک وقت امریکہ، روس اور چین کی سیٹ سنبھالنے کے لیے بیقرار ہوا پھرتا ہے، اس کا تدارک ضرور ہونا چاہیے۔ کلنٹن کی تقریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا پر چڑھ دوڑنا چاہتا ہے اور اس کیلئے ”بدمعاشی“ کا شور مچا کر گراؤنڈ ہموار کرنا چاہتا ہے ورنہ کلنٹن نے جو بات کی ہے وہ کوّے کی دم میں سرخاب کا پر ٹانکنے والی بات ہے۔

اے دل یہ سلگنا کیا، جلنا ہے تو جل بھی اٹھ

آثار وقرائن بتاتے ہیں کہ حکومتی حلقوں اور ذہنوں میں ایک کشمکش سی برپا ہے، اقتدار کے نو مہینے گزار اور اگلے سوا دو سال کے لیے عدالت سے قانونی اختیار وجواز پالینے کے باوجود حکومت خود کو تنے ہوئے رستے پر چلتا ہوا محسوس کر رہی ہے اور پھسلنے اور گرنے کے اندیشے میں مبتلا نظر آتی ہے، کچھ مخمصے ہیں جو اسے گھیرے ہوئے ہیں، مثلاً

۱۔ وہ نہیں چاہتی کہ اس پر مارشل لاء کا ٹھپہ لگے۔

۲۔ سیاسی جماعتوں سے بھی ایک فاصلے پر رہنا چاہتی ہے کہ کہیں عوام کی نظروں میں مشکوک نہ ہو جائے۔

۳۔ سیاسی جماعتوں کے تعاون کے بغیر اسے رابطۂ عوام میں دقّت پیش آرہی ہے۔

۴۔ وہ اپنے سیٹ اپ کو زیادہ سے زیادہ سویلین بنانا اور دکھانا چاہتی ہے۔

۵۔ مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کی جگہ ایک نئی سیاسی قیادت کی نشوونما کی بھی خواہش مند نظر آتی ہے۔

۶۔ سیاسی جماعتوں کو نہ سہی سیاسی افراد کو اپنے ساتھ ملانا بھی چاہتی ہے اور کچھ ذہنی تحفظات بھی رکھتی ہے۔

۷۔ بین السطور کچھ کہنا بھی چاہتی ہے اور اپنی بات کو اخبارات کی جلی سرخی بھی نہیں

بنانا چاہتی۔

یہ صورتحال دیکھ کر بے اختیار لبوں پر آتا ہے:

اے دل یہ سلگنا کیا، جلنا ہے تو جل بھی اٹھ
دم گھٹنے لگا ظالم، کیوں دھونی رمائی ہے

مندرجہ بالا سات واہموں اور اندیشوں میں سے سب سے پہلا تو بالکل بے بنیاد ہے یعنی موجودہ حکومت کے بارے میں مارشل لاء کا تاثر پیدا نہ ہو، یہ طے ہے کہ حکومت فوجی ہے، اس کا مزاجاً نرم یا سخت ہونا ثانوی بات ہے، دنیا اسے مارشل لاء سمجھتی ہے۔ رہ گئے پاکستانی عوام انہیں اس سے زیادہ اپنے مسائل سے غرض ہے، وہ نہ تو جمہوریت کو چومنے اور چاٹنے کے قائل ہیں اور نہ مارشل لاء سے بدکنے اور بھاگنے کے، اُن کا نقطۂ نظر غالب جیسا ہے۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

باقی چھ اندیشے ہماری دانست میں درست ہیں ان کے بارے میں حکومت کو کم سے کم وقت میں اپنا ذہن یکسو کرنا اور لائحہ عمل بنانا چاہیے ورنہ اس حیص بیص میں بہت سی انتظامی کمزوریاں پیدا ہو سکتی ہیں اور وہ قوتِ فیصلہ پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ چونکہ سیاسی جماعتوں سے عوام کو بہت سے گلے اور شکوے ہیں اور بہت حد تک بجا ہیں اس لئے حکومت ان سے رابطہ رکھتی ہے تو عوام کے اعتماد مجروح ہونے کا پورا پورا احتمال ہے، اگر حکومت اپنا چہرہ سیاسی اور جمہوری بنانا چاہتی ہے تو اسے لازماً سیاسی جماعتوں سے راہ و رسم بڑھانی پڑے گی لیکن اس کی دبی اور چھپی ہوئی یہ دو خواہشیں کم از کم ہماری سمجھ سے بالا ہیں۔

ایک تو یہ کہ وہ مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کی جگہ اپنے ''خاص ہنر'' اور ''دست

غیب'' سے نئی سیاسی قیادت تیار کرے۔ جیسا کہ اس سے پہلے میاں نواز شریف، آئی جے آئی، اور ایم کیو ایم کا تجربہ ہو چکا ہے، اگر ایسا ہوا تو یہ کسی بھی صورت میں ملک و قوم کے حق میں نہیں ہوگا، جو بھی سیاسی جماعت آگے آئے اپنے منشور کی طاقت، قول کی صداقت اور کردار کی عظمت سے آگے آئے، ورنہ نیا تجربہ کرنے اور آزمودہ نسخہ بروئے کار لانے کے بجائے پی پی پی اور مسلم لیگ کو گوارا کیا جائے یہ کسی حد تک ایک پوز ہو چکی ہیں اور کچھ عرصے بعد ان کے پرت مزید کھل جائیں گے اور عوام نئی قیادت کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوں گے۔

دوسری بات یہ کہ جماعتوں کی جگہ ان کے افراد کو حکومت اپنے ساتھ ملائے۔ یہ پہلے تجربے سے بھی زیادہ بوگس تجربہ ہوگا۔ ہمارے نزدیک اقتدار میں رہنے والی جماعتوں میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو پاکباز اور صاحبِ کردار ہوں اور جو ہیں تو وہ نہ طاقتور ہیں اور نہ دولت مند، بڑی جماعت کے ساتھ رہ کر وہ نمایاں نظر آتے ہیں ورنہ طاقت اور دولت کی سیاست میں انہیں کون پوچھتا ہے؟ اپنی سیٹ ہی بچانے میں کامیاب ہو جائیں تو بڑی غنیمت ہے، لیکن اگر افراد کا انتخاب اس بنیاد پر ہو کہ کون موجودہ حکومت کے حوالے سے ہارڈ لائنز ہے اور کون سافٹ کارنر رکھنے والا اور دوسری قسم کے افراد کو لے لیا جائے تو یہ بہت غلط ہوگا اس لئے کہ ان کا سافٹ کارنر رکھنا ملک و ملت کے حوالے سے نہیں بلکہ چمڑی بچانے، عمر بھر مصلحت کی سیاست کرنے، ہمیشہ حکومتی کنارا پکڑنے اور احتساب سے بچنے کے حوالے سے ہے۔ اگر انہیں پاکدامنی کا سرٹیفکیٹ مل گیا تو پیچھے کیا رہ جائے گا؟ آئے روز ایک فہرست اخبارات میں نظر آتی ہے کہ فلاں فلاں لوگ نئی کابینہ میں آ رہے ہیں اور بعض نام تو وہ ہوتے ہیں کہ پڑھتے ہی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگ جاتا ہے۔ اور کان سائیں سائیں کرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں بے ساختہ آسمان کی طرف اٹھتی اور دل کے ہوک نکلتی ہے۔

یا اللہ! کیا چودہ کروڑ کے ملک میں قحط الرّجال اس قدر ہو چکا ہے کہ ان کے علاوہ ملک کو چلانے کے لیے کوئی اہل، پڑھا لکھا، امین اور دیانتدار شخص میسّر نہیں۔ ہمارا تو سیاسی جماعتوں کو بھی مشورہ ہے کہ وہ دو سال صبر کریں اور جنرل صاحب کو ان کے ایجنڈے اور ترجیحات کے مطابق کام کرنے دیں۔ جب کھلا سیاسی ماحول آئے تو جماعتیں اپنے ارمان نکال لیں، کہیں بعد میں داؤد پوتہ صاحب جیسا انٹرویو نہ دینا پڑ جائے کہ ہمارے پاس تو کوئی اختیار ہی نہیں تھا۔

خورشید احمد گیلانی صاحب بڑے بہادر آدمی ہیں ۔ ایک طرف زندگی اور اس میں لکھے گئے دکھوں سے لڑائی لڑ رہے ہیں، دوسری طرف ایک بیمار سیاسی اور سماجی معاشرے سے برسرپیکار ہیں اور اپنے قلم سے اس کی بیماریوں کی سرجری کرتے رہے ہیں ۔ ۔ خدا نے انہیں بڑا حوصلہ دیا ہے ۔ جب کبھی ان سے ملاقات ہوئی، وہ مسکراتے ہوئے ہی نظر آئے ۔ یہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں سے آنکھوں تک جگمگاتی رہتی ہے اور شبہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ کینسر جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہیں ۔

گیلانی صاحب عہد موجود کے ان قلمکاروں اور اہل دانش میں شامل ہیں جنہوں نے ملی اور دینی افکار کی ترویج کو اپنے فن کا محور بنایا ۔ ان کے سیاسی اور سماجی نوعیت کے کالموں میں بھی اس طرز احساس کی خوشبو بخوبی محسوس کی جا سکتی ہے ۔ "قلم برداشتہ" گیلانی صاحب کے ان کالموں کا ایک خوبصورت انتخاب ہے جو نوائے وقت اور دوسرے اخبارات میں اشاعت پذیر ہوتے رہے "قلم برداشتہ" اپنے دامن میں موضوعات کی ایک بہار سمیٹے ہوئے ہے ۔ یہ انتخاب ان کے مخصوص طرز اظہار کا نمائندہ بھی ہے اور عہد حاضر کا قومی، سماجی اور سیاسی منظر نامہ بھی ۔ خدا انہیں صحت دے اور وہ ہمیشہ یاد رہنے والی باتیں لکھتے رہیں ۔

عباس اطہر

سید خورشید احمد گیلانی کی خوبصورت نثر کے مطالعے کے دوران رشک میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا ۔ میں نے مختلف علمی اور دینی موضوعات پر ان کی گرانقدر تصنیفات کا مطالعہ بھی کیا ہے اور ان کے سیاسی کالم بھی ایک "مذہبی فریضہ" کے طور پر پڑھتا رہا ہوں ۔ موضوع کوئی بھی ہو ان کی اعلیٰ پائے کی نثر اور شگفتہ اسلوب ہر جگہ اپنی اثر آفرینی کے ساتھ موجود ہوتا ہے ۔ صنائع بدائع کے استعمال سے ان کی نثر ایک بنی سنوری دلہن کی طرح سامنے آتی ہے ۔ لیکن یہ سجاوٹ اس کے فطری حسن میں اضافے کا باعث بنتی دکھائی دیتی ہے ۔ سید خورشید احمد گیلانی ایک روشن فکر سکالر اور روشن لفظ لکھنے والے ادیب اور کالم نگار ہیں ۔ کسی موضوع پر ان کی اختلافی تحریر میں بھی اتنی شائستگی ہوتی ہے کہ ایسے مواقع پر اختلاف کو رحمت قرار دیئے جانے والی بات سمجھ میں آنے لگتی ہے ۔ میں گیلانی صاحب کے ایک خوشہ چیں کے طور پر ان کے قلم کی جولانیوں کے قائم و دائم رہنے کی دعا کرتا ہوں ۔ اور ساتھ ہی یہ درخواست بھی کہ "اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی"

عطاء الحق قاسمی

"خورشید گیلانی جب لکھتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ الفاظ کی بندش جملوں میں معانی کے سچے موتی سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال نکال کر صفحہ قرطاس پہ سجا رہی ہے حسن لفظ کے ساتھ ساتھ جمال معنی خورشید گیلانی کا اسلوب نگارش ہے جب بولتے ہیں تو گرجدار آواز اور ذلاقت لسانی مستقبل کے کسی سحبان کا پتہ دیتی ہے قلم و لسان کے اس دو آتشے کا نام خورشید احمد گیلانی ہے"

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

صدر شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی (لاہور)

کتاب محل

دربار مارکیٹ لاہور 0321-8836932